مُصطفیٰ کریم

راستہ بند ہے

(ناول)

مصطفیٰ کریم

راستہ بند ہے

(ناول)

محترم جوگیندر پال صاحب کے
مطالعہ کے لیے
بصد خلوص!

[illegible]

۲۷/۳/۲۰۰۶
عیسوی

Fiction should reveal the mystery of our fate through our virtues and passion.

— **Madame de Stael.**

(Theory of Novel)

راستہ بند ہے

(ناول)

مصنف:

مصطفیٰ کریم

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B - یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی - ۱۱۰۰۹۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

نام کتاب : راستہ بند ہے (ناول)

مصنف : مصطفیٰ کریم

پتہ : معرفت جناب ارتضیٰ کریم، A-105، گیرا پارک ہاؤسنگ سوسائٹی،
۱۵۔ بوٹ کلب روڈ، پونہ۔ ۴۱۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

تعداد : ۵۰۰

Acc No:
10,026

ناشر : انیس امروہوی
تخلیق کار پبلشرز
104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش

0168.3NMK
P08

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲ (یو۔پی)
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

T.P.: 0165
RASTA BAND HAI *(Novel)*
By MUSTAFA KAREEM
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

2008
Rs. 220.00

ارمان نجمی

کے نام

عمر کے باب میں اب رعایت کہاں، سمت تبدیل کرنے کی مہلت کہاں
دیکھ بادِ فنا کھٹکھٹاتی ہے در ختم ہونے کو ہے داستاں یا اخی!

(عرفان ستّار)

"Thank you, for letting me read your novel.I did not want to put it down once I stared, and I can't say that anout many novels. As a story it is intriguing, fascinating; it has a mystic atmosphere with a powerful narrative which knits it together at all parts. I enjoyed the way you combined a political theme with a more personal theme, basically the fate of Wajid and also as a background the larger question of our spirituality."

——*Margret Drake Jones*

"شکریہ! کہ آپ نے مجھے اپنے ناول 'راستہ بند ہے' کے مطالعہ کا موقع عطا کیا۔ایک بار اسے شروع کرنے کے بعد چھوڑنا میرے لئے مشکل ہو گیا،اور یہ بات میں بہتیرے ناولوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی۔

ایک قصہ کی طرح یہ پُر اسرار بھی ہے اور فسوں انگیز بھی۔اس کی فضا تصوف کے سحر سے مملو ہے۔ایک طاقتور بیانیہ اس کے مختلف حصوں کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔آپ نے جس طرح ایک ذاتی تھیم کو ایک سیاسی تھیم سے منسلک کر کے بنیادی طور پر واجد کی قسمت اور اس کے پس منظر میں ہماری روحانیت اور ہماری تقدیر کے اہم سوال سے ہم آہنگ کیا ہے،اس سے میں بہت محظوظ ہوئی۔

— مارگریٹ ڈریک جونس

(اسکالر) اسکار برا تخلیقی و تحریری حلقہ

۱

مسجد میں ہر عمر کے نمازی فرش پر بچھی چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر شاذ و نادر ہی مسجد میں پابندی سے نظر آتے تھے۔ جمعہ کے دن بھی نہیں۔ لیکن آج کی رات اہم تھی۔ اہم اور متبرک، آج شب برات تھی۔ وہ رات جب خدا کے حکم سے فرشتے رزق بانٹتے ہیں اور جس رات کا احترام رسولؐ نے بھی کیا تھا۔

عبادت گزاروں کے سامنے رحل پر قرآن کی جلدیں کھلی تھیں۔ جن کے زعفران سے رنگے اوراق کو لالٹینوں کی جھلملاتی لوئیں اجال رہی تھیں۔ قرآن خواں کی انگلیاں حروف کے نیچے آہستہ آہستہ پھر رہی تھیں اور ان کے سر آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، جیسے وہ وجد میں ہوں، جیسے انھوں نے اس ماورائی راز کو پالیا تھا جس میں بیخودی تھی اور کیف بھی۔

مسجد کے گنبد قرآن خوانی سے گونج رہے تھے۔ ان گنبدوں سے فانوس لٹکے تھے۔ گرد آلود اور تھکے ہوئے زرد چہروں کی طرح بے نور۔ طاقوں میں جلتی اگربتیوں کی بیمار خوشبو ہر سو پھیلی تھی اور ان بتیوں کا خم کھاتا ہوا دھواں طاقوں کی سیاہی میں گھل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ، اور غمزدہ سا۔ مسجد کا نوجوان امام واجد شاہ منبر پر بیٹھا تھا۔ نمازیوں کے ہجوم سے خوش اور ان کے خلوص سے بیخود۔ ابروئیں ذرا کھنچی ہوئی اور آنکھوں میں غرور کی جھلک ایک مہینہ پہلے واجد شاہ کوٹ فتح خان کی مسجد کا امام مقرر ہوا اور اس دن کے بعد نمازیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی......

اور آج تو نمازی نہ صرف مسجد کے اندر بھرے تھے بلکہ وہ باہر چبوترے پر بھی صف در صف بکھرے تھے۔ شدید گرمی کا زمانہ تھا اور راتیں بھی جلنے لگی تھیں لیکن آج کی رات کبھی کبھی ہوا کے جھونکے آجاتے اور سبھوں کو ہلکی سی خنکی سے نواز دیتے۔ دُور بہت دُور کہیں بارش ہوئی ہوگی

کچھ کو خیال آیا تھا۔ عشاء کی نماز کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن شب برأت کی وجہ سے مخصوص دُعا ہونے والی تھی اس لیے لوگ رُک گئے تھے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم......'' واجد شاہ بولا۔ قرآن خوانی رُک گئی۔ عبادت گزار خاموش ہو گئے۔ واجد نے ایک سورۃ کی شیریں لہجے میں قرأت شروع کردی...... صاف اور بلند آواز...... جس کی دلکشی نے ہر لفظ کو پُر اثر بنا دیا۔ جب کبھی واجد رُکتا تو عبادت گزار زور سے آمین کہتے۔ ان کی سمجھ میں سورۃ کا معنی نہیں آیا۔ لیکن متبرک کتاب کے پاک جملوں نے ان کے تخیل کو، ان کے احساسات کو گرفت میں لے لیا۔ خدا اور رسول کی یاد سے ان کا عقیدہ جوش میں آ گیا۔ چند کو اپنی بے ثباتی کا احساس ہوا۔ وہ گناہ انھیں یاد آئے جن کی بخشائش ممکن نہیں تھی۔ ان کی سسکیاں نکل آئیں اور آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

واجد نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خدا کے تصور میں گم ہونا چاہا۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ رہ رہ کر اُسے اپنا خیال آنے لگا، اپنی روحانی طاقت کا۔ اپنی خوبیوں کا۔ جنھوں نے مسجد میں بیٹھے عبادت گزاروں کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ واجد کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ سنولا رنگ اور سنجیدہ نوکیلے چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی۔ باریک مونچھ اور سیدھی ناک پر ایک سرخ مسہ۔ واجد سفید کرتا اور شلوار میں ملبوس تھا اور سر پر سفید پگڑی ذرا سی ترچھی تھی۔ واجد نے سورۃ ختم کرنے کے بعد پہلے رسول پھر اپنے مرحوم بزرگوں کے نام پر فاتحہ پڑھا۔ جن کی یاد سے اس پر بے دلی سی چھا گئی اور ساتھ ہی وہ مغموم سا ہو گیا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی اور فاتحہ کے خاتمے کے بعد اس نے نرمی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ سارے نمازی اس کے ساتھ ساتھ فاتحہ پڑھتے رہے تھے۔ وہ سب جیسے بے چین سے تھے۔ فاتحہ جوں ہی ختم ہوا وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ملبوس کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ سے ہلچل مچ گئی۔ مسجد کی طاقوں میں قرآن رکھ کر عبادت گزار واپس جانے لگے۔ کچھ نے واجد سے مصافحہ بھی کیا اور پھر اپنے ہاتھوں کو سینے پر ملا۔ جیسے واجد کے دل کی مقدس گرمی کو اپنے دلوں میں جذب کر لینا چاہتے ہوں۔ جلد ہی مسجد خالی ہو گئی۔ صرف کوٹ فتح خان کا مالک ملک ظہیر وہاں کھڑا رہا۔ اس کی راکھ رنگ کی مونچھیں اور داڑھی کنپٹیوں کی جانب مڑی ہوئی تھیں اور کرتے میں سونے کے بٹن نمایاں تھے۔ اپنی عاجزی اور انکساری جتانے ملک ظہیر مسجد کے اندر آخری صف میں بیٹھا عبادت کرتا رہا تھا۔ امام واجد کی خوش الحانی سے اس کے دل میں عشق خدا جاگ پڑا

تھا۔ اس عشق کے والہانہ پن سے اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ جب اسے ذرا ہوش آیا تو جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں کونے میں اسے کبوتروں کے پر اور خشک پتوں کا ننھا سا ڈھیر نظر آیا۔ مسجد کی صفائی واجد کے سپرد تھی۔ یہ کیسا مذہبی انسان ہے؟ اسے خدا کے گھر کو صاف رکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ یہ مسجد اتنی بڑی تو نہیں کہ واجد جیسا کڑیل جوان اسے صاف نہیں کر سکے؟ ملک ظہیر نے سوچا۔ غصہ سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور دانت بھنچ گئے۔ وہ عبادت کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے انگلی کے اشارے سے واجد کو بلایا۔ اس کے غصے سے بے خبر واجد اس کی جانب متبسم بڑھا۔ اسے داد ملنے کی اُمید تھی۔

''تم مسجد کی صفائی نہیں کرتے۔ کتنی گندگی ہے یہاں؟'' ملک ظہیر کی خشمناک آواز گونجی۔ وہ ہاتھ سے اس جانب اشارہ کر رہا تھا جہاں اسے گندگی نظر آئی تھی۔

واجد کے پیر جم گئے۔ تلوے کے نیچے اسے چٹائی گڑتی محسوس ہوئی۔ جیسے کنکریاں تھیں پیروں کے نیچے۔ اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا اور گھبراہٹ سے جسم پر پسینہ بہہ آیا۔ ظہیر نے اسے امام مقرر کیا تھا۔ تنخواہ اسی سے ملتی تھی اور واجد کا کھانا بھی ظہیر ہی کے گھر سے آتا تھا۔ ملک ظہیر کوٹ فتح خاں کا حکمران تھا۔ چاروں طرف دور تک پھیلی ہوئی زمین بھی اسی کی تھی۔ وہ جب کبھی مسجد میں آتا یا گاؤں سے گزرتا تو لوگ اسے جھک کر سلام کرتے اور اس سے مؤدبانہ فاصلہ رکھتے۔ واجد سے ظہیر کی وہ دوری تھی جسے مالک اپنی رعایا کے ساتھ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ واجد کی خیریت پوچھ لیتا تھا۔ اسے برطرف کرنے میں ظہیر کو دیر کیا لگتی۔ واجد کو چپ سی لگ گئی تھی۔ بڑی کوشش سے وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''م...... میں مسجد کی صفائی کرتا ہوں...... روزانہ ہی...... آج ذرا سی دیر ہو گئی...... اندھیرے کی وجہ سے فرش اور کونے صاف نہیں کر سکا۔''

وہ سچ بولا تھا۔ گاؤں کے وہ لڑکے جو اس کے پاس دینی تعلیم کے لیے آتے تھے ان کے ساتھ مل کر وہ مسجد کی جھاڑ پونچھ کر دیا کرتا تھا۔

''آئندہ احتیاط کرنا۔ یہ خدا کا گھر ہے۔ اسے صاف ستھرا رہنا چاہئے۔'' ملک ظہیر نے حکم دیا۔ اس کی آنکھیں واجد پر گڑی تھیں۔ اپنی طاقت کو کہاں اور کب استعمال کرنا چاہئے، اس کا اسے علم تھا۔

واجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نادم آنکھیں جھکی تھیں۔ اس بری طرح ڈانٹے

جانے پر اس کا دل دکھ رہا تھا۔ لالٹین کی کپکپاتی روشنی میں دونوں کے طویل سائے دیوار پر لرز رہے تھے اور باہر اداس ہوا پیپل کے پتوں کو جھنجوڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ظہیر کو احساس ہوا کہ اس نے واجد کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ان خیالات سے ظہیر کے دل میں نرمی سی آ گئی۔

واجد کی آنکھیں جھکی تھیں۔ اس طرح ڈانٹے جانا جیسے وہ کوئی خادم ہو۔ اس کی عبادتیں اور امام کا رتبہ جیسے بے معنی تھے۔ جیسے وہ ایک ناکارہ انسان تھا جس کی ذرا سی غلطی پر ایک صاحب حیثیت انسان اسے خوار کر سکتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی رہی۔ اگر واجد کا دل دکھا تھا تو ظہیر اس سے معذرت کیوں کرتا۔ واجد کی روزی کا انحصار ظہیر پر تھا۔ پھر معافی کیسی؟ واجد نے غلطی کی اس لیے اس نے اسے ٹوک دیا۔ یہ ظہیر کا فرض تھا۔ واجد کی جگہ کوئی مزارعہ ہوتا تو اس کی پٹائی ہو جاتی۔

''تم یہاں خوش ہو؟''

''جی اللہ کا کرم ہے۔'' واجد نے نیچی اور اداس آواز میں جواب دیا۔

''اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' ظہیر تمکنت سے بولا اور دروازے کے باہر نکل گیا۔ واجد بھی سر جھکائے ست قدموں سے چلتا ہوا اُس کے پیچھے ہو لیا۔

ایک بوڑھا خادم لالٹین اٹھائے چبوترے کی سیڑھیوں کے پاس ظہیر کا منتظر تھا۔ ملازم کے چہرے پر نفرت بھری مسکراہٹ تھی۔ اس نے واجد پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی بھی تکلیف گوارہ نہیں کی۔ ظہیر نے اپنے جوتے پہنے اور چھڑی اٹھائی۔ واجد کے سلام علیکم کا جواب دیا اور اپنے نوکر کے ساتھ مسجد کے باہر چلا گیا۔

کچھ دیر تک ان کے قدموں کی آواز آئی پھر گم ہو گئی اور اب واجد اکیلا تھا۔ ساتھ تنہائی تھی۔ پریشان کن اور اذیت ناک۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وقت کس طرح گذارے۔ گاؤں میں اب تک اس کا کوئی دوست نہیں بنا تھا جس کے پاس وہ جاتا۔ اگر دوست ہوتا بھی تو اس سے وہ اپنے اس کرب اور ماضی کی خواری کو کس طرح بیان کرتا جو اس کی ذات کا حصہ بن چکی تھی۔ نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسی خوشگوار یاد تھی جسے اس وقت وہ یاد کر کے خوش ہوتا۔ اسے توقع تھی کہ شاید شب برأت کی وجہ سے ملک ظہیر اسے کھانے کی دعوت دیگا۔ لیکن وہ خفا ہو کر گیا تھا، اسے کیا پڑی تھی جو واجد کی دعوت کرتا۔

واجد بجھا بجھا سا چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ ''جلد کوئی نوکر میرا کھانا لے کر آئے گا۔ جسے

کھانے کے بعد میں اوراد و وضائف میں مصروف ہو جاؤنگا...... اور اس کے بعد خاموش ریاضت...... خدا کا تصور اور اس تصور میں کھو جانے کی کوشش...... اس کے بعد تہجد کی نماز اور کل صبح عبادت کے بعد ہر روز کی طرح گاؤں کے بچے بچیوں کو قرآن اور دینیات پڑھانا اور خوش نویسی کا ہنر دینا...... ہر روز ایک جیسا کام...... ایک جیسی مصروفیت...... اور ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے میری زندگی میں؟'' واجد نے خود سے کہا۔ اچانک اس اذیت ناک بیقراری نے اسے گھیر لیا جو ماضی کی یاد سے اکثر اسے محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس کے باپ کی موت، جسے خون میں لت پت اس گھر میں لایا گیا تھا، جہاں اس کی ماں ملازمہ تھی۔ اس دن کے بعد اس کی شب و روز کی آہ وزاریاں۔ کچھ مدت کے بعد جب اس کا غم کم ہوا تو رات میں اسے سوتا چھوڑ کر وہ کہیں نکل جاتی۔ پھر ماں کا گھر سے نکالا جانا۔ در بدر کی ٹھوکریں اور اس کے بعد جب وہ محض چار سال کا تھا تو ماں اسے عید کے دن عیدگاہ میں چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ یتیم خانہ میں اس کی پرورش ہوئی جہاں اس سے عمر میں بڑے لڑکے اسے گالیوں سے نوازتے اور اگر قرآن وہ حفظ نہیں کر لیتا اور اس کی قرأت شیریں نہیں ہوتی تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ پھر ایک مدرسے میں معلمی اور ایسی تنخواہ جس میں اس کی گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ اس کا کوئی دوست نہیں بن سکا تھا۔ اسے خود بھی سب سے بیگانگی کا احساس ہوتا۔ ایک کربناک خلا تھا جس میں نہ کسی کی محبت تھی اور نہ ہی اپنائیت۔ ماں کا خیال کبھی آتا تو اسے نفرت محسوس ہوتی۔ وہ اگر اسے چھوڑ کر غائب نہیں ہو جاتی تو ایک سہارا ہوتا۔ دل کی بات سننے والا تو کوئی ہوتا۔ واجد اداس سا چبوترے کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اس کے تلوے کے نیچے فرش رات کی ٹھنڈک سے خنک ہو رہا تھا۔ آسمان میں جلتے بجھتے تاروں کی دھول تھی اور ان کے درمیان زرد چاند سانپ کی طرح کنڈلی مارے زہریلی نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ مسجد خاموش تھی اور اس کے صحن میں برگد کی خمیدہ شاخیں دیوانے کی بانہوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

واجد نے اپنے کرتے کے بٹن کھول دیئے اور پگڑی اُتار کر منڈیر پر رکھ دی۔ پسینے سے نم سر اور سینے پر ہوا کی خنکی اُسے بھلی لگی۔ اس کی طبیعت بشاش ہو گئی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ارد گرد اس کی نگاہ دوڑی۔ جھاڑیوں سے گھرے وسیع صحن کے وسط میں پتھروں کے درمیان بہتا ننھا سا چشمہ تھا اور صحن سے کچھ پرے ویران اور خستہ حویلی تھی۔ جس کی شکستہ چھت رات کی

سیاہی میں نمایاں تھی۔ دن ہوتا تو وہ حویلی کے کھنڈر میں چلا جاتا۔ جہاں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ سنسان حویلی میں وقت گزارنا واجد کا محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر اس کے ہاتھ میں کسی بزرگ کی لکھی کوئی کتاب ہوتی جسے پڑھنے کی نوبت کم ہی آتی۔ اس کا زیادہ تر وقت کچھ سوچتے یا خواب دیکھتے گزرتا۔

واجد نے کسی سے سنا تھا کہ وہ جس مسجد کا امام تھا، اُسے اس خستہ حویلی کی مالکن نے کبھی تعمیر کیا تھا۔ وہ ایک طوائف تھی جس کی شادی کوٹ فتح خاں کے ایک بڑے جاگیردار سے ہوئی تھی۔ وہ لاولد تھی اور مسجد اس نے اس لیے بنوائی تھی تاکہ خدا خوش ہوکر اس کی گود ہری کردے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شدید مایوس ہوکر اس نے خودکشی کرلی اور اس کی موت کے غم سے اس کا خاوند پاگل ہوکر مر گیا۔ حویلی میں پھرتے ہوئے واجد کو اکثر اس طوائف کا خیال آتا...... اس کے حسن کا تصور...... اس کے رقص کا خیال...... اس کے شب و روز کے مشاغل کی سوچ...... ان سب میں ایک کیف تھا...... ایک خوشی تھی نایاب سی۔ کیا سبھی عورتیں رقص کرتی ہیں؟ کیا وہ عورتیں بھی ناچتی ہیں جو مسجد کے چشمہ سے پانی لینے آتی ہیں۔ جن کی جوان بانہوں کی جنبش، اور رانوں کی حرکت اس کی آنکھوں کو گناہگار بنا دیتی ہیں۔ واجد اکثر اسی طرح کے تصورات میں گم ہو جاتا۔

آسمان میں اچانک آتش بازیاں پھٹ پڑیں۔ سرخ، سبز، نیلے اور سنہرے رنگوں سے آسمان نکھر گیا۔ گاؤں سے مسرور لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔ واجد کا دل چاہا کہ وہ بھی گاؤں میں جائے اور لوگوں کی خوشی میں شریک ہو۔ مذاق کرے اور مذاق سنے۔ ان کے ساتھ بھاگ دوڑ کرے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوتا۔ اس کی عبادتیں، امام کے فرائض، اسے ایک آہنی خول میں بند رکھتے تھے جسے توڑنا بہت مشکل تھا۔

"خدایا یہ کیسی تنہائی ہے۔ کیسی قید ہے؟ جس سے میں نہیں نکل سکتا۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اللہ کوئی سبیل نکال دیگا۔" واجد اپنے آپ سے بولا۔ جواب میں خاموشی نے اس کا منہ چڑا دیا۔

مسجد کے دروازے اب تک کھلے تھے اور وہاں سے لالٹینوں کی روشنیاں سہمی ہوئی جھانک رہی تھی۔ وہ مسجد کے اندر گیا۔ ٹیڑھی میڑھی چٹائیوں کی صفوں کو اس نے سیدھا کیا۔ لالٹینوں کو بجھایا اور باہر آکر مسجد کے دروازوں کو بند کرنے لگا۔ اچانک ہوا کے جھونکے حویلی میں کھلے پھولوں کی خوشبو سے معطر اسے گدگدانے لگے۔ ان کی چھیڑ خانی واجد کو بھلی لگی۔

فرحت کا اسے احساس ہوا اور وہ لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ خوشی کی لہر اس پر چھا گئی اور اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اپنے معبود کی تلاش میں گئیں، جہاں تاروں کی گردش تھی اور ایک عظیم خلا کی وسعت۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی کوٹھری میں گیا جو مسجد کی دیوار کے ساتھ بنی تھی۔ زمین پر رکھی لالٹین کو اس نے دیوار میں ٹھکی میخ سے ٹانگ کر اس کی لو کو تیز کیا اور طاق میں پڑی ڈھیر سی بوسیدہ کتابوں میں سے ایک کو اٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ورق پلٹے اور پھر پڑھنے لگا...... ''علم کی دو قسمیں ہیں۔ مابعد الطبیاتی اور دوسری انسان کی بابت۔ آخر الذکر بے سود اور وقت کی بربادی ہے۔ چونکہ انسان فانی ہے۔ مابعد الطبیعاتی علوم سے انسان پر وہ سارے اسرار کھلتے ہیں جن سے وہ ہمیشہ بے خبر رہا ہے......'' واجد پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ ملک ظہیر کے رعونت بھرے وہ الفاظ اس کے کان میں گونجنے لگے جنہیں اسے مسجد میں سننا پڑا تھا۔ کتاب میں واجد کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے حقیقت یہ دنیا تھی جہاں دن رات انسانوں سے واسطہ رہتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے محسوس ہوئی۔ کتاب اس نے طاق پر رکھ دی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ ہوا رک گئی تھی اور کوٹھری گرم ہونے لگی تھی۔ اس نے غسل کرنے کا فیصلہ کیا اور چارپائی کے نیچے سے ٹین کے بکسے کو نکالا جس میں اس کے کپڑے تھے۔ لنگیوں اور کرتوں کے درمیان چند خشک پھول تھے جن کی خوشبو اور رنگت مٹ چکی تھی۔ جنھیں اس نے پیروں اور مرشدوں کے مزاروں پر پڑے پھولوں سے چن لیا تھا۔ واجد ان ہی بزرگوں کی طرح عظیم بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ واجد پھولوں کو تکنے لگا۔ ان سے بزرگوں کی آواز آتی سنائی دی۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ متقی اور پرہیزگار بننے کی تلقین کر رہے تھے۔ ان گناہوں سے دور ہونے کی نصیحتیں کر رہے تھے جو اکثر اسے پریشان کر دیتی تھیں۔ واجد نے تقویت سی محسوس کی۔ اس نے پھولوں کو بکسے میں رکھ دیا، کپڑے نکالے اور چشمہ پر غسل کرنے چلا گیا۔ تاریکی میں جگنو جگمگا رہے تھے اور جھاڑیوں سے جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چشمے کے خنک پانی کو اپنے جسم پر بہاتے ہوئے اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔

وہ پگڈنڈی جو مسجد کی دیوار کے ساتھ گاؤں کی جانب جاتی تھی، اس پر ظہیر اور اس کا نوکر مجید چل رہے تھے۔ مجید کے ہاتھ میں لالٹین جھول رہی تھی اور اس کی روشنی میں جنگلی گھاس

کے درمیان راستہ نمایاں تھا۔ مسجد کے احاطے میں جو گھنے درخت تھے ان کی شاخیں دیوار کے اوپر سے پگڈنڈی پر جھکی تھیں۔ جیسے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی ہوں۔ اچانک ایک درخت میں اُلو کی کرخت آواز گونجی۔ ملک ظہیر کو گھبراہٹ ہوئی۔ اس کے قدم تیز ہو گئے اور چھڑی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اُلو کے بولنے کو وہ نحوست سمجھتا تھا۔ لیکن مجید پر سکون چلتا رہا۔ توانا جسم، پستہ قد اور ضعیفی کی وجہ سے ذرا سی جھکی ہوئی کمر۔ سفید داڑھی اور ماتھے پر شب و روز کی عبادت کی وجہ سے سیاہ گول داغ۔ وہ کسی سوچ میں مبتلا تھا۔

''مجید...... تو مسجد کیوں نہیں آیا؟ واجد اچھا امام ہے۔ اس کی قرأت سے تیرا دل بھی خوش ہو جاتا۔'' اپنے اضطراب پر قابو پانے کے لیے ملک ظہیر نے موضوع تلاش کیا۔

مجید نے زمین پر تھوکا۔ جیسے کوئی شے اس کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

''وہ نوجوان ہے...... ایک چھوکرے کا امام بن جانا...... ہوں۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اسے قرآن شریف کے الفاظ ا۔ ل۔ م۔ کے معنی کا بھی پتہ نہیں ہے۔ تمہارے اباجی اگر زندہ ہوتے تو اس واجد کو کبھی مسجد کا امام نہیں بناتے۔ کل پیدا ہوا اور آج امام بن بیٹھا...... ہوں۔''

مجید کڑوے لہجے میں بولا اور متفرانہ مسکراتا ہوا مڑ کر اس نے اپنے مالک کی جانب دیکھا۔

غصے سے ملک ظہیر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے کسی فیصلے کو آج تک غلط نہیں قرار دیا گیا تھا۔ اس کے سامنے نفی کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا ملازم اس کی کاروائی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مجید کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو ظہیر اس کو طمانچہ جڑ دیتا۔ لیکن مجید کی خطا پر اسے مارنا آسان نہیں تھا۔ مجید ملازم تھا بھی اور نہیں بھی۔ اسے ملک ظہیر کے مرحوم باپ نے نوکر رکھا تھا اور مجید نے دل و جان سے اس کی خدمت کی تھی۔ نہ صرف اس نے ظہیر کو گود میں کھلایا تھا بلکہ اس کے بچوں کا بھی وہ نگہبان رہ چکا تھا۔ کوٹ فتح خاں کے ہر مسئلہ کی اونچ نیچ سے مجید نے ظہیر کو واقفیت کرائی تھی۔ لہٰذا ملک ظہیر چپ رہا۔ اپنے خیالات میں کھویا اور کسی قدر غصے میں بل کھاتا ہوا وہ مجید کے پیچھے چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے ظہیر بولا۔

''مجید...... بابے...... مجھے پتہ ہے تو کیوں دُکھی ہے؟ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے واجد مل گیا۔ اس کی آواز شیریں ہے اور اس میں مقناطیسی کشش بھی ہے۔ اس کی قرأت سننے کے لیے ہر روز نمازیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ واجد حافظ قرآن ہے۔ وہ گاؤں کے بچوں کو

قرآن حفظ کراتا ہے۔ دینیات اور اردو کی تعلیم دیتا ہے۔ میری ذمہ داریاں گاؤں والوں کی جانب بہت زیادہ ہیں۔ کیا تجھے نہیں پتہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔ پاکستان بن گیا ہے اور کشمیر میں جنگ چل رہی ہے۔ سارا ملک ہندو مسلم فساد کی لپیٹ میں ہے۔ ہمارے بچوں کو علم کی شدید ضرورت ہے۔''

مجید نے جیسے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ سر جھکائے چلتا رہا۔ آسمان تاریک تھا اور خاموشی راہگیروں کے پیروں کی دھم دھم سے ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔ گاؤں سے پٹاخہ چھوٹنے کی آواز کبھی کبھی آجاتی اس کے بعد پھر سناٹا چھا جاتا۔ درخت سے اُلو کے بولنے کی کرخت آواز پھر آئی۔ مارے وحشت کے ملک ظہیر تقریباً اچھل پڑا۔

''مجید اس منحوس اُلو کا کسی طرح خاتمہ کر۔'' ملک ظہیر کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

''تمہارے حکم کو امام واجد تک پہنچا دیں گے۔ مسجد کی دیکھ بھال وہی کرتا ہے اور درخت مسجد کے احاطے میں ہے۔'' مجید نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''احمق...... نکمے...... مجھے پتہ ہے تو کیوں واجد سے جلتا ہے؟ چونکہ اس نے تیری جگہ لے لی ہے اور تو اب امام نہیں رہا۔'' ملک ظہیر کی غصہ سے مٹھیاں بھنچ گئیں۔ بڑی مشکل سے نوکر کو مارنے سے اس نے خود کو روکا۔

اس تلخ حقیقت کو سن کر مجید کا دل دکھا۔ جس دن سے واجد امام بنا تھا، اُس دن سے مجید کے دل میں اس کے خلاف شدید نفرت اُبھر آئی تھی۔ اِس نفرت کا اظہار وہ کس کے سامنے کرتا، ہنسی اسی کی اڑائی جاتی۔ ماضی میں کبھی اس نے اپنے مالک سے گلہ کیا تو ظہیر نے سنی ان سنی کر دی۔ لیکن آج تو اسے باضابطہ ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ ملک ظہیر کی آواز میں دھمکی تھی۔ اس کے غصے کے نتائج کیا ہونگے مجید کو پتہ تھا۔ ظہیر کو مجید نے گود کھلایا تھا۔ اس کی ہر خواہش کا مجید نے احترام کیا تھا۔ پھر بھی اسے نہ صرف ایک متبرک عہدے سے الگ کر دیا گیا بلکہ آج اسے ذلیل بھی کیا جا رہا تھا۔ جس کی اذیت اسے کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی چونکہ وہ ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ گزشتہ تیس سال سے اس کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ بہت ساری آئتیں اسے یاد تھیں۔ لیکن اس کے آقا کی نگاہوں میں یہ سب کچھ بیکار تھا۔ غم سے مجید کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ پگڈنڈی پر سر جھکائے چلتا رہا۔ لالٹین کی روشنی میں اچانک اسے گھانس میں کوئی شے سرکتی محسوس ہوئی۔ لمحے بھر کے لیے مجید کو خیال آیا کہ راستہ بدل کر نکل جائے اور ظہیر کو اس سے نپٹنے

دے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ظہیر کے لیے اس کے دل میں محبت تھی۔ وہ اب بھی اس کی نگاہ میں بچہ تھا جسے خطرے سے بچانا اُس کا فرض تھا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر ظہیر کو رکنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی بڑی احتیاط سے گھانس کی جانب جھکا۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک سانپ بے بس تڑپ رہا تھا۔ جانور کے منہ سے برچھی کی طرح نکلتی زبان اور لالٹین کی روشنی میں اس کی پیلی جلد پر سیاہ دھبے اس کے مہلک ہونے کا ثبوت تھے۔ ظہیر کانپ کر رہ گیا، اس کا ملازم اسے گھور رہا تھا۔ مجید کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ وہ اس درویش کی طرح لگ رہا تھا جسے اپنی روحانی طاقت کا علم ہوتا ہے۔ مجید کو جیسے اس موت کی خبر تھی جو سانپ کی شکل میں گھانس میں چھپی اپنے شکار کی منتظر تھی اور قبل اس کے وہ وار کرتی، اس نے اسے قابو میں کر لیا تھا۔

ظہیر خوف سے پتھرا گیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھ ہوا میں بلند ہو گئے۔ جیسے وہ زہریلا سانپ مجید کی گرفت سے نکل کر اس پر حملہ کر دے گا۔ وہ اس وقت اس سہمے ہوئے بچے کی طرح لگا جسے حفاظت کی ضرورت تھی اور جو اس وقت اسے اپنے ملازم ہی سے مل سکتی تھی۔

"خدایا...... سانپ...... مم...... مارا سے...... جلدی......" ظہیر ہکلایا۔

مجید نے پوری طاقت سے سانپ کو مسجد کی دیوار پر مارا۔ سانپ کی نازک ریڑھ کی ہڈی ایک نرم سی چیخ کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ اسے مجید نے زمین پر پھینک کر جوتوں سے کچلا اور ٹھوکر مار کر دُور پھینک دیا۔ مجید کی سانس تیز تھی اور جسم گرم تھا جیسے کسی طاقتور دشمن سے وہ لڑتا رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی کی جڑوں میں پسینے کے قطرے تھے اور اُس کی نگاہیں ظہیر پر گڑی تھیں۔

"خدا کا ہو جانے کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں۔ خدا یہاں بستا ہے۔" مجید نے اپنے سینہ پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ قبل اس کے کہ ظہیر کچھ جواب دیتا، مجید ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تہذے مرحوم والد جب حج کے لیے مجھے مکّہ لے گئے تھے تو مجھے وہ مل گیا جس کی کھوج سب کو ہوتی ہے۔ خدا یہاں بستا ہے۔" اس نے اپنے سینے پر دوبارہ گھونسہ مارا اور چل پڑا۔

ظہیر ہارے ہوئے انسان کی طرح تھکے تھکے قدموں سے اپنے نوکر کے پیچھے ہو لیا۔ اس کا سر جھکا تھا اور پیروں میں جیسے وزن بندھے تھے۔ وہ مٹھیاں جو چند لمحے کسی ہوئی تھیں وہ اب ڈھیلی اور بے جان ہو گئی تھیں۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس جانور کی طرح ہے جس

کے گلے میں رسی ڈال کر کھینچا جا رہا ہو۔ دونوں جب گاؤں میں داخل ہوئے تو ظہیر کو دیکھ کر کچے مکانوں کے سامنے بیٹھی عورتیں اپنی کوٹھریوں میں سرک گئیں اور مردوں نے تعظیم سے جھک کر اسے سلام کیا۔ لیکن ظہیر نے جواب نہیں دیا۔ ندامت سے اس کے احساسات سلب ہو گئے تھے۔ اسے آنکھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اس نے مجید کو امام کے رتبے سے ہٹا کر اس کے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ لیکن زندگی اور موت خدا کا کھیل ہے، مجھے اس کا ممنون ہونا چاہئے۔ مجید محض ایک وسیلہ تھا اس بڑی ذات کا جس نے اس کے ذریعہ میری جان بچادی۔ اس سوچ سے ظہیر کو شرمندگی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر بھی مجید سے اس وقت آنکھ ملانا ممکن نہیں تھا۔ خفت اتنی جلد نہیں مٹ سکتی تھی۔ جب وہ اپنی حویلی میں داخل ہونے لگا تو اس نے مجید کو اندر آنے سے منع کر دیا۔

''اللہ! میں نے اپنی بڑائی ثابت کر دی۔'' مجید بڑبڑاتا ہوا اپنی کوٹھری کی جانب آیا۔ ''مجھ میں بھی فقیروں اور پیروں کی صفتیں ہیں۔ میرے بے قدرے مالک کو علم نہیں تھا۔ لیکن آج اسے بھی پتہ چل گیا۔ خدا انصاف کرنے والا ہے اور وہ کرے گا۔'' مجید بڑبڑاتا ہوا اپنے گھر کی جانب آیا جو حویلی کے قریب تھا۔ اس نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور وہ کھل گیا۔ قسمت کے دروازے کی طرح جو ہمت کی ٹھوکر سے کھل جاتا ہے۔

اندر پرانے کپڑوں اور لحاف کی کچی شراب جیسی بو تھی۔ مجید نے کوٹھری سے کھٹیا نکالی اور اس پر دری ڈال دی۔ لوٹ کر وہ واپس آیا اور اس طاق کے پاس گیا جہاں لالٹین، حقہ، تمباکو اور ماچس کی ڈبیا پڑی تھی۔ اس نے حقہ اٹھا لیا اور چلم میں تمباکو جلا کر اپنے جوتے اتارے اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ آج تمباکو میں کچھ زیادہ ہی مزا اسے محسوس ہوا۔ وہ واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے جو کچھ دیر پہلے رونما ہوئے تھے۔ رات کے وقت گاؤں میں سانپ اور بچھوؤں کو رینگتے ہوئے دیکھنا کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ مجید ان سے نپٹنا جانتا تھا۔ لیکن ضعیفی نے اسے محتاط بنا دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اب ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ خوف اس کی حسیات میں کبھی جگہ نہیں پا سکا تھا۔ جب تک اس کے قویٰ مضبوط تھے اس کی دلیری کی دھاک تھی۔ دوسرے جاگیرداروں کی جاگیر میں جا کر ان کے مزارعوں کو للکار آنا، اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن اب پیران سالی اور اس کی عطا کردہ کمزوری سے وہ مجبور ہونے لگا تھا، پھر بھی آج اس کی جرأت واپس آگئی تھی۔ وہ وہی مجید تھا، جیالا اور نڈر جو

اپنی جان پر کھیل جانا جانتا تھا۔ اسی لیے وہ ملک ظہیر اور اس کے مرحوم والد کو عزیز تھا۔

''ربا...... تو منصف ہے۔ اپنے نوکر کی بچی پرواہ ہے تجھے۔'' ایک لمبی سانس لے کر مجید سرگوشیوں میں بولا۔ اس کی آنکھیں سکڑ آئی تھیں۔ وہ اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ جیسے وہاں خدا کا جلوہ تھا۔ وہ جلوہ جسے صرف وہ دیکھ سکتا تھا۔

ایک جوان عورت ملک ظہیر کی حویلی سے نکلی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک اور اس کی گود میں بچے کی منمناہٹ مجید نے قریب آتی ہوئی سُنی۔ وہ عورت نوراں تھی جو اپنی دو سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اور سر پر طشت رکھے اس کی جانب آرہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ مجید کے پاس آگئی۔ نوراں اس کے لیے رات کا کھانا لائی تھی۔

''کھانا مسجد میں لے جا۔'' مجید تحکمانہ بولا۔ اس نے نوراں کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

''نوراں مسجد میں جائے؟'' وہ حیرت زدہ تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''ہاں...... امام کو لے جا کر کھانا دے...... اسے فضیلت ہے...... اسے پہلے کھانا چاہئے۔'' جذبات سے عاری آواز میں مجید بولا۔ وہ اب نوراں کو گھور رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر بڑی ہوگئی تھیں۔

''لیکن چاچا...... کھانا تو تمہارے لیے ہے اور تم نے حکم دے رکھا ہے کہ میں مسجد میں کبھی پیر بھی نہیں رکھوں۔'' نوراں کا لہجہ تلخ تھا۔

''وہ پرانی بات ہوگئی۔ اس وقت مسجد میں جن رہتے تھے۔ انھیں جوان چھوکریاں پسند تھیں۔ بھول گئی۔ زینب اور فضلاں کو وہاں جاتے رہنے کی وجہ سے کیا ہو گیا؟ اب ان کی سمجھ بوجھ بچوں جیسی ہے۔ ہوش حواس کیا، کپڑے لتے کی بھی انھیں خبر نہیں۔ لیکن نیا امام عالم اور بزرگ ہے۔ اس نے جن کو بھگا دیا ہے۔ اللہ کا سب پر کرم ہوتا ہے۔ جا...... تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' کچھ سوچتے ہوئے ایک یقین کے ساتھ مجید بولا۔ وہ چلم میں بجھتے تمباکو کو اس چاندی کے خلال سے کرید رہا تھا جو کالے دھاگے سے بندھا اس کی گردن سے لٹکا رہتا تھا۔

امام کے ذکر سے وہ دکھ پھر سے مجید کے دل میں ابھر آیا جو امامت سے ہٹائے جانے اور آج ظہیر کی پھٹکار سن کر اسے ہوا تھا۔ ایک ہلکی سی سسکی اس کے منہ سے نکل گئی۔ نوراں کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولنے لگا۔

"نیا امام قاری ہے۔ قرآن کا حافظ ہے۔ سورۃ کو گا کر سناتا ہے...... ہونہہ...... گا کر؟ گاؤں کے چھوکرے اور چھوکریوں کو علم دیتا ہے...... میں کیا ہوں؟ چلم کی راکھ...... گناہگار اور بے عقل...... آہ...... مجھے حلوہ، پلاؤ اور قورمے کی ضرورت نہیں ہے۔ حویلی سے میرے لیے سادی روٹی اور دال لے آ۔ مزیدار کھانا امام کو جانا چاہئے۔ وہ بڑا ہے...... خدا اس کا ہے...... جا نوراں...... حویلی سے رفیعہ کو ساتھ لے جا...... خدا سب دیکھتا ہے...... وہی انصاف کرتا ہے۔"

نوراں ہلی نہیں۔ اس کے باریک ابرو غصے میں تنے تھے اور پتلے لبوں پر متنفرانہ مسکراہٹ تھی۔ اسے وہ دن یاد تھا جب وہ گاؤں کی عورتوں کے ساتھ مسجد کے چشمہ سے پانی لانے گئی تھی اور مجید نے اسے گالیاں دے کر نکال دیا تھا اور جب اس نے واویلا کیا تو مجید نے اسے نہ صرف رنڈی کہا بلکہ اسے مارنے بھی لپکا تھا۔ ایسی بے عزتی وہ بھی سب کے سامنے؟ چشمہ کے پاس اسے گھڑے میں پانی بھرتے دیکھ کر اسے نمازی گھورتے تھے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ اور جب ٹوٹی کوٹھری میں ملک کا بیٹا اس کی عزت لوٹ رہا تھا اور یہ گاؤں کا چاچا باہر کھڑا تھا، تو کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں وہاں اکیلی تھی، اور ملک کے بیٹے کو اندر آ کر دروازے کو بند کرتے اس نے دیکھا تھا۔ پھر بھی میری مدد کو یہ انسان نہیں آیا۔ میں غریب بے بس عورت پھر کیا کرتی؟ چیختی......؟ چاچا مجھے بچا۔ ایک بار جب میری عزت لٹ گئی تو ملک کے بیٹے کے بار بار مزہ لینے سے میں کیسے روکتی؟ اور یہ بڈھا ملک ظہیر مجھے اپنے پاؤں دابنے کے لیے کہتا ہے اور ان پر مالش بھی کراتا ہے تو میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔ میرا اپناپن مجھ سے زبردستی چھینا گیا ہے۔ میں بری عورت نہیں...... ۔ نوراں کو سب کچھ یاد آیا اور ہر یاد کے ساتھ وہ تڑپ گئی۔

"نہ چاچا...... میں مسجد میں نہیں جاؤں گی۔ امام کے لیے حویلی کے نوکر کھانا لے کر جاتے ہیں۔ کدھر ہیں وہ؟ پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں؟ انھیں حکم دو کہ وہ کھانا لے کر جائیں۔ میں دوسروں کا کام نہیں کروں گی۔"

نوراں کے تلخ لہجے اور انکار کو سن کر مجید کا چہرہ غصے سے گرم ہو گیا۔ اس نے حقہ ایک جانب رکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اس پر برس پڑے۔ ملک ظہیر کے مزارعوں اور نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اور کبھی پیٹ دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ان کی ادائیگی کی اسے ملک ظہیر کے مرحوم باپ کے زمانے سے اجازت تھی۔ لیکن اس وقت مجید نے

خود کو قابو میں رکھا۔

''چھوکری...... تجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرے حکم سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ جانتی نہیں تو میری پڑوسن ہے۔ میں تجھے نیک کام کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں اور تو ہے کہ میری بات نہیں مان رہی ہے۔''

نوراں کانپ گئی۔ مجید کے غصے کے نتائج کیا ہو سکتے تھے اُسے پتہ تھا۔ ملک ظہیر کی جاگیر میں کسی کا اغوا یا قتل ہو جانا بڑی بات نہیں تھی۔ جرائم ملک ظہیر ہی کے اشارے پر ہوتے تھے۔ لیکن کون انہیں ممکن بناتا ہے اور کس طرح یہ سب کچھ ہو جاتا ہے، لوگ جانتے تھے۔ لیکن مجید پر انگلی اٹھانے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ نوراں کا خاوند دُور شہر میں مزدوری کرتا تھا اور نوراں کے جسم کا عاشق، ملک ظہیر کا بیٹا بھی کسی دُور فوجی اسکول میں پڑھتا تھا۔ مجید سے نوراں کی کوئی ایسی رشتہ داری نہیں تھی۔ لیکن مجید کا وجود کسی بزرگ نگہبان کی طرح ضرور تھا۔ بغیر ایسی نگہبانی کے نوراں کی زندگی مشکل تھی۔ ملک ظہیر کی حویلی میں جو تھے، نوالوں کو کتوں کی نذر کرنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ اجتماعی زنا کا شکار ہونا اور اس کے بعد اپنے غم اور اپنی ذلت کو راز رکھنا، مجبور عورتوں کا مقدر تھا۔ دل ہی دل میں مجید کو گالیاں دیتی ہوئی نوراں وہاں سے سرک گئی۔ وہ جب دوبارہ حویلی سے نکلی تو اس کے ساتھ ایک لڑکا لالٹین اٹھائے ہوئے تھا اور جب وہ مسجد کی جانب جانے لگی تو مجید کے حقے کی گڑگڑاہٹ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

واجد نے غسل کرنے کے بعد کپڑے بدل لئے۔ گرم رات میں بھیگا جسم اسے فرحت دینے لگا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ احاطے کے دروازے سے ایک عورت اور لڑکے کو آتے دیکھ کر واجد چونک پڑا۔ عورتیں رات کے وقت مسجد میں کبھی نہیں آتی تھیں۔ دن کے وقت ان کا آنا ہوتا تھا اور وہ بھی چشمے سے پانی نکالنے کے لیے۔

نوراں ڈر کر دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھ کپکپائے۔ کالی رات...... تاریک مسجد...... احاطے میں اونچے گھنے درخت اور چشمے کے پاس ایک طویل قامت سفید پوش انسان۔ ڈر تو لگنا تھا نوراں کو۔

''میں کھانا لائی ہوں۔'' مری ہوئی آواز میں نوراں بولی۔

"وہاں برآمدے میں رکھ دو۔" واجد کی کوٹھری کے ساتھ جو برآمدہ تھا اس جانب اس نے اشارہ کیا۔

بھاری آواز، لیکن لہجے میں نرمی۔ نوراں کے خوف میں کچھ کمی ہوئی۔ وہ برآمدے کے پاس پہنچی تو واجد بھی وہیں پر آ گیا۔ نوراں اب بھی سہمی ہوئی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پاس وہ انسان تھا جو اس سنسان مسجد میں تنہا رہتا تھا۔ جو متبرک اور محترم تھا اور جس کی گفتگو خدا سے بھی ہوتی تھی، شاید۔ نوراں کو اپنے گناہگار وجود کا شدت سے احساس ہوا۔

"تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔ لا، مجھے طشت دے۔" واجد نے ہاتھ بڑھا کر نوراں کے سر پر سے طشت اٹھا لیا۔ رات کے وقت ایک جوان عورت کو دیکھ کر اسے ایک خوشگوار احساس ہونے لگا۔ جیسے تپتے ہوئے پتھر پر بارش کے قطرے گرنے لگے ہوں۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں نوراں کا صاف چہرہ، بڑی آنکھیں جو اس پر نگاہ ڈال کر فوراً جھک جاتی تھیں۔ لمبی گردن کے نیچے دوپٹے اور کرتے سے چھپے دو بڑے سے ابھار۔ ایک عجیب سی سرشاری اس پر چھا گئی۔ اس کا دل چاہا کہ پاس کھڑی عورت کے گالوں کو چھو لے اور اس کے سینے کے ابھار پر اپنا ہاتھ رکھ دے۔ لیکن ایک خوف، لاشعور میں چھپی کسی طاقت نے اسے سختی سے منع کیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جس مقام پر ہے وہاں ایسا کرنا بدترین گناہ ہے۔ نوراں بھی مارے احترام کے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس کی گود میں جو بچی تھی وہ چیخ مار کر رو پڑی۔ پانی سے بھیگی واجد کی سیاہ داڑھی اور اس کے سفید ملبوس نے اسے ڈرا دیا تھا۔ وہ ماں سے چمٹ گئی اور ہیبت سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"ننھی ڈر گئی ہے...... اسے لے جاؤ...... جوٹھے برتن کل کوئی لے جائے گا۔"

"مالکن کا حکم ہے کہ برتن نہیں چھوڑے جائیں۔ جوٹھے کھانے کی تلاش میں ناپاک جانور مسجد میں آ جاتے ہیں۔"

واجد خوش ہو گیا۔ عورت کچھ دیر کے لیے رُکے گی۔ کچھ دیر اور وہ اس کی قربت سے لطف اندوز ہوگا۔ اس نے دل میں کہا اور برآمدے میں بچھی چٹائی پر طشت کو رکھا۔ پلاؤ، قورمے اور فرنی کی خوشبو اس کے نتھنوں میں لپکی۔ نوراں کی گود میں بچی اپنے ہاتھ اور پیر کو اُچھالتی ہوئی روئے جا رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں اس کا رونا بھیانک لگ رہا تھا۔

"شاداں! چپ ہو جا۔ تجھے کون کاٹ رہا ہے جو اس طرح رو رہی ہے۔ چپ ہو۔ نہیں

تو چھوڑ دوں گی تجھے یہاں...... سمجھی۔''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔ یہاں ہر شخص رُک کر عبادت کر سکتا ہے۔ تم بھی رُک سکتی ہو یہاں۔'' واجد کو اپنے الفاظ کی معنی خیزی کا احساس ہوا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

نوراں چونک پڑی۔ بیٹی کے رونے چیخنے سے جو جھنجلاہٹ اس کے چہرے پر تھی وہ مٹ گئی۔ وہاں نرمی آ گئی۔ مرد اس سے سخت لہجے میں بات کرتے تھے۔ صرف خاوند دھیمے لہجے میں بات کیا کرتا تھا...... وہ بھی کبھی کبھی...... اور اسی وقت جب اس کے جسم سے اسے اپنی ضرورت پوری کرنی ہوتی اور اب تو اسے کوٹ فتح خاں سے گئے ہوئے سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے امام نے جو کہا تھا اور جس طرح کہا تھا، اس سے نوراں کے لیے شناسائی کا اظہار ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس سے کبھی مل چکا تھا۔ جو ڈر نوراں کے دل میں تھا وہ ڈر چلا گیا۔ اسے خود اعتمادی کا احساس ہوا۔ شکر گزار نگاہوں اس نے واجد کو تکا، جو اس کے وجود سے بے خبر کھانے میں مصروف تھا۔

''میں نہیں رُک سکتی یہاں۔''

''کیوں نہیں؟ کیا تمہارے لیے عبادت ضروری نہیں ہے؟'' واجد کا ہاتھ رُک گیا۔ جو نوالہ اس نے نگلنا چاہا تھا اُسے اس نے نہیں اٹھایا۔ وہ غور سے نوراں کو تک رہا تھا۔ اس بزرگ کی طرح جو کسی کو نیکی کی تلقین کرتا ہے۔

نوراں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ گھبراہٹ میں اس کے پاؤں زمین پر ذرا سا سرکے۔ وہ واجد کو کیا جواب دیتی۔ کس طرح کہتی کہ وہ گناہگار ہے۔ اسے نماز پڑھنا بھی ٹھیک سے نہیں آتا۔ اس کے لیے مذہب عید میں صاف کپڑے پہننا، بقر عید میں قربانی کا گوشت کھانا اور رمضان میں روزے رکھنا تھا۔ حالانکہ روزے میں بھینسوں کی رہائش کی صفائی، کھیتوں میں کام کرنا اور پھر حویلی میں جھاڑو دینا اس کے علاوہ اس کے اپنے گھر کے کام اس کے پیٹ کے خالی پن کو اذیت بنا دیتے تھے، پھر بھی اس اذیت میں راحت تھی۔ اس شناخت کی خوشی تھی جو اسے دوسرے روزے داروں سے قریب کر دیتی تھی۔ بس یہی تھا اس کا مذہب، خدا کو خوش کرنے کا ادنیٰ طریقہ۔ پھر بھی معبود اس پر مہربان نہیں ہوا تھا۔ اس کے مقدر میں شاید خوشی تحریر نہیں ہوئی تھی۔ طمانیت، بے فکری اور سکون کیا ہیں؟ ان کا علم اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ گنہگار عورت تھی جو اپنی قسمت کے لکھے کو نہیں بدل سکتی تھی۔ اسی طرح اسے زندگی کاٹنی ہے۔ اس کا یقین تھا اور

سمجھ بھی۔ اس کی ذات ریگستان میں بھٹکتے اندھے کی طرح تھی جو پانی کے وجود سے بے خبر ہوتا ہے۔ نوراں چپ رہی۔ سناٹے میں صرف شاداں کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ وہ اب تھک کر ماں سے چمٹی خوابیدہ سی تھی۔ واجد جواب طلب نگاہوں سے نوراں کو تک رہا تھا۔

''میں نیچ عورت ہوں اور گناہگار بھی۔ جہاں بھینسیں بندھتی ہیں اس جگہ کو صاف کرتی ہوں۔ میں مسجد میں عبادت نہیں کر سکتی۔''

''خدا کی نگاہ میں کوئی نیچ نہیں۔ گناہ کس سے نہیں ہوتا۔ خدا معاف کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے سب برابر ہیں۔ تو بھینسوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ لوگ ان کا دودھ پی کر مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ تو ہم سب کی طرح ایک انسان ہے۔''

واجد جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے جو کہا اس میں خلوص تھا اور سچائی بھی۔ وہ تیزی سے چاول اور قورمے میں لتھڑی انگلیوں کو چاٹنے لگا۔ اس کی روح میں موسم سرما کی تاریک راتوں کی خنکی چھائی رہتی تھی۔ لیکن آج...... اس وقت...... اردگرد اڑتے جگنوؤں کی طرح۔ واجد کی روح میں بھی آرزوئیں، خواہشیں، اور توقعات چمکتے ہوئے اُڑ رہی تھیں۔

نوراں خوش ہو گئی۔ وہ بھی اہم ہے اور اس کی ذات کی بھی قدر و قیمت ہے۔ یہ سن کر نوراں مسکرا دی۔ اس کے سفید ہموار دانت دمک اٹھے۔

''صراحی کدھر ہے؟ میں تمہارے لیے پانی لے آؤں۔''

واجد نے اپنی کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔ نوراں وہاں سے المونیم کے گلاس میں پانی بھر کر لے آئی اور واجد کے پاس گلاس کو رکھ کر مودبانہ کھڑی ہو گئی۔ واجد اب بھی تیزی سے کھا رہا تھا اور اس کے منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نکل رہی تھی۔ نوراں کو محسوس ہوا کہ وہ اسی کی طرح کھاتا ہے۔ سر کو جھکا کر لقمہ منہ میں لے جانا...... انگلی سے رکابی صاف کرنا اور پھر اس انگلی کو چاٹنا۔ وہ بھی یہی کرتی تھی کھاتے وقت۔ نوراں کو امام سے قربت کا احساس ہوا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد واجد نے پانی پیا اور الحمد اللہ کہا۔ لمحے بھر کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں پھر انھیں کھولیں عمدہ غذا...... پاس کھڑی جوان عورت...... رات کی تاریکی اور خاموشی...... ایک عجیب سی مسرت اور طمانیت کا اسے احساس ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا بولے۔ نوراں بھی چپ سی رہی۔ اس نے جوٹھے برتنوں کو خاموشی سے سمیٹا اور چلی گئی...... بغیر کچھ کہے...... نہ سلام اور نہ ہی الوداع کا کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا بھی تو اس بے چینی نے

انھیں سلب کر لیا جو اس کے وجود میں سما گئی تھی۔ جب وہ مسجد کے دروازے سے نکلنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل پڑے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ایسا کیوں ہوا۔

واجد دیر تک اس راستے کو تکتا رہا جس پر نوراں گئی تھی۔ اسے زندگی میں خوشگوار تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اکتاہٹ اور تنہائی کی شدید گھٹن بھی رخصت ہو چکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ کچھ تو ہو گیا تھا ابھی۔ اچانک اور غیر متوقع۔ رات کے اس پہر میں نفل پڑھنے کے بعد وہ مراقبے میں چلا جاتا تھا اور آنکھیں بند کر کے کسی ماورائی دُنیا میں کھو جانے کی کوشش کرتا۔ جہاں اُسے اس نور کی تلاش ہوتی جس سے دنیا منور تھی۔ اسے گمان تھا کہ آج نہیں تو کل کامیابی ہوگی۔ اسی خیال سے اسے تسکین ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت کوئی جلدی نہیں تھی۔ ساری رات عبادت اور مراقبے کے لیے پڑی تھی۔ خدا ہر وقت موجود تھا۔ اس کی تلاش میں خود کو کسی وقت بھی گم کر سکتا تھا۔ کوٹھری سے وہ چارپائی نکال لایا اور اس پر پڑ گیا۔ اس کی روح میں ہلچل تھی۔ وہ آسمان کو تکنے لگا جہاں تاروں کی روشنی تھی اور مسکراتا ہوا چاند تھا اور نوراں تھی...... جو اپنی بچی کو گود میں اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی تھی کہیں۔

نوراں اپنی کوٹھری کی جانب آئی۔ مجید اپنے کچے گھر کے سامنے کھاٹ پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے نوراں نے دروازہ کھولا۔ اس کی بکری چونک کر کھڑی ہو گئی اور نوراں کی بلی اس کے بستر سے کود کر اس کے پاس آئی اور اپنے جسم کو اس کے پیر سے ملنے لگی۔ نوراں اسی کوٹھری میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ یہ جانور برسوں سے اس کے پاس تھے۔ جن کی بو کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ نوراں نے دروازہ کھلا رہنے دیا اور بیٹی کو چارپائی پر لٹا کر خود بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس نے بیٹی کی پیشانی کو چوما اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن نیند مکر گئی۔ مسجد سے اُسے کوئی بلا رہا تھا۔ وہ آواز قریب آ گئی۔ دروازے کے پاس ہی تھی شاید۔ نوراں نے ڈر کر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ تاریکی تھی اور خاموشی اور حویلی کے سامنے نیم کا درخت تھا۔ تاریکی میں لپٹا جھکا ہوا اور خاموش۔ سوتے جاگتے کے کھیل کو کھیلتے ہوئے نوراں نے رات کاٹ دی۔

مشرقی افق پر گلابی شفق میں صبح کھلنے لگی اور ستارے گل ہونے لگے۔ شبنمی ہوا کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔ نوراں کے گالوں کو اس کی چاندی کی بالیوں نے آہستہ سے سہلایا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی۔ اس کی مٹھاس اور تاثیر سے جانا

مشکل نہیں تھا کہ واجد اذان دے رہا تھا۔ نوراں کو محسوس ہوا کہ مسجد کا امام اسے عبادت کرنے کے لیے حکم دے رہا ہے۔ اس کے دل میں محترم جذبات اُمنڈ آئے۔ اٹھ کر وہ ضروریات سے فارغ ہوئی اور پھر وضو کیا۔ ایک صاف چادر بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس نے کلمہ پڑھا پھر اللہ اللہ کا ورد کرنے لگی۔ اسے نہ کوئی سورۃ یاد تھی اور نہ ہی وہ نماز کے آداب سے واقف تھی۔ لیکن خدا کو بار بار یاد کرنے میں ویسا ہی جذب تھا جو قرآن یا نماز پڑھ کر اسے حاصل ہوتا۔ جس طرح اس نے دوسروں کو نماز ادا کرتے دیکھا تھا، اسی طرح اس نے کسی طرح کیا۔
جب وہ عبادت سے فارغ ہوگئی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر سے کوئی بوجھ اٹھ گیا ہے۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی گنگناہٹ آگئی۔ کسی گیت کے نامکمل جملے جنھیں اس نے کبھی سنا تھا۔ بکری کے گلے سے ڈور کھول کر اسے چرنے کے لیے اس نے باہر بھگا دیا اور بلی کے سامنے مٹی کے پیالے میں دودھ رکھ کر سوئی ہوئی بچی کو گود میں اٹھا کر حویلی کی جانب روز کے کام انجام دینے روانہ ہوگئی۔ ملک ظہیر کی حویلی سے کچھ پرے مسجد کا بلند سفید گنبد شفاف صبح میں نمایاں تھا۔ نیم کے درخت کی شاخوں کو ہوا چھیڑ رہی تھی۔ درخت کے سبز پتوں میں جو تازگی اور نیا پن تھا، انھیں نوراں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا اور اس کے دل میں جو طمانیت اور خوشی تھی وہ اسے کبھی میسر نہیں آئی تھی۔

۲

مجید مسجد کے صحن میں پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ غصے میں ان دو آدمیوں کو تک رہا تھا جو درخت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چڑھ کر گھنے پتوں میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔

''نادارو...... تم دونوں ایک اُلو کو نہیں پکڑ سکتے۔ وہ جہنمی پرندہ دن کے وقت کہاں اُڑ کر جا سکتا ہے۔ یا دستگیر! یہ مردسالے کسی کام کے نہیں ہیں۔ انھیں ایک چڑیا بھی نہیں ملتی...... گدھے کی دم...... تمھیں اپنی ماؤں کی چوچیاں کیسے مل جاتی تھیں؟'' مجید چیخا۔

اونچے درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اُلو کہیں بھی چھپا ہو سکتا تھا۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ نم گرمی سے درختوں پر رینگنے والے دو انسان پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی زبانوں پر گالیاں تھیں جنھیں وہ زیرلب مجید کو دے رہے تھے۔ ''دیوانہ بڈھا۔ ہمت ہو تو اوپر آ۔ تجھے اس زور سے دھکیل کر نیچے پھینکوں گا کہ تیری کھوپڑی تین ٹکڑے ہو جائے گی۔'' دوسرے نے کہا۔ ''مفت خورہ، مرتا بھی نہیں، ہر روز حکم چلاتا رہتا ہے۔ جیسے یہی ملک ہے۔ یار...... نظر آیا حرامی الو؟''

واجد اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں دری پر بیٹھا گاؤں کے لڑکے اور لڑکیوں کو قرآن پڑھا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مجید پر تھیں۔ جس کی جھنجلاہٹ سے وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ واجد کی نگاہ اچانک درخت کی ایک بلند شاخ پر گئی۔ سبز پتوں میں چھپا گدلے پروں والا اُلو اسے صاف نظر آ گیا۔ واجد کے پاس ایک آٹھ سالہ لڑکا آیت رٹ رہا تھا۔ اس کی جیب میں غلیل اور مٹی کی بنی سخت گولیاں تھیں۔ واجد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے لڑکے سے غلیل

مانگ کر اُلو کی جانب نشانہ لگایا۔ واجد کے دانت بھینچے تھے، لب ایک دوسرے سے پیوست تھے اور سکڑی ہوئی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ بچوں نے ایسی سختی استاد کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ڈر گئے۔ غلیل سے گولی بجلی کی سرعت سے نکلی اور چند لمحوں بعد اُلو مجید کے قدموں میں بے جان پڑا تھا۔ مجید چونک پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مردہ الو کی آنکھیں منجمد تھیں اور اس کے پر ڈھیلے اور ساکت تھے۔

''نادانو...... اب کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ منحوس میرے سامنے مردہ پڑا ہے۔'' مجید نے جوش سے ہاتھ اٹھا کر درخت پر چڑھے آدمیوں کو مخاطب کیا۔

''کیا؟ مردہ؟'' درخت پر سے ایک چیخا۔

''چاچا مجید...... یہ تہاڈی کرامات ہیں۔ اللہ والے ہو۔ جو تم چاہتے ہو خدا اسے پورا کر دیتا ہے۔ ہم گناہگاروں کو ایسی باتیں سمجھ میں نہیں آندی۔'' دوسرا درخت پر سے بولا اور پھر دونوں وہاں سے کود پڑے۔

مجید کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ گدلے پروں نے الو کے سینے کے زخم کو چھپا لیا تھا۔ مجید کا چہرہ آسمان کی طرف تھا جو درخت کی شاخوں کے درمیان تابندہ تھا۔ مجید کی شکر گزار آنکھیں گرم آنسوؤں سے جلنے لگیں۔

''معبود...... تیرا احسان ہے۔ تو نے اس گناہگار کو بے سہارا نہیں چھوڑا ہے۔'' مجید سرگوشیوں میں بولا اور شدت جذبات سے بے قابو ہو کر سجدے میں گر پڑا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے اور وہ اپنی پیشانی کو کھردری زمین پر عاجزی سے رگڑ رہا تھا۔

''خدایا...... تیرا شکر...... تیرا احسان۔ اَسی گناہگار ہیں۔ پھر بھی میری تو نے سن لی۔ اس منحوس کے مرنے کی بس سوچ میں نے کی تھی...... اور تو نے فقیر کی عزت رکھ لی۔'' مجید سسکیوں کے درمیان بدبدا رہا تھا۔

خدا نے اسے صاحب کرم بنایا ہے، اس خوشی سے دیر تک مجید کے آنسو بہتے رہے اور سسکیاں نکلتی رہیں۔ اس کے ساتھی دم بخود اور سہمے ہوئے اس کے پاس کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد مجید سجدے سے اٹھا، آستین سے آنسو خشک کیے اور مردہ اُلو کو زمین پر سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

''چلو...... اس چڑیا کو دفن کر دیں۔''

جب مجید اور اس کے ساتھی برآمدے کے پاس سے گزرنے لگے تو وہ لڑکا جس کے غلیل

سے واجد نے اُلو کو مارا تھا، اس نے فخریہ کہا۔

''ہمارے امام صاحب نے اسے مارا ہے۔''

''کیا؟'' مجید تقریباً چیخا۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اسے ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

''ہاں...... سچ ہے...... امام صاحب نے میرے غلیل سے اسے مارا ہے۔'' لڑکے نے اپنی بات دہرائی۔ وہ اپنے اُستاد کے کارنامے پر نازاں تھا۔

مجید کو یقین نہیں آیا۔ اندر ہی اندر وہ ایک زخمی جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ گھٹے ہوئے سر والا چھوکرا جس کی ٹوپی سرک کر اس کے ابروؤں تک آگئی ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجید کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس نے واجد کو اس طرح گھورا جیسے اپنی نگاہوں کی برچھیوں سے اسے چھید دینا چاہتا ہو۔ مجید چاہتا تھا کہ واجد اس لونڈے کو جھٹلائے۔ لیکن واجد مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم چڑیا کی جان لینے کی وجہ سے تاسف نہیں بلکہ خوشی تھی اور داد کی طلب بھی۔ وہ مجید کی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے بھی مسرور تھا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' مجید نے حقارت سے واجد سے سوال کیا۔

''ہاں۔ تم لوگ اس اُلو سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے، میں نے اسے مار کر تمہاری مشکل آسان کر دی۔'' واجد نے متکبرانہ جواب دیا۔

''ذرا اس عجیب مخلوق کو دیکھو......'' مجید نے متنفرانہ واجد کی جانب اشارہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی جانب تائید حاصل کرنے کے لیے تکا اور اپنی بات اسی ذلیل کرنے والے لہجے میں جاری رکھی۔ ''واجد! تمہیں کیسے معلوم میرے دل میں کیا ہے؟ تم ہمارے جیسے آدمی ہو، تمہیں میری سوچ کا کیسے پتہ ہو سکتا ہے؟ ایسی باتیں تو خدا جانتا ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس مسجد کے صحن میں جو بھی کیڑا یا پرندہ ہے وہ متبرک ہے۔ انھیں مارنا منع ہے...... خدا نے انھیں حفاظت دی ہے جبھی وہ مسجد میں رہتے ہیں...... مجھے یقین ہے کہ کل تم ان کبوتروں کو بھی ضرور مار دوگے......'' مجید غصے سے بوکھلایا ہوا مسجد کے گنبدوں کی جانب اشارہ کر رہا تھا جہاں کبوتر پھدک رہے تھے۔

واجد نے نہ صرف اس سے امامت چھینی تھی بلکہ آج اسے ذلیل بھی کیا تھا۔ مجید کی مٹھیاں بھنچی تھیں۔ الفاظ پھنکارتے ہوئے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس کا منہ ایک

جانب کھنچا تھا اور آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ واجد کو دھکے دے کر گاؤں سے نکال دیتا۔

واجد نے محسوس کیا کہ جس دری پر وہ بیٹھا ہے اس میں میخیں گڑی ہیں۔ مجید کی مہمل منطق نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا اور جس حقارت سے اسے مخاطب کیا گیا اس کی وجہ وہ نہیں سمجھ سکا۔ وہ سکتے میں تھا جیسے کسی نے اس کی زبان پکڑ لی تھی اور بے رحمی سے اس کے ہونٹوں کو سی دیا تھا۔

''واجد...... سن...... تونے اسے مارا ہے۔ اب تو ہی اسے ٹھکانے لگا۔'' مجید نے مردہ پرندے کو زمین پر پھینکا اور پیر پٹختا ہوا مسجد سے نکل گیا۔ اس کے دونوں ساتھی اپنے مجید چاچا کی بکی پر مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے چل دیے۔

اپنی توہین پر واجد کا دل دکھ رہا تھا۔ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک خادم اسے اس طرح ڈانٹے گا۔ اپنی ذلت پر نادم وہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے شاگرد خاموشی سے سارا تماشہ دیکھتے رہے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ ان کا معلم بڈھے مجید کے غصے کا جواب غصے سے دے گا۔ لیکن وہ تو چپ چاپ منہ کھولے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کے شاگرد جاننا چاہتے تھے وہ کیوں چپ رہا اور اب وہ کیا سوچ رہا تھا؟ واجد کو وہ سب کے سب اجنبی لگے۔ ان سب کے چہروں میں اسے مجید نظر آیا۔ اس نے سمجھا ان کی آنکھوں میں ہنسی تھی اور تحقیر بھی۔ وہ فضیلت کی اس کرسی سے گر گیا تھا جہاں وہ سب اسے دیکھنے کے عادی تھے۔ واجد کو اپنے شاگردوں پر غصہ آیا۔

''تم سب چپ کیوں ہو؟ پڑھتے کیوں نہیں؟ ابے تو اس اُلو کو اٹھا کر پھینک آ......'' واجد نے ترش لہجے میں ایک موٹے سے لڑکے کو حکم دیا۔

وہ لڑکا اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ ایک مردہ چڑیا کو وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ پھولے ہوئے گالوں والے لڑکے کی آنکھوں میں خوف اور وحشت تھی۔ اس کا ننھا ہاتھ قرآن پر پڑا تھا۔ جیسے وہ اس سے تحفظ طلب کر رہا ہو۔ وہ بسورتا ہوا واجد کو گھورنے لگا۔

''پاجی...... تونے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟'' واجد غرایا اور ساتھ ہی اس نے زور سے ایک طمانچہ بچے کے گال پر مارا۔

بچے کے گال پر جلتا ہوا سرخ نشان اُبھر آیا۔ درد کی وجہ سے وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"شاہ جی...... مجھے نہیں مارو...... میں بچہ ہوں۔"

واجد رُکا نہیں۔ اس نے ایک اور تھپڑ اس لڑکے کو رسید کر دیا۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور زور زور سے منتیں کرنے لگا۔ دیگر لڑکے اور لڑکیوں کی آنکھیں ستم کے اس تماشے کو دیکھ کر نم ہو گئیں۔ چند کی سسکیاں نکل گئیں۔ واجد اٹھا اور مردہ چڑیا کو مسجد کے احاطے کے باہر پھینک آیا۔ واپس آکر اس نے سبق جاری رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ قرآن پڑھتے وقت بچوں سے بار بار غلطیاں ہوئیں۔ جب اس نے تنبیہ کی تو وہ گھر جانے کے لیے ضد کرنے لگے، آخر اس نے ہار مان لی اور سبھوں کو رخصت کر دیا۔

جب سب چلے گئے تو واجد کو محسوس ہوا جیسے وہ بے جان ہے۔ کل ملک ظہیر سے اس نے ڈانٹ سنی اور آج ایک نوکر کے ہاتھوں سبھوں کے سامنے وہ رسوا ہوا۔ اس کے علاوہ اس کے ایک شاگرد نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی انا بری طرح مجروح ہوئی تھی لیکن اپنی اذیت کا اظہار کرنے سے وہ مجبور تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ ملک ظہیر سے مجید کی شکایت کرے۔ لیکن عین ممکن تھا کہ اس کی بات نہیں مانی جاتی۔ وہ بھی ملک ظہیر کی نگاہ میں ایک خادم ہی تھا جس سے مسجد کی صفائی کی توقع کی جاتی تھی۔ "یا خدا...... کیا شرافت کی زندگی مجھے نہیں مل سکتی؟" واجد کی زیر لب شکایت کا کوئی جواب نہیں ملا۔ مسجد سنسان تھی۔ اس کا وسیع احاطہ اور قدیم درختوں کے نیچے چشمہ اور اس کے گرد سناٹا اور اس سے ٹپکتی زہریلی تنہائی۔ واجد دری پر بیٹھ گیا اور اپنے ویران چہرے کو اس نے دونوں بانہوں سے ڈھک لیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ واجد نہ جانے کب تک اسی طرح پڑا رہتا۔ اس مضمحل اور اداس مسافر کی طرح جسے نہ منزل کا پتہ ہوتا ہے اور نہ ہی راستے کا اور وہ تھک کر کہیں گر جاتا ہے۔

مسجد کے صحن میں بہت سارے قدموں کی آواز بلند ہوئی۔ واجد نے آنکھیں کھول دیں۔ گاؤں کی عورتیں چشمہ سے پانی بھرنے آگئی تھیں۔ ان کے سر پر گھڑے تھے اور وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ کچھ نے اپنے نصف چہرے کو دوپٹے سے ڈھک لیا تھا۔ ان عورتوں میں نوراں بھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس ہرن کی طرح جسے مرغزاروں میں پھرتے ہوئے کسی قسم کا خطرہ نہیں محسوس ہوتا۔ ایک ہاتھ سے وہ بیٹی کو چمٹائے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے سر پر رکھے گھڑے کو اس نے سنبھالا ہوا تھا۔ اس کا زرد دوپٹہ اور نیلی قمیص صاف تھی جیسے اسے پتہ تھا کہ واجد سے اس کی ملاقات ہونے والی ہے۔

نوراں کو دیکھ کر واجد کی اداسی غائب ہو گئی۔ اس کا جسم گرم ہو گیا۔ گزشتہ رات یاد آئی اور اس رات میں اس کے ملبوس کی سرسراہٹ اور اس کی باتیں...... جنھیں دوبارہ سننے کے لیے وہ رات بھر بیقرار رہا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس کی نگاہ بار بار نوراں پر پڑی جو دیگر عورتوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھی جو نہ جانے کیا تھی۔ لیکن جب وہ ہنستیں تو نوراں بھی ہنس پڑتی۔ جب وہ چشمہ سے پانی لینے کے لیے جھکی تو اس کے نمایاں کولھوں اور بازو کی گولائیوں کو دیکھ کر واجد کا منہ خشک ہو گیا۔ اسے یہ بھی گمان ہوا کہ اپنے بازوؤں کے بیچ سے نوراں نے ایک دو بار اس پر نگاہ بھی ڈالی ہے۔ واجد کو اپنا خون دہکتا محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ نوراں کو اپنے سینے سے بھینچ لے اور اپنے خون کی حدت کو اس کے جسم میں جذب کر دے۔

''خدایا...... خدایا...... رحم۔'' احساسِ گناہ سے وہ لرز اٹھا تھا۔ ''میں اپنی روح کو کیوں آلودہ کر رہا ہوں؟ میں لعنتی ہوں۔'' واجد سرگوشیوں میں بولتا ہوا اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ ایسی ساعتوں میں لعنتیں بے اثر ہوتی ہیں۔ نہ مچلتی خواہشوں پر ان کا بس چلتا ہے اور نہ ہی دل کی تیز دھڑکنوں پر۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں چشمہ پر گئیں جہاں نوراں تھی۔ وہ بے چین سا کوٹھری کے باہر آ گیا اور رحل پر رکھے قرآنوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

نوراں کو جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ بار بار اپنے گھڑے کو دھو رہی تھی۔ اس کے پاس اس کی بیٹی شاداں کھڑی تھی۔ بیٹی کے سر پر ماں کی طرح گھنگریالے بال تھے اور رنگ بھی اسی کی طرح صاف تھا۔ ایک لمبا کرتا اس کے گلے سے گھٹنوں تک پھیلا تھا۔ نوراں نے چلو بھر پانی بیٹی کے سر پر ڈال دیا۔ شاداں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ماں کے پیروں سے لپٹ گئی۔ ماں بیٹی کی محبت کے اظہار سے اسے بھی خوشی ہوئی۔ اس کے چہرے پر بھی ہنسی آ گئی۔ واجد کے مضبوط دانتوں کی چمک اور اس کے چہرے کی شگفتگی دیکھ کر نوراں خوشی سے سرشار ہو گئی۔ ایک متبرک انسان اس کی مسرت میں شریک تھا۔ اس سے بہتر احساس اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے پیر ہوا میں تھے۔ ساتھ کھڑی عورت سے نوراں نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ہم اپنے مردوں سے کہیں کہ وہ اب پانی بھرنے آیا کریں۔'' ساتھ ہی اس نے دزدیدہ نگاہوں سے وجیہ امام کو تکا، جو اس وقت خدا اور رسول کو بھلا کر اس کی موجودگی کے احساس میں گم تھا۔

عورتیں ہنس پڑیں اور ان کے چہروں پر سرخی آ گئی۔ واجد کی کشش کا ان سب کو احساس

تھا۔ اپنے گھڑوں میں پانی بھرنے کے بعد وہ رخصت ہونے لگیں۔ نوراں اس وقت بھی ان کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے اسے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ رُک رُک کر کبھی مسجد کے وسیع صحن کے گرد کھنچی دیوار کو تکتی اور کبھی ان پیلے اور سرخ پھولوں پر اس کی نگاہ جاتی جو حویلی کی طرف جانے والی پگڈنڈی کے دونوں جانب کھلے تھے۔ عورتوں نے سمجھا کہ شاید وہ انھیں توڑنا چاہتی ہے۔ ایسا کوئی نہیں کرتا تھا چونکہ ان سب پر حویلی کی اس مالکن کا خوف تھا جس نے خودکشی کرنے سے پہلے ان پھولوں کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ملک ظہیر کی حویلی کے زنان خانے کی کوٹھری میں جو خادمائیں سو رہی تھیں ان میں نوراں بھی تھی۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ بیتابانہ ادھر ادھر نگاہیں ڈال رہی تھیں۔ ظہر کی اذان کچھ عرصہ پہلے ختم ہوئی تھی۔ جس کے سحر نے نوراں کی نیند چھین لی تھی۔ اسے واجد یاد آ رہا تھا۔ اس کی کھنکتی ہوئی آواز جس میں اس نے نوراں سے گفتگو کی تھی اور جب اس نے کہا تھا کہ وہ بھی ایک انسان ہے جو مسجد میں رہ سکتی ہے تو واجد نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ ایک متبرک انسان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ مقدس ہوتا ہے۔ نوراں اٹھ بیٹھی۔ چند لمحوں تک سر جھکائے وہ کچھ سوچتی رہی۔ اردگرد سوئی ہوئی عورتوں پر اس نے نگاہ ڈالی اور سر اور چھاتی کو دوپٹے سے ڈھکا، اپنی سوئی ہوئی بیٹی کو گود میں اٹھایا اور حویلی سے نکل گئی۔ گلیوں سے ہوتا ہوا راستہ مسجد کو جاتا تھا۔ سخت گرمی تھی اور گلی میں آگ لپک رہی تھی۔ آسمان سے بھی جیسے پگھلتا ہوا سیسہ ٹپک رہا تھا۔ پھر بھی نوراں کے قدم مسجد کی جانب اٹھ رہے تھے۔ پاؤں تلے زمین گرم تھی اور اس کا کھردرا پن اُسے کڑھ رہا تھا۔ لیکن نوراں کو اس وقت کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ کوئی پوچھتا کہ کہاں جا رہی ہے تو وہ کہہ دیتی کہ مسجد میں شاید اس کی بالی گر گئی ہے اور اب اُسے ڈھونڈنے جا رہی ہے۔ نوراں نے اس وقت وہاں جانے کا جواز سوچ لیا تھا۔ لیکن بیمار گلی کی ویرانی اور سورج سے گرتے انگاروں کے بیچ کسے پڑی تھی جو اس وقت چلتا پھرتا نظر آتا۔

مسجد کے صحن کے گرد جو دیوار تھی اس میں داخلے کا چوبی دروازہ بند تھا۔ نوراں نے اس پر ہاتھ رکھا۔ اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی اور وہ لگی ہوتی بھی تو نوراں دروازے پر دستک دیتی۔ اس وقت اس کی جھجک، خوف اور احتیاط بھی کچھ مٹ چکا تھا۔ اس وقت اس کی زندگی اس کے اختیار میں تھی۔ اس کی خواہشیں اور آرزوئیں تسکین چاہتی تھیں۔

ہلکے سے دھکے سے مسجد کے احاطے کی دیوار میں بنا دروازہ کھل گیا۔ مسجد کے سارے

دروازے بند تھے۔ ان کے سامنے چبوترے پر کوئی نہیں تھا۔ چشمہ کے ساتھ پتھریلی زمین پر بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک خاموشی تھی ہر سو اور اس خاموشی میں اس کا تیز دھڑکتا دل تھا۔ وہ چشمے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور ادھر ادھر نگاہ ڈالنے لگی۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ اس نے قدموں کی آواز سنی۔ وہ جان گئی کہ واجد آرہا ہے۔ اس نے سر جھکالیا اور نگاہیں نیچی کرلیں۔

''تو؟ اس وقت کیوں آگئی؟'' مرد کی آواز میں وہی جھنک، نرمی اور اپنائیت تھی، جیسے وہ اس کے آنے کا راز جان گیا تھا۔

''عبادت کرنے۔'' نوراں سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''اس وقت؟''

''کیا عبادت کے لیے وقت ضروری ہے؟''

''ہاں ہے...... جس بیلا اذان ہوتی ہے، اس وقت نماز پڑھتے ہیں۔''

''جسے نہ آتی ہو، وہ کیا کرے؟'' نوراں نے بغیر نگاہیں اٹھائے پوچھا۔

''میں سکھادونگا تجھے کس طرح نماز پڑھی جاتی ہے۔ لیکن......؟''

جواب جاننے کے لیے نوراں نے پہلی بار واجد کو بھرپور نگاہوں سے تکا۔ جس کی انگلی شہادت اس کی ناک کے سرخ مسے پر تھی۔ جیسے وہ کوئی نگینہ تھا جسے چھوکر واجد اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ نوراں کے لب نیم وا تھے اور سیاہ آنکھوں میں جستجو تھی اور اطمینان بھی۔ اس پر کوئی افتاد آئی تو سامنے کھڑا مرشد اُسے بچالے گا۔ نوراں کو یقین تھا۔ واجد کی نگاہ نوراں کے چہرے سے اُتر کر اس کے بڑے پستانوں پر گئی، پھر زخمی ہوکر واپس اس کے چہرے پر آگئی۔ وہ اس کی آنکھوں کے ذریعہ اس کے دل کا حال جاننا چاہتا تھا۔ کیا وہ سچ مچ عبادت کرنے آئی تھی۔ اگر نہیں تو پھر وہ کیا چاہتی تھی؟ اور بغیر اپنے شوہر کے یہاں کیوں آگئی؟ لیکن نوراں کی سیاہ آنکھوں میں کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کس طرح سمجھاتی کہ وہ بھی پاکیزگی کے چند قطرے اپنی روح میں ٹپکتے محسوس کرنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ امام کچھ ایسی باتیں کہے جس سے اسے اطمینان ہو، وہ سکون ملے جس سے وہ بے چینی کم ہوجائے جو اس پر اکثر آجاتی ہے۔ جو کل رات اس پر آئی تھی اور بیقرار کرگئی تھی۔

گھنے درختوں کا سایہ دونوں پر تھا۔ چشمہ سے گرتے پانی کی نرم آواز آرہی تھی اور اس کے گرد گھانس کی جو ہریالی تھی وہاں سے نم مٹی کی خوشبو آرہی تھی۔

''تو یہاں کس طرح روز آسکتی ہے۔ تیرا خاوند کیسے اس کی اجازت دے گا؟''

''وہ نہیں ہے۔'' نوراں غصہ اور حقارت سے بولی۔

''کیا؟'' حیرت سے واجد کی ابروئیں تن گئیں اور اس کی نگاہ نوراں کی بیٹی پر گئی جو ماں کے شانے پر سر رکھے اطمینان سے سو رہی تھی۔

''اس کی پیدائش کے ایک سال کے بعد وہ راولپنڈی روزی کی تلاش میں گیا پھر اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ نہ اس نے کبھی چٹھی بھیجی اور نہ ہی پیسے۔ کبھی کبھی جینا بہت مشکل ہو جاتا ہے شاہ جی۔'' نوراں نے اداسی سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ آگیا اور وہ پیر کے انگوٹھے سے زمین کو کریدنے لگی۔ اس نے بیٹی کو کمر پر سے سرکا کر دوسری جانب کرلیا۔

''تمہارا خاوند شہر میں خوش ہوگا جبھی گاؤں واپس نہیں آنا چاہتا۔'' واجد نے نوراں کو چھیڑا۔

''میرا شوہر اچھا انسان ہوتا تو مجھے چھوڑ کر کیوں جاتا۔ میرا جی بھی چاہتا ہے کسی سے باتیں کرتی رہوں اور مجھے بھی کسی کا سہارا ملے۔'' نوراں اداسی سے واجد کو تکتے ہوئے بولی۔ اسے ایک ایسا انسان مل گیا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ پیر کے سامنے لوگ اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ اپنا دکھ روتے ہیں۔ اسی لیے تو اتنے سارے لوگ پیروں کے پاس جاتے ہیں۔ سامنے کھڑا انسان شاید پیر ہی ہے جبھی تو اس نے جن کو بھگا دیا اور اکیلا مسجد میں رہتا ہے۔ نوراں کو خیال آیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' واجد کی آواز میں وہی نرمی تھی جس کا احساس گزشتہ رات نوراں کو ہوا تھا۔

''نوراں۔ لیکن قسمت ہمیشہ سیاہ ہی رہی۔'' وہ اسی طرح اداسی سے بولی۔

''......اور بیٹی کو کس نام سے پکارتی ہو؟''

''شاداں......اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔'' نوراں اپنی بیٹی کے سر کو چومتے ہوئے بولی۔

واجد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اور کیا بولے۔ اس کی خواہش ہو رہی تھی کہ نوراں کے سر پر ہاتھ رکھے۔ اس کے گالوں کو چھوئے اور اسے اپنی بانہوں میں کس لے۔ اس کا منہ خشک ہوگیا تھا، جیسے اس میں ریت بھر دی گئی تھی۔ نوراں کو چلے جانا چاہئے تھا لیکن وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ شاید وہ اس کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بزرگ کہے گا کہ چلی جا۔ میرے آرام میں خلل نہ ڈال۔ یا بولے گا میری عبادت کا وقت ہے اور میں کسی کو دیکھنا پسند

نہیں کرتا۔ لیکن وہ تو چپ تھا۔ اس درخت کی طرح ساکت اور گھنا جو اپنے گھنے سائے میں آرام دیتا ہے۔ پاس کی جھاڑی میں کوئی چڑیا بول رہی تھی۔ چک، چک، چک۔ ایک عجیب سی آواز تھی اس کی...... کرخت اور رکتی ہوئی۔ جیسے وہ کچھ سمجھانا چاہتی تھی اور سننے والا سن نہیں رہا تھا۔ نوراں کو جن کا خیال آیا جس کی بابت مجید نے اسے ہشیار کیا تھا۔

''اس مسجد میں جن بھی رہتے تھے۔'' چڑیا کی پراسرار آواز سے نوراں کا ڈر جاگ اٹھا۔

''یہاں کوئی جن نہیں ہے، اگر وہ تھے تو مجھے دیکھ کر چلے گئے۔'' واجد فخریہ اپنے سر کو ہلاتا ہوا بولا۔

''لیکن حویلی میں تو بھوت ہیں۔ ایک عورت کو ناچتے اور کسی مرد کو زور سے ہنستے گاؤں والوں نے سنا ہے۔''

''نادان...... ایسی کوئی بات نہیں۔ جو اس دنیا سے گیا وہ پھر نہیں آتا۔''

''پہلے عورتیں وہاں پھول چننے جاتی تھیں۔ لیکن بہت دنوں سے وہ نہیں جاتیں۔''

''ان کی مرضی۔ وہاں سے بھی ایک راستہ گاؤں کے گھروں کو جاتا ہے۔ اسی سے آتی ہوں گی سب۔ دیکھ میں تیرے خاوند کے آنے کی دعا کروں گا۔'' واجد نے اچانک کہا۔

''سچ شاہ جی۔ سچ مچ دعا کرو گے اس کی واپسی کی؟'' نوراں نے خوشی سے بے اختیار ہوکر اپنا ہاتھ واجد کی کلائی پر رکھ دیا۔ جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور شرما کر اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔

نوراں کی ہتھیلی کی گرمی ضبط کا بند توڑنے لگی۔ توبہ، استغفار، احتیاط اور اپنے عہدے کا احترام واجد کے گرم خون کی گردش میں ڈوب گیا۔ سامنے کھڑی دراز قد عورت، اس کے کپکپاتے خشک ہونٹ، آنکھوں میں خوف اور اداسی...... اور اس وقت اس کا تنہا آنا، دل کی باتیں کہنا...... ان سب نے ایک آگ بھڑکا دی تھی۔ جس کے شعلوں کو وہ بجھانا چاہتا بھی تو وہ نہیں بجھ سکتے تھے۔ واجد نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں کے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو مسجد کے بند دروازوں سے قرآن کی وہ آیتیں آتی سنائی دیں جن کا وہ حافظ تھا۔ اسے ایسا لگا کہ مسجد کے اندر سے کوئی پکار رہا ہے...... رک جاؤ...... عورت کو جانے کے لیے کہو...... لیکن وہ ان سب سے بہت دور جاچکا تھا۔ گرم سانسوں کی آندھیوں میں بھی آوازیں، ساری ریاضتیں اور دعائیں گم ہوچکی تھیں۔

''اچھا، اب میں چلتی ہوں۔'' نوراں ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ جیسے اسے پتہ چل گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

سفید کرتے اور لنگی میں ملبوس سامنے کھڑا مرد جس کی خشک زلفیں اس کی گردن پر بکھری تھیں اور داڑھی الجھی ہوئی تھی اور جس کی آنکھیں بڑی ہوگئی تھیں اور اسے دیوانہ وار تک رہی تھیں...... ان سب نے اسے ڈرا دیا تھا۔

''تو اس حویلی کے راستے سے جا۔ وہاں تجھے درختوں کا سایہ ملے گا۔''

''لیکن وہاں تو......''

''لیکن کیا؟ میں چلوں گا تیرے ساتھ بدروحوں سے تجھے بچانے۔'' یہ کہتے ہوئے واجد نے اپنا ہاتھ نوراں کے شانے پر رکھ دیا۔

جذبات سے بجھی ہوئی واجد کی آواز میں حکم تھا اور اس کے ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔ وہ اسے حویلی کی جانب کھینچ رہا تھا۔ نوراں کے لیے وہ پیر و مرشد تھا۔ اللہ تک جس کی پہنچ تھی اور جو پاک انسان تھا۔ جس کی قربت سے اس کے گناہ دھل سکتے تھے اور وہ پاکیزگی میں ڈوب سکتی تھی۔ نوراں مزاحمت نہیں کر سکی۔ ویران حویلی میں دالان اور برآمدے کی چھتیں گری تھیں۔ وسیع آنگن میں گھاس بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی، درختوں کے تن پر چنبیلی کی لتائیں چڑھی تھیں، ہارسنگھار کے درختوں کے درمیان اور ادھر ادھر گلاب کے سرخ اور گلابی پھول کھلے تھے۔ کبھی یہاں خوشبو لہر در لہر بہتی ہوگی لیکن اس وقت دوپہر کی گرمی نے اسے جھلس دیا تھا۔ درخت کے سائے میں واجد نے نوراں کو دیوانہ وار لپٹا لیا۔ اس کے جسم میں لپکتی آگ کی اذیت سے اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ نوراں نے اپنی گود سے بیٹی کو پھسل جانے دیا اور بے جان سی اپنے محبوب سے ہم آغوش گھاس پر گری۔ اپنی بیخودی کے باوجود نوراں سمجھ گئی کہ واجد ناتجربہ کار ہے۔ مرد کی مردانگی کو عورت کی نسوانیت میں کہاں اور کس طرح جذب ہونا چاہئے اس سے وہ ناآشنا ہے۔ نوراں نے اپنے محبوب کے لیے سب کچھ آسان کر دیا۔ واجد کو اپنی بانہوں میں مچلتی عورت کی زندگی کے سرچشمہ کا احساس ہوا، جہاں سے آتشیں لمس وجدانی مسرت بن کر واجد کے جسم میں سما رہا تھا۔ جان لیوا برسوں کا تناؤ، ان گنت برسوں کی شدید محرومیاں اور کربناک تشنگی بے پناہ خوشی میں تحلیل ہوتی اسے محسوس ہوئی۔

آخرکار سرشاری ختم ہوئی۔ وہ کھیل ختم ہوا جس کا تصور واجد نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اسے

ہری گھانس کی نرمی اور خوشبو کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اس کی آغوش میں پر سکون عورت واجد کو بہت عزیز محسوس ہوئی۔ اس نے نوراں کے سر کے چکنے بالوں کو نرمی سے چھوا۔ اس کی انگلیاں نوراں کی پیشانی، گال، پلکوں اور ناک پر پھسلیں۔ اس لمس میں خوشی تھی، وہ اپنائیت تھی جس کی تلاش واجد کو ہمیشہ سے تھی۔ اس تکمیل کا احساس تھا جس کی جستجو اسے بے چین رکھتی تھی۔ نوراں نے واجد کی برہنگی پہلے ڈھکی پھر اپنی۔ واجد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ نوراں اسی طرح لیٹی رہی۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے اور پسرے ہوئے۔ مطمئن اور خوش نوراں کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ واجد کے چہرے پر جو طمانیت تھی، جس خوشی کا خاموش اظہار تھا، وہ نوراں کے لئے انوکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مرد کے چہرے کا رنگ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھی اس خوشی سے سرشار تھی جو اس کی روح میں مچلی اور اس کے محبوب میں آب رواں بن کر جذب ہو گئی۔ وہ اسی مرد کے انتظار میں رہی تھی۔ اپنا آپ اس نے جسے پہلی بار دیا وہ یہی انسان تھا...... ایک بھلا انسان...... وہ مقدس انسان جو اپنے خالق کی عبادت میں جذب رہتا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی سامنے پھولوں پر اڑتی سنہری تتلیوں کو تکنے لگی۔ پاس ہی شہد کی مکھیاں شہد سے بوجھل اور اس کے مزہ سے مست گنگنا رہی تھیں۔ اچانک نوراں کی نگاہ اپنی بیٹی شاداں پر پڑی جس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور جو ممیا رہی تھی۔ سہمی ہوئی شاداں نے اپنی ماں کو واجد کی آغوش سے نکالنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ نوراں اس کی چیخ پکار سے بے خبر رہی تھی اور واجد کے لیے وہ موجود نہیں تھی۔ شاداں اس کی خوشی میں حائل ہوتی تو وہ اسے دھکے دے کر الگ کر دیتا۔ نوراں نے اپنا سر واجد کی آغوش میں رکھ دیا اور آنچل سے شاداں کے آنسو خشک کرنے لگی۔ بیٹی تیزی سے سرک کر ماں کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ شاداں کے منہ سے نوراں نے اپنا پستان لگا دیا۔ شاداں کی زبان پر ماں کا دودھ نہیں آب حیات تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ نوراں بیٹی کے سر کو سہلاتے ہوئے سرگوشیوں میں بولی۔

"تجھے باپ مل گیا۔"

"ہاں نوراں۔ تو میری بیوی بن گئی۔"

"سچ کہتے ہو شاہ جی۔"

"بالکل سچ...... یہی تو ہوتی ہے شادی۔"

نوراں اٹھی اور واجد سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے محبوب کی آنکھوں میں والہانہ

تکا...... چند لمحوں کے لیے...... جیسے وہاں اس سچائی کو تلاش کر رہی ہو جو واجد کے الفاظ سے ابھی ظاہر ہوئی تھی۔

''کیا میں تمہاری بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہوں گی؟ لیکن......''

''لیکن کیا؟ میں تیرے خاوند کے آنے سے پہلے تجھے یہاں سے لے جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' واجد نوراں کی ہچکچاہٹ کو سمجھ گیا تھا۔

عذاب کے جس کنویں میں وہ گری ہوئی تھی وہاں سے وہ نکل جائے گی۔ شب و روز کی کڑی مشقت، جھڑکیاں، ملک کی حویلی میں ہر حکم کی تعمیل...... کیا ان سب سے اسے نجات مل جائے گی؟ نوراں کو خیال آیا۔

''دل نہیں مانتا کہ ایسا ہو جائے گا۔'' نوراں نے واجد کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''دل کو کہہ دے...... ایسا ہی ہوگا۔ گاؤں میں کہاں پر رہتی ہے؟''

''جوہڑ کے پاس...... مجید چاچا کے پڑوس میں میری کوٹھری ہے۔ تم نہیں آنا ادھر۔ میں ہی آجایا کروں گی۔ نہیں بلاؤ گے جب بھی آؤں گی۔''

واجد نے نوراں کی پیشانی چوم لی اور اسے لپٹا لیا۔ محبت کے کھیل کو دونوں نے کچھ اور ہی والہانہ پن سے دوبارہ کھیلا۔ دونوں سسکیاں لیتے ہوئے ایک دوسرے سے اس طرح لپٹے جیسے جدائی ان دونوں کی جان لے لے گی۔ شاداں کی چیخ پکار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ معصوم بچی کیا دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی اس کی دونوں کو پرواہ نہیں تھی۔

عصر کی نماز سے کچھ پہلے نوراں چلی گئی۔ واجد اپنی کوٹھری میں آکر چارپائی پر پڑ گیا۔ جو کچھ دیر پہلے ہوا تھا اس سے اس کا وجود ہلتا محسوس ہوا۔ اب جذبات سرد تھے۔ دیوانہ خواہشیں روح میں کہیں مقفل ہو چکی تھیں۔ جو کچھ ہوا وہ گناہ تھا...... عظیم گناہ۔ لیکن اب سوچنے سے کیا حاصل؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس گناہ کے باوجود نوراں اسے پیاری محسوس ہو رہی تھی۔ جس کی قربت کا خمار اب بھی باقی تھا۔ کاش وہ اب بھی اُس کے پاس ہوتی۔ جس سے وہ بات نہ بھی کرتا جب اس کی موجودگی سے اسے محسوس ہوتا کہ اب زندگی میں خلا نہیں ہے۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ چشمے میں نہانے چلا گیا۔ سنگین مسجد اور پتھریلی زمین۔ اس سے نکلتا شفاف پانی اور اس سے پرے درخت اور ان سب کے درمیان وہ خود۔ گناہ کا احساس، جسم کے تسکین کی مسرت، اور اپنی بیبا کی پر حیرت...... اور جسم پر بہتا ٹھنڈا پانی۔ واجد نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ مددگار ہے۔ رحم کرنے والا اور جو راستہ دکھاتا ہے۔ واجد سوچتا رہا اور دیر تک اپنے جسم کو پانی سے دھوتا رہا۔ عصر کی نماز کے لیے کوئی بھی نہیں آیا۔ اس نے تنہا نماز ادا کی اور دیر تک سجدے میں پڑا خدا سے معافی مانگتا رہا۔ ''خدایا...... جو گناہ میں نے کیا اس کے عذاب کو جھیلنے کی مجھے طاقت دے۔ خدایا اگر میں نے جرم کیا ہے تو اس کی خوشی مجھے کیوں ہے۔ ایک عجیب سی تسکین کا احساس کیوں مجھے ہو رہا ہے؟ خدایا کوئی سبیل نکال تاکہ جلد شرعاً نوراں میری بیوی بن جائے۔'' جائے نماز پر پیشانی رگڑ رگڑ کر واجد خدا سے کلام کرتا رہا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر بھی اسے ایک عجیب سی راحت ملی۔ کوئی تو تھا جس کے سامنے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکتا تھا۔ آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا اس کی بابت سوچنا بھی محال تھا۔ ''گر خوشی ملتی ہے تو اسے حاصل کر لینا چاہئے۔ خدا بخشنے والا ہے۔ جو قسمت میں ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔'' واجد نے خود کو خود ہی سمجھایا۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت نوراں آ گئی۔ پھر تیسرے اور چوتھے دن بھی۔ بولائے ہوئے وحشت زدہ دن میں جب ہر طرف سے دھوپ شعلے اگلتی محسوس ہوتی تو نوراں اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے مجبوراً چلی آتی۔ نوراں کی موجودگی میں...... اس کے حیا آلود تبسم میں...... سر جھکا کر دھیمی بات کرنے میں اور اس کے جسم کی جنبشوں میں واجد گناہ اور ثواب کی کشمکش کو بھول جاتا۔ دونوں ویران حویلی میں چلے جاتے اور اپنے بے لباس جسموں سے ایک دوسرے کو مسرت دیتے۔ بانہوں میں بھنچی عورت کے جسم میں اپنی مردانگی کے گھل جانے کے بعد واجد ہر بار نرالی سی راحت اور تسکین محسوس کرتا اور نوراں کو اپنی خوشی میں طہارت اور پاکیزگی کا احساس ہوتا۔ اس کے سینے سے جکڑا ہوا مرد مسجد کا امام تھا جس کی نیکی اور بزرگی اور مردانہ طاقت چٹان جیسا سہارا تھی۔ جو مختصر وقت وہ واجد کے ساتھ گزارتی، اس میں وہ واجد کے پیر دباتی اور کبھی اس کی ناک پر جو سرخ مسہ تھا، اسے سہلاتی اور کبھی دعائیں مانگنے کے لیے کہتی۔ واجد کی شیریں دعا سنتے وقت وہ اپنے ڈوپٹے سے سر کو اچھی طرح ڈھک لیتی اور بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتی جاتی۔ جیسے دعاؤں کے اثر سے وہ اسے ہر بلا سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی نوراں اپنی پکائی ہوئی کھیر لے آتی۔ ان چھوٹی چھوٹی خدمتوں میں بے پناہ خلوص اور چاہت تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت واجد اور نوراں حویلی میں گل مہر کے درخت کے نیچے گھاس پر مطمئن اور پرسکون لیٹے ہوئے تھے۔ گاؤں والوں کے خوف اور توہم کا حصار ان کے گرد تھا،

کسے ہمت تھی جو ادھر آ بھٹکتا۔ اب تو ظہر اور عصر کی نماز میں بھی لوگ لُو کے خوف سے نہیں آتے تھے۔ واجد اور نوراں اپنی محبت سے ایک دوسرے کو نواز چکے تھے۔ شاداں ان کے قریب ایک پرانی اور میلی سی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔

بغیر کسی ارادے کے نوراں کی نگاہیں ارد گرد پھسلیں۔ برآمدے کے ٹوٹے فرش پر جا بجا اُگی جھاڑیاں، دیواروں پر بارش کی زرد لکیریں، تاریک دالانوں میں گری شہتیروں پر مٹی کا ڈھیر، دالانوں کے ٹوٹے دروازے جہاں سے جیسے کسی کی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ آنگن کے وسط میں ایک شکستہ چبوترہ جس کا نصف حصہ اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ اس پر اس کی نگاہیں بار بار گئیں۔ حویلی کی ویرانی کا شدت سے نوراں کو احساس ہوا۔

''گاؤں کی بوڑھی عورتوں سے سنا ہے کہ جب حویلی آباد تھی تو چبوترے پر گرمی کی راتوں میں قالین بچھا دی جاتی تھی اور حویلی کی مالکن اس پر ناچتی تھی۔'' نوراں مسکراتے ہوئے چبوترے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ واجد کا سر نوراں کے سینے پر تھا۔ وہ اسی طرح لیٹا رہنا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کیے اور ڈھیلا ڈھالا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور چبوترے کو تکا، پھر اس کی نگاہیں اس تنگ راستے کی جانب گئیں جو حویلی سے باہر گاؤں کی جانب جاتا تھا۔ راستہ زرد جلی ہوئی گھاس سے بھرا تھا اور اس کے دونوں جانب سفید پھولوں سے بھری جھاڑیاں گتھی ہوئی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا دل چاہا کہ ان پھولوں کو توڑ کر لائے۔ لیکن دھوپ سے ان کی خوشبو اور تازگی مرجھائی ہوئی تھی۔ انھیں توڑ کر لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے خیال آیا۔ وہ اسی طرح پڑا رہا اور سست انگلیوں سے نوراں کی بکھری زلفوں سے خشک پتوں کو نکالنے لگا۔

''حویلی کی مالکن تیری طرح حسین ہوگی۔'' واجد اس طوائف کا تصور کر رہا تھا جس نے مسجد تعمیر کرائی تھی اور جو حویلی کی مالکن تھی۔

''سنا ہے شہر سے باجہ بجانے والے بلائے جاتے تھے اور کئی کئی دنوں تک ناچ گانا یہاں ہوتا تھا۔ پھر بھی کچھ ختم ہو گیا۔ میاں بیوی مر گئے۔ اُن کی جاگیر ملک نے خرید لی اور یہ حویلی ویران ہو گئی ہمیشہ کے لیے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں کی بلا گاؤں پر بھی چھا جائے گی۔''

''نادان...... تو ایسا کیوں سوچتی ہے؟'' واجد غور سے نوراں کو تک رہا تھا۔

''کچھ پہلے یہاں سکھوں اور ہندوؤں کے چار پانچ گھر تھے۔ ان کا ایک آدمی کھیت میں مار دیا گیا۔ پھر وہ سارے روتے اور فریاد کرتے چلے گئے۔ عورتیں کس زور سے چیخ چیخ کر رو رہی

تھیں میرا تو دل دہل گیا تھا۔ ایک سردارنی اپنے گھر کی چوکھٹ کو چوم چوم کر بول رہی تھی......

''ہمیں اجاڑ کر خوش نہیں رہو گے۔ نہ جانے اب کون اُجڑے گا؟'' نوراں کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

واجد کو اس المناک واقعہ میں دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے موضوع بدلنے اور نوراں کو چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

''تجھے ناچنا آتا ہے؟''

''نہیں...... کیا تمہیں آتا ہے ناچنا؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔ جب بزرگوں کے عرس میں ان کے مزاروں پر جاتا ہوں تو قوالیاں سن کر دوسروں کی طرح میں بھی خوب جھومتا ہوں۔ اس طرح۔'' یہ کہتا ہوا واجد اٹھ کھڑا ہوا اور شاداں کو اٹھا کر اس نے دو تین چکر دیئے۔ شاداں ہنس پڑی اور نوراں بھی مسکرانے لگی۔ اسے دونوں کی شادمانی بہت بھلی لگی۔

''میں لے جایا کروں گا تجھے عرس میں اور تو بھی میرے ساتھ ناچا کرے گی۔'' واجد نے ایک ہاتھ اٹھا کر نیم سنجیدگی سے نوراں سے کہا۔

نوراں کو جواب دینے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے اس راستے سے جو حویلی سے گاؤں کو جاتا تھا، اور جدھر واجد کی پیٹھ تھی، ادھر سے مجید لاٹھی بلند کیے ان کی جانب آ رہا تھا۔ قبل اس کے، کہ وہ واجد کو خبردار کرتی، مجید کی لاٹھی واجد پر برسی۔ وہ درد سے تلملا اُٹھا۔

''نہیں چاچا...... نہیں۔ اس پر یہ ظلم مت کرو......'' نوراں نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔

لیکن مجید نے ان سنی کر دی۔ غصے اور حقارت سے اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ اس کے دانت بھنچے تھے اور کسے ہوئے ہونٹوں کے نیچے اس کی داڑھی کے بال کھڑے تھے۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

''حرام زادے...... کتے کا بچہ! مجھے شروع سے پتہ تھا کہ تو دھوکے باز ہے۔ تیری امامت ڈھونگ ہے...... اور لے۔'' مجید چیخ رہا تھا۔

واجد نے سر کو اپنے بازوؤں سے ڈھک لیا تھا۔ وہ جوان تھا اس لیے لاٹھی کے تابڑ توڑ وار سہہ گیا۔ لاٹھی کی چوٹ سے اس کا کرتا پھٹ گیا اور جسم پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمودار ہونے لگے۔

''معاف کر دو...... بخش دو...... رحم کرو...... خدا کے لیے۔'' کراہتی ہوئی اور سسکیوں میں

ڈوبی واجد کی آواز نکل رہی تھی اور نوراں ہاتھ پھیلائے مجید سے التجائیں کر رہی تھی۔

''نہ بابا...... نہ...... بس کرو۔''

مجید کی نگاہ اچانک نوراں پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ نوراں مارے ڈر کے زمین پر دوہری ہوگئی۔

''بدچلن...... بے شرم...... رنڈی...... تو مسجد کے پاس اپنی گندگی پھیلانے آگئی...... لے تو بھی لے!'' مجید جھاگ اڑاتے منہ سے پھنکارا اور ساتھ ہی نوراں کے کولھے پر لاٹھی ماری۔ بے بس نوراں کی دلدوز چیخ آسمان کو چیر گئی۔

نوراں کو پٹتے واجد نہیں دیکھ سکا۔ بجلی کی طرح تڑپ کر وہ اٹھا اور اس زور سے مجید کے ہاتھوں سے لاٹھی چھینی کہ وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

''بیشک مجھے جان سے مار ڈالو۔ لیکن خبردار جو نوراں کو چھوا بھی...... اب اسے مارنے کا بدلہ لو۔'' یہ کہتے ہوئے واجد نے مجید پر ایک لاٹھی جمائی۔

مجید چیخ چیخ کر مدد کے لیے گاؤں والوں کو پکارنے لگا۔ جو مزارعے مسجد کے پاس رہتے تھے، انھوں نے جب چیخ پکار سنی تو وہ بھاگتے ہوئے حویلی کے اندر پہنچے۔ مزارعوں نے دیکھا کہ مجید زمین پر چت پڑا مدد کے لیے پکار رہا ہے اور اس کے پاس امام واجد لاٹھی اٹھائے اسے دھمکیاں دے رہا ہے۔ امام کے کپڑوں پر خون کے دھبے اور قریب ہی کمر پکڑ کر نوراں کا بین کرنا، مزارعوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''اس جانور سے مجھے بچاؤ...... یہ میری جان لے لے گا...... ہماری بیٹی کی یہ امام عزت لوٹ رہا تھا...... میں نے اسے پکڑ لیا تو اب میری جان لینے پر تلا ہے۔''

مجید کی اطلاع سے مزارعے تھرا گئے۔ وہ ظالم سہی اور یہ بھی درست کہ اس نے ان لوگوں سے فاقے کی حالت میں بیگاری لی تھی اور لگان وصول کیے تھے، پھر بھی وہ ان کے گاؤں کا ایک فرد تھا۔ ان کا اپنا آدمی تھا۔ نوراں بھی ان کے گاؤں ہی کی ایک عورت تھی۔ لیکن امام غیر تھا۔ اس نے ان کی غیرت پر حملہ کیا تھا۔ مزارعے گالیاں بکتے ہوئے واجد پر ٹوٹ پڑے۔ جو لاٹھی واجد کے ہاتھ میں تھی، اس سے واجد نے اپنے بچاؤ کی کوششیں کیں۔ لیکن حملہ آور تجربہ کار تھے۔ جلد ہی اس کے ہاتھوں سے لاٹھی چھین لی اور واجد پر تھپڑ، گھونسے اور لاتیں پڑنے لگیں۔

''لے چلو اس کمینے کو اپنے ملک صاحب کے پاس......'' مجید گرجا۔

واجد ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس کی مزاحمت بیکار تھی۔ مزارعے اسے دھکے دیتے ہوئے لے چلے۔ سبھوں کے پیچھے مجید لنگڑاتا ہوا چل دیا۔ ہنگامے میں نوراں کو بھی بھول گئے۔ وہ جان گئی تھی کہ وہاں سے نکل جانے میں ہی سلامتی ہے اور اب اس کی التجائیں واجد کو نہیں بچا سکتیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چیخیں مارتی شاداں کو اٹھایا اور اس راستے پر بھاگ پڑی جو کھنڈر سے گاؤں کو جاتا تھا۔ خاردار جھاڑیاں اس کی شلوار سے الجھیں۔ درختوں کی خشک شاخیں اس کے سر اور چہرے سے ٹکرائیں۔ لیکن نوراں رُکی نہیں وہ بھاگتی گئی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر اور کہاں جا رہی ہے۔ مسجد سے، حویلی کے کھنڈر سے اور اس گاؤں سے کہیں دور جانا ہے۔ اپنی ذلت اور ملک کے غیض و غضب سے بچنے کا اس وقت یہی طریقہ ہے۔ بس وہ اتنا جانتی تھی۔

شہر سے آئے ہوئے حکیم صاحب کے ساتھ دالان میں ملک ظہیر شطرنج کھیل رہا تھا۔ دونوں اُن بڑے بڑے پلنگ پر تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے جن پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ پلنگ کے درمیان تپائی پر شطرنج کی بساط بچھی تھی۔ چھت سے لٹکے کپڑے کے پنکھے کو ایک جوان نوکر کھینچ رہا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ بدلتا اور جسم کا بار کبھی ایک پاؤں پر ڈالتا اور کبھی دوسرے پر۔ لیکن ملک ظہیر کی حکمرانی میں اس کے آرام کی خواہش بے معنی تھی۔ ظہیر حکم دیتا تو اس خادم کو گھنٹوں اسی طرح پنکھا کھینچنا پڑتا۔ ٹھنڈی ہوا اور کچھ پہلے کھائے ہوئے پراٹھے، کباب اور فیرنی کا مزہ ملک ظہیر اور حکیم صاحب کو لطف دے رہے تھے۔ کچھ دنوں سے ملک کو خیال آنے لگا تھا کہ اس کی مردانگی کمزور ہو رہی ہے۔ شہر سے حکیم صاحب کے آنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ انھوں نے ظہیر کی نبض ٹٹولی، اس کے قارورے کا معائنہ کیا۔ پھر بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ آئندہ رات کے کھانے میں بیل کے خصیے کو گھی، بادام، کشمش اور گرم مسالے میں پکوا کر کھانا جنسی طاقت کے لیے مناسب ہے۔ یہ نسخہ جو ہمیشہ کارگر ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی نصیحت سے ملک ظہیر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس وقت شطرنج کی چالیں اسے خوب سوجھ رہی تھیں۔

اچانک حویلی کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی اور کسی مرد کی آہ و بکا کے ساتھ شور بلند ہوا۔ ظہیر چونک پڑا۔ اس طرح کے ہنگاموں کا وہ عادی نہیں تھا۔ برہنہ پاؤں وہ دالان سے تیزی سے نکلا، حکیم صاحب بھی اس کے پیچھے باہر آ گئے۔ واجد مزارعوں کے نرغے میں سسکیاں لے رہا تھا۔ سوجے ہوئے منہ پر مار کی وجہ سے نیلے نشان تھے۔ سر کے بال اور داڑھی میں دھول اور کپڑوں پر خون کے دھبے۔ ظہیر کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ظہیر نے غصہ سے پوچھا۔

''یہ چھوکرا جو امام بنا ہوا ہے اور بہت دیندار اور عالم مانا جاتا ہے...... یہ نوراں کے ساتھ زنا کر رہا تھا۔'' مجید نے واجد کی جانب تھوکتے ہوئے اپنے مالک کو بتایا۔

ظہیر سکتے میں آ گیا۔ اس کے ماتھے پر کربناک شکنیں ابھر آئیں اور آنکھوں میں نفرت آ گئی۔ ایک شخص جو پانچ وقت کی نمازیں پڑھاتا ہو۔ تہجد گزار ہو۔ جس کی قرائت اس قدر شیریں ہو کہ فرشتوں کی تلاوت کا گمان ہو۔ کیا ایسا انسان زنا کر سکتا ہے؟ ایسے انسان سے تو نم خوابی کی بھی امید نہیں کی جاتی۔ واجد کی لنگی پر زرد داغ اس بری خبر کی تصدیق کر رہے تھے جو مجید نے دی تھی۔ ظہیر نے محسوس کیا کہ واجد نے اسے بدترین فریب دیا ہے۔ ظہیر کو یہ بھی احساس ہوا کہ اس نے ایک غلط شخص کو اتنے اہم رتبے کے لیے چن کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی غلط ثابت ہو سکتا ہے انتہائی صدمے کی بات تھی۔ لمحے بھر کے لیے اس کی نگاہ مجید سے ملی۔ خادم کی نگاہوں میں چمک تھی اور اس کا چہرہ مطمئن تھا۔ اسے پتہ تھا کہ واجد کڑیل جوان ہے۔ دلکش نوراں کو دیکھ کر اس کی جوانی پگھل سکتی ہے۔ اس نے اتفاقاً نوراں کو دوپہر میں مسجد کی جانب جاتے دیکھ لیا تھا۔ اسے شبہ ہوا جو درست ثابت ہوا۔ مجید نے لاشعوری طور پر نوراں کو شب برأت کی رات واجد کے لیے کھانا بھیج کر جو کھیل کھیلا تھا اس میں اس کی جیت ہوئی تھی۔ پیرانہ سالی کے تجربے کے سامنے دیوانی جوانی شکست کھا گئی، ساتھ ہی مجید نے ثابت کر دیا کہ اس کا مالک اب بھی نابالغ ہے اور اس کے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں۔

ظہیر کو غصے میں اپنی مٹھیاں کستی محسوس ہوئیں۔ جب اسے علم ہوا کی واجد نے زنا نوراں کے ساتھ کیا ہے تو اسے شدید ذلت کا بھی احساس ہوا۔ ظہیر کے علم میں تھا کہ اس کا بیٹا نوراں کے ساتھ ہم بستری کر چکا ہے۔ نوراں کی رگوں میں اس کے بیٹے کا بھی خون تھا یعنی ظہیر کا اپنا۔ اب اس میں واجد کا بھی خون مل چکا تھا۔ نوراں وہ خادمہ تھی جو اپنے حسن کی وجہ سے اسے عزیز تھی۔ وہ اس کے پیر دابتی تھی۔ اس کے ہاتھ کا لمس ظہیر کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن آج غاصب اور ناممنون واجد نے اس کی آبرو اور ملکیت کو ہتھیا لیا تھا۔

''لاؤ اسے یہاں۔'' ظہیر نے حکم دیا۔

اس کے سامنے واجد کو دھکیلتے ہوئے مزارعے لے آئے۔

''احسان فراموش...... حرامزادے!'' ظہیر گرجا اور ساتھ ہی اس کا مکہ واجد کے منہ پر پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ حکیم صاحب کو واجد پر ترس آ گیا۔ وہ لجاجت سے بولے۔

''ملک صاحب جانے دیجئے۔ کھانے کے بعد غصہ کرنے سے خون کا فشار بڑھ جاتا ہے۔''

ظہیر کو لمحہ بھر کے لیے واجد نے تکا۔ اس کی اشکبار آنکھوں میں رحم کی طلب تھی اور اپنے گناہ کی شرمساری۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ میلی آستین سے منہ پر بہتا خون خشک کر رہا تھا۔ حکیم صاحب کی التجا کام آئی۔ ظہیر کا ہاتھ رُک گیا۔ اس نے اپنے مزارعوں کو حکم دیا۔

''اس بے شرم کے چہرے پر کالک مل کر اسے گدھے پر بٹھا کر گاؤں میں پھراؤ۔ پھر اسے گاؤں کے باہر نکال دو۔''

ملک کے حکم کی جلد تعمیل کی گئی۔ واجد کے منہ پر کالک ملی گئی پھر اسے گدھے پر بٹھا کر گاؤں میں گشت کرایا گیا۔ آگے آگے ایک مراثی ڈھول پیٹتا تھا اور پیچھے واجد کے علاوہ مزارعے تھے، جو اس پر گندے مذاق کی بوچھاڑ کرتے جاتے تھے۔ جس کسی نے اس تماشے کو دیکھا اسے پہلے حیرت ہوئی لیکن تفصیل جاننے کے بعد ان کے منہ سے بھی واجد کے لیے گالیاں نکلیں۔ ذلت کی شدت سے اس کا سر جھکا تھا۔ وہ کسی طرح اپنی جان دے دینا چاہتا تھا۔ اسے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

''ذلیل واجد...... تجھے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔'' آنکھیں میچے وہ بڑبڑا رہا تھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

حویلی کے کھنڈر سے بھاگ کر نوراں نے قبرستان میں اپنی ماں کی قبر کے پاس پناہ لی۔ جو ہولناک واقعہ کچھ دیر پہلے ہوا تھا اسے دیکھ کر شاداں اتنا روئی تھی کہ اب ہلکان ہو کر ماں کی گود میں سو رہی تھی۔ نوراں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے محبوب کے لیے رو رہی تھی جسے محض محبت کی خاطر اس بری طرح مار کھانی پڑی تھی۔ واجد سے اس کے جسمانی رشتے اس کی وفا کی نشانیاں تھیں اور اس کے عشق کی مجبوریاں بھی۔ واجد کے ساتھ مستقبل میں زندگی گذارنے کا اس نے عہد کیا تھا۔ لیکن وہ دنیا جسے نوراں نے اتنے پیار اور اہتمام سے تعمیر کیا تھا وہ اب ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔

''ماں...... ماں...... کیوں جنا تو نے مجھے؟ ربا کو کہہ کہ مجھے تیرے پاس بھیج دے۔ اب

کچھ بھی نہیں رہا میرے پاس ماں......"

ویران قبرستان میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی انسانی آواز نہیں تھی سوائے نوراں کی غمزدہ صدا کے...... اس کا سر ماں کی دھنسی ہوئی قبر سے ٹکا تھا اور وہ گیندے کے ان مرجھائے پھولوں کو مسل رہی تھی جسے وہ شب برأت سے ایک دن پہلے قبر پر ڈال گئی تھی۔ اس پر جامن کے درخت کا سایہ تھا اور وہ سایہ آس پاس کی کچی پکی پرسکوت قبروں پر بھی پھیلا تھا اور درخت کی شاخوں میں سیاہ کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

۳

مغربی افق کے قریب سورج پہنچ چکا تھا۔ ادھر جو شیشم کے درخت اور زرد مٹی کے مکانات تھے وہ اب بھی بے جان نظر آئے۔ لوگ گرمی کی شدت سے ابھی تک اپنے گھروں میں دبکے تھے۔ کوئی مصیبت زدہ اپنے اونٹ پر بیٹھا دور سڑک پر کہیں جا رہا تھا۔ دور سے بھینس کے ڈکرانے کی آواز آئی، وہ چپ ہو گئی تو ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

نوراں کو نہ آسماں نے نگلا اور نہ ہی ماں کی قبر شق ہوئی اور ماں کی آغوش نے اسے کھینچ لیا۔ لگاتار رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور کولھے پر اس جگہ ٹیس اٹھ رہی تھی جہاں مجید کی لاٹھی پڑی تھی۔ اس ظالم کے لیے اس کے منہ سے گالیاں نکل گئیں۔ نوراں کراہتی ہوئی قبرستان سے باہر نکل آئی اور اس پگڈنڈی پر آ گئی جو گنے کے کھیتوں کے درمیان گاؤں کی جانب جاتی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ رُک گئی۔ سامنے اسے اپنا گاؤں نظر آیا اور وہ جوہڑ جس پر بوہڑ کا درخت جھکا تھا۔ اسے اپنی کوٹھری نظر آئی جس کی چھت پر کھیرے کی سبز بیل چڑھی تھی۔ ملک ظہیر کی حویلی کا بڑا چوبی دروازہ بند تھا۔ نوراں جانتی تھی کہ وہ دروازہ اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ پیاس سے نوراں کے ہونٹ اور منہ خشک تھے۔ شاداں بھی جاگ گئی تھی اور بھوک سے کوں کاں کر رہی تھی۔ نوراں اپنی کوٹھری میں جانے کیلئے تڑپ رہی تھی۔ لیکن آج اور اس وقت اجالے میں وہ گاؤں والوں کا سامنا کس طرح کرتی۔ بدچلن...... کنجری اور نہ جانے کن کن برے لفظوں سے لوگ اسے پکارتے۔ اس کا بھی قوی امکان تھا کہ ملک ظہیر اسے کڑی سزا دیتا۔ نوراں کے قدم سست پڑ گئے۔ بیٹی کی بھوک مٹانے کے لئے اس نے اپنا پستان اس کے منہ سے لگا دیا۔ خشک پستان کو شاداں زور زور سے چوسنے لگی۔ نوراں کو اپنے سینے میں ٹیس

اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ بیٹی سے دودھ چھڑا رہی تھی۔

نوراں رُک کر سوچنے لگی۔ وہ کیوں نہ ملک کے باغ سے ہو کر خشک نالے میں اتر جائے۔ وہاں سے اس کے گھر تک فاصلہ ضرور زیادہ تھا لیکن اُدھر لوگ نہیں ہوتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کسی کی نگاہ اس پر نہیں پڑتی۔ یہ سوچ کر وہ پگڈنڈی پر مڑی۔ کچھ فاصلے پر اس نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بندروں کے ساتھ شیشم کے درخت سے ٹیک لگائے گنا چوس رہا تھا۔ چندلا سر جس پر سیاہ اور سفید بال کی جھالر تھی۔ چہرے پر بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی۔ اسے پہچاننے میں نوراں کو دشواری نہیں ہوئی۔ وہ رینو تھا۔ جو اپنے بندروں کے ساتھ ڈگڈگی بجاتا ہوا اکثر گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ دو میل کے فاصلے پر مشرق میں جو چند جھونپڑیاں تھیں اسی میں اس کی رہائش تھی۔

نوراں کو دیکھ کر رینو ڈر کر چونک پڑا۔ جس گنے کو وہ مزے لے لے کر چوس رہا تھا اسے گھبرا کر اس نے پھینک دیا۔ اس کا منہ اور اس کی داڑھی رس سے تر تھی۔ ارد گرد دور تک تمام کھیت ملک ظہیر کے تھے۔ اس کی اجازت کے بغیر ان کھیتوں سے کچھ لینا چوری سمجھی جاتی تھی جس کی سخت سزائیں ملتی تھیں۔

''گاؤں گاؤں خالی پیٹ پھرنے سے مارے بھوک اور پیاس کے برا حال تھا۔ اس نرک کی آگ کو بجھائے بنا کیسے زندہ رہوں؟'' رینو نے گڑگڑاتے ہوئے اپنے پھٹے ہوئے کرتے کو اٹھا کر اپنے دھنسے ہوئے پیٹ کی جانب اشارہ کیا۔

سیاہ فام مریل انسان جس کا چپٹا چہرہ اور سینہ پسینے سے تر تھے اور جس کی پگڑی زمین پر پڑی تھی وہ جرم کا اعتراف کر رہا تھا۔ رحم کی بھیک اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ کوئی اور دن ہوتا تو نوراں نفرت سے منہ پھیر لیتی۔ گاؤں والے رینو اور ان لوگوں کو جن کے ساتھ وہ رہتا تھا انہیں نیچ ذات کا سمجھتے تھے۔ نوراں بھی ان کی ہم خیال تھی۔ لیکن اس وقت اسے رینو سے یگانگت محسوس ہوئی۔ دونوں اس راستے پر تھے جس کے دونوں جانب کھائی تھی اور دور دور تک منزل کا نشان نہیں تھا۔

جو عورت ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی تھی اس کے چہرے پر نرمی دیکھ کر رینو کی ہمت بندھی۔ عورت کے لب خشک اور ویران چہرے پر مٹی لگی تھی۔ نوراں کی نگاہ اس گنے پر پڑی جسے رینو نے ڈر کر پھینک دیا تھا۔

"لو کھاؤ گی اسے؟" رینو نے گنّے کو اٹھایا اور اس کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے پوچھا۔

قبل اس کے نوراں کچھ کہتی رینو نے گنّے کا ایک ٹکڑا نوراں کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اس کے پاس تھکی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے تیز دانتوں سے چھلکے کو چھیلا اور گودے کو چبانے لگی۔ گنّے کا شیریں عرق آبِ حیات تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ آج کے المیے کو بھول گئی۔ زندگی کی دھیمی سی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ بے جان آنکھوں میں جان آ گئی۔ عرق کے ہر گھونٹ کے ساتھ اس کی پیاس بڑھ رہی تھی اور بھوک بھی۔ نوراں کے بیٹھ جانے سے بندر ڈر کر رینو کے کندھے پر اچھل کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں کی بے چینی اور ان کے جسم پر لال کپڑوں کو دیکھ کر شاداں ہنس پڑی۔

"تو بڑی تھکی ہوئی ہے۔ کھیتوں میں کام کر رہی تھی، گنّے کی کٹائی شروع ہو گئی ہے کیا؟" رینو نے پوچھا۔ اس کے لئے جاننا آسان تھا کہ نوراں پریشان اور بھوک کی ماری تھی۔

نوراں نے اثبات میں سر ہلایا اور گنّے کے ایک ٹکڑے کو جسے اس نے اچھی طرح چبایا نہیں تھا اسے شاداں کے منہ میں ڈال دیا۔ ننھی سی جان جس کے مشکل سے دو تین دانت بھی اچھی طرح نہیں نکلے تھے، اس نے گودے کو نگلنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ شاداں کے منہ سے بھیانک خوخوں نکلی۔ قبل اس کے کہ اس کا دم گھٹتا رینو نے شاداں کے منہ میں انگلی ڈال کر گودے کو نکال دیا۔ شاداں تکلیف سے رو پڑی۔

"بیوقوف عورت...... تو اپنی بیٹی کی جان لے لیتی۔" رینو نے نوراں کو ڈانٹا۔

"نہ...... نہ...... نہ رو بٹیا۔ دیکھ...... بندروں کا ناچ دیکھ۔" شاداں کو رینو نے چمکارا اور پاس پڑے ننھے تھیلے سے ڈگڈگی نکال کر بجانے لگا۔

ڈھلتے دن کی خاموشی میں ڈگڈگی کی ڈگ ڈگ نغمہ بن کر رل گئی۔ رینو کے دونوں بندر اس کے کندھے سے اتر کر اور اپنے سروں پر ہاتھوں کو رکھ کر ناچنے لگے۔ شاداں نے رونا بند کر دیا اور بندروں کی ناچ اور اچھل کود سے خوش ہو کر ہنس پڑی۔

"بادشاہو۔ مہارانی۔ اب رک جاؤ۔ سارا دن تم ناچ ناچ کر لوگوں کا دل خوش کرتے رہے ہو۔ اب آرام کرو۔" رینو نے پیار سے بندروں کو کہا اور باری باری ان کا سر سہلایا۔

اس نے شاداں کو خوش کر دیا تھا۔ بس یہی اس کی خواہش تھی۔ رینو کی بیوی مر چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بچے بچیاں۔ ان کے کھیل کود۔ ان کی خوشی اور ان کی معصومیت اسے

ہمیشہ بھلی لگتی تھی۔

"لے میری گڑیا۔ کھا اسے۔" رینو نے اپنی گٹھری سے ایک بتاشہ نکال کر شاداں کی جانب بڑھایا۔

بندر بتاشے کی جانب لپکے۔ لیکن رینو نے انھیں ڈانٹ دیا۔ سہم کر دونوں بندر دبک گئے۔ شاداں کبھی بتاشے کو چوستی اور کبھی کترتی۔

کوئی اور دن ہوتا تو نوراں اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بتاشہ چھین کر پھینک دیتی۔ کسی ایسی چیز کا کھانا جسے رینو نے ہاتھ لگایا ہو اس کے تصور میں بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ رینو اور اس کی برادری کے افراد مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے اور عجیب قسم کی مورتیوں کو سامنے رکھ کر پوجا کرتے تھے۔ لیکن آج نیچ ذات کا رینو اپنے طبقے اور اعتقادات سے ماورا ہو کر فرشتۂ رحمت بن گیا تھا۔ اسے کھانے کے لئے گنا دینا اور شاداں کے لئے دردمندی۔ ایسی صفتیں رینو جیسے انسان میں بھی ہو سکتی ہیں، نوراں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جلد ہی اس کے پاس کھردری زمین پر چوسے ہوئے گنے کی سٹھیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ لیکن اس کی تشنگی نہیں مٹی۔ زبان اب بھی خشک محسوس ہوئی۔ اس کی حسرت بھری نگاہ گنے کے کھت پر ٹکی رہی۔ ملک ظہیر کا خوف نہیں ہوتا تو وہ ایک ڈلی توڑ لاتی۔ لیکن نوراں کی ہمت نہیں ہوئی۔ جہاندیدہ رینو نے سمجھ لیا کہ پاس بیٹھی عورت کیوں اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کر رہی ہے اور اس کی اداس آنکھیں کیوں کھیت کو تک رہی ہیں جہاں گنے کی سبز و سرخ ڈلیاں رس سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ کھیت میں گیا اور ایک گنا توڑ کر نوراں کے لئے لے آیا۔ وہ اپنی شدید بھوک اور پیاس کے باوجود جھجکی۔

"فکر مت کر۔ میں نے کھیت سے گنا چرایا ہے۔ لوگ مجھے پکڑیں گے۔ سزا مجھے ہی ملے گی۔ کوئی بات نہیں، میں دو پل جیون گزار چکا ہوں۔ بڈھا مر بھی جاے تو دنیا میں بھونچال نہیں آ جائے گا۔"

نوراں نے شکر گذار نگاہوں سے رینو کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں طمانیت تھی اور چہرے پر سکون۔ بھلا کام جو اس نے کیا تھا۔ مطمئن تو ہونا تھا اسے۔ نوراں نے پھر گنا چوسنا شروع کیا۔ جب جان میں جان آئی تو آنکھوں کے سامنے واجد بھی آ گیا۔ اس کا درد بھری آواز میں نوراں کو مدد کے لئے پکارنا۔ مارنے والوں سے گڑگڑاتے ہوئے رحم کی التجا کرنا۔ اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے۔ سب کچھ نوراں کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

''وہ اب مر چکا ہوگا......'' غمگین لہجے میں نوراں زیرلب بولی۔ وہ دور اس کچی سڑک کو گھور رہی تھی جہاں دھول اُڑ رہی تھی۔

''میں نے اس سڑک پر امام واجد کو بھاگتے دیکھا۔ اس کے سوجے چہرے اور کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ عجیب؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا ایسا حال اس کا کیوں ہوا؟'' رینو حیرت سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا وہ زندہ ہے؟'' نوراں نے بے اختیار پوچھا۔ وہ بے صبری سے رینو کو تک رہی تھی۔ گر وہ زندہ ہے تو وہ اس کے پاس آسکتا ہے۔

''ہاں...... ہاں...... وہ زندہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ زخمی تھا پھر بھی ریلوے اسٹیشن کی طرف پاگل بیل کی طرح بھاگ رہا تھا۔ لیکن......؟'' رینو نے سوالیہ نگاہوں سے نوراں کی جانب دیکھا۔

''ربا...... ربا...... میری جان لے لے۔ اسے زندہ رکھ......'' نوراں کی زبان، اس کی روح، اس کے دل کی ہر دھڑکن بول پڑی۔ اس کی بند آنکھیں اور ان کی پلکوں میں اٹکے آنسوؤں سے رینو سمجھ گیا کہ ملک ظہیر کی باندی جو بھوکی پیاسی گاؤں سے باہر چھپی پھر رہی ہے اور مسجد کا زخمی امام، دونوں ہی ایک کہانی کے دو کردار ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ضرور وہی رشتہ ہے جس کی وجہ سے سنگین سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں۔ لیکن میری بیٹی اگر ایسا کرتی تو کیا میں بھی اسے سزا دیتا؟ نوراں کے اداس حسن کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ وہ شاید ایسا نہیں کرتا۔ رینو کو اس پر ترس آیا۔ کاش اسے سارے واقعے کا علم ہوتا تو وہ امام واجد کو روک لیتا اور کہتا۔ ''آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں چھپنے کی جگہ بتاتا ہوں۔ اندھیرا ہوگا تو میں لے چلوں گا تمہیں تمہاری محبوبہ کے پاس۔'' لیکن یہ سب کچھ سوچنے سے کیا حاصل؟ جو پل بیت گیا وہ واپس نہیں آسکتا۔ اس پل کا دکھ اس عورت کے دل میں کانٹے چھوڑ گیا ہے۔ جن کی چبھن ہمیشہ رہے گی اس عورت کے دل میں۔

دیر تک رینو اور نوراں چپ رہے۔ کبھی کبھی وہ ایک دھیمی آہ کے ساتھ لمبی سانس لیتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ دیر تک ہوا گنے کے کھیتوں میں سرسراتی رہی۔ جس درخت کے سائے میں دونوں بیٹھے تھے وہ اور گہرا ہو گیا۔

''چل میرے ساتھ۔ جب اندھیرا ہو جائے گا تو گاؤں چلی جانا۔''

رینو کے شفیق لہجے اور انسانیت سے نوراں کو سہارا ملا۔ وہ گاؤں کے کسی فرد سے آنکھیں نہیں ملا سکتی تھی۔ کسی وقت بھی کوئی گاؤں والا ادھر آ سکتا تھا۔ دونوں بندر اچک کر اپنے مالک کے کندھے پر بیٹھ گئے تھے۔ لیکن نوراں ہلی نہیں۔ ڈھیلی بانہوں میں شاداں کو پکڑے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

''چل پتر...... سانجھ ہوئی اب گھر چلیں۔'' زمین پر سے اپنی پگڑی اور تھیلے کو اٹھاتے ہوئے رینو اپنے بندروں سے بولا اور اچٹتی ہوئی نگاہ نوراں پر ڈالی۔ وہ زمین کو تک رہی تھی اور اس کے ابرو سکڑے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ جب رینو دو قدم آگے بڑھا تو نوراں پکاری۔

''سنو......''

رینو رُک گیا۔ لیکن نوراں سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ایک اجنبی سے کس طرح کہتی کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے اور وہ اب کسی سے آنکھ ملانے کے لائق نہیں رہی۔ اس نے ہمت کی اور سر جھکائے آہستہ سے بولی۔

''میں گاؤں نہیں جا سکتی...... اس وقت...... اس وقت مشکل ہے......''

جوان عورت جس کے سر کے بال تھکے ہوئے چہرے پر بکھرے تھے اور گالوں پر گنّے کے رس کا داغ تھا اور جس کی بانہوں میں اس کی بیٹی تھی، وہ عورت رینو کو ننھی سی بچی لگی۔ ننھی اور معصوم۔ رینو کی کوئی بیٹی ہوتی اور اس سے سنگین غلطی ہوتی تو وہ بھی اسی طرح سر جھکائے مدد مانگتی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟''

''یہ ننھی جان نہ ہوتی تو کچھ نہ کہتی کنویں میں کود کر جان دے دیتی......''

''بیٹی...... میری بات سن...... چل میرے ساتھ۔ اندھیرا ہو جائے پھر گاؤں جانا۔'' رینو مشفقانہ بولا۔

ادھیڑ عمر مرد کے لہجے کی نرمی اور جس خیر خواہی کا اظہار کچھ دیر پہلے اس نے اس کے اور شاداں کے لئے کیا تھا، ان کی وجہ سے نوراں کو احساس ہوا کہ وہ اس شخص پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ اب اور کیا ہو سکتا ہے میرے ساتھ۔ گاؤں میں بھی اس پر تھو تھو کریں گے۔ ملک اور اس کی بیوی کا غصہ نہ جانے پر مجھ پر کون سا عتاب توڑے۔ رات کسی طرح گزر جائے تو شاید نجات کا راستہ نکل آئے گا۔ نوراں اٹھ کھڑی ہوئی اور رینو کے پیچھے پیچھے چل دی۔

دونوں اس راستے پر ہو لئے جو گاؤں سے دور جاتا تھا۔ دونوں دیر تک ایک خشک نالے میں چلتے رہے۔ راستہ ٹیڑھا میڑھا تھا۔ رینو اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بے خوف وخطر چل رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ انھیں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر نوراں کو دیکھ لیتا۔ جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ اس کے پیچھے آرہی ہے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا جب دونوں اس بنجر زمین پر پہنچے جہاں چند مٹی کے گھر تھے جن کے سامنے تلسی کے پودے کے گرد مٹی کا چبوترہ بنا تھا۔ پاس ہی بوہڑ کے درخت کے تنے پر کچھ عجیب سے سفید نشان تھے جن کے قریب ہی لکڑی کی مورتیاں تھیں۔ چبوترے ہی پر جھکی کمر والا ایک ضعیف مرد دو بوڑھی عورتوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نوراں کو دیکھ کر وہ لوگ چونکے نہیں۔ بس نگاہ بھر کر اسے دیکھا اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اجنبی جوان عورتوں کو کبھی کبھی یہاں پناہ ملتی تھی۔ بعد میں ان کے ساتھ کیا ہوتا تھا اس پر یہ لوگ نہیں سوچتے تھے۔ پاس ہی ننھے ننھے بچے اور بچیاں کھیل رہی تھیں اور ڈربے میں مرغیاں اپنے چوزوں کے ساتھ چک چک کر رہی تھیں۔

''یہاں تیرا بال بھی بانکا نہیں ہوگا...... گمنیا۔ جا اس بچی واسطے دودھ لے آ۔'' رینو نے نوراں کو یقین دلایا اور ساتھ ہی چبوترے پر بیٹھی ایک عورت کو حکم دیا۔

نوراں تھکان کی ماری اور بیجان سی سبھوں سے الگ سکڑ کر بیٹھ گئی۔ میری ذلت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا اور ان کے ہاتھ کا دیا دودھ میری بیٹی پیئے گی، میری قسمت ہی بری ہے جبھی میں اور نیچ ہوگئی ہوں۔ لیکن زندہ تو مجھے رہنا ہے۔ سارے خیالات اس کے تھکے ہوئے ذہن میں گردش کر گئے۔ جب عورت مٹی کے پیالے میں دودھ لے کر آئی تو اس کے ہاتھ سے پیالہ لے کر شاداں کو نوراں دودھ پلانے لگی۔

کچھ دیر بعد چند جوان مرد اور عورت آگئے۔ جن کے پھٹے کپڑوں اور جسم پر سرخ گرد تھی۔ وہ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور دور کوئی مکان کہیں بن رہا تھا وہاں وہ اینٹیں توڑنے اور انھیں ڈھونے کا کام انجام دے رہے تھے۔ شام کی تاریکی میں ان کی مشکوک نگاہیں نوراں کو نظر نہیں آئیں۔ رینو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ اس خشک روٹی کو دہی میں ڈبو کر کھا رہا تھا جسے ایک عورت نے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔ نوراں کے لئے بھی یہی کچھ وہ عورت لانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اب نہ بھوک تھی اور نہ پیاس۔ ایک خوفناک اندھیرا اس کے گرد دور دور تک پھیلا تھا۔ جس میں کبھی کبھی امید کی کرن

چمک جاتی۔ اگر رینو کا مشفقانہ رویہ نہیں ہوتا تو وہ کرن بھی نہیں ہوتی۔

گرمی کی طویل شام گزر گئی۔ اندھیرا آیا اور ساتھ ہی اس ننھے گاؤں کے گھروں کی اندھی آنکھیں چولھوں کی روشنی سے روشن ہوگئیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور گاؤں کے کتے بھی بھونکنے لگے۔ نوراں کسی سے کچھ بولی نہیں۔ وہ اپنے گاؤں کوٹ فتح خان جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رینو کا دل چاہا کہ اس کے ساتھ جائے۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔ رات کے وقت نہ صرف ملک ظہیر کے گاؤں بلکہ اطراف کے دیگر گاؤں بھی وہ ممنوعہ علاقے تھے جہاں وہ بھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ نیچ ذات کے لوگ رات میں خوفناک جرائم کرتے تھے۔ صدیوں سے انھیں مجرم سمجھا گیا تھا۔ مسلمانوں نے فساد میں ان پر رحم کھایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انھیں مار بھگایا تو مردہ جانوروں کو اُٹھا کر لے جانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

''بیٹی...... مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔''

''اللہ مہربان ہو تم پر۔'' نوراں بس اتنا کہہ سکی۔ اس کا دل تو چاہا کہ اسے ساتھ آنے کے لیے کہے۔ لیکن صدیوں سے کھڑی بیگانگی اور حقارت کی دیوار اتنی آسانی سے نہیں گر سکتی تھی۔ اس سے بھی نیچ لوگ اس دنیا میں بستے ہیں۔ یہ سبق نسل در نسل اس تک بھی پہنچا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو برے لفظوں سے رینو کو وہ مخاطب کرتی۔ جو ذلتیں نوراں نے سہی تھیں انھیں کسی اور پر نکالنے سے اس کا دل خوش ہو جاتا۔ لیکن آج نہیں۔ رینو کی انسانیت سے بہت سی گرہیں نوراں کے دل میں کھل گئی تھیں۔ خاموش نفرت کی دیوار میں دراریں پڑ گئی تھیں۔ گرمی کی جھلستی شام میں رینو کی ہمدردیاں خنک بارش کی چھینٹیں تھیں اور ابر رحمت کا سایہ۔ پھر بھی اس کی جھجک نہیں مٹ سکی تھی۔

نوراں گاؤں والوں کی نگاہوں سے خود کو بچاتی آم کے باغ میں پہنچی۔ یہاں سے چھپ چھپا کر اپنی کوٹھری میں پہنچنا اس کے لئے آسان تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں میں جھینگر تیز آواز میں سیٹیاں بجا رہے تھے اور ساکت ہوا میں اُپلے کے جلنے اور پکے آموں کی بو بسی تھی۔ جب وہ اپنی کوٹھری کے پاس پہنچی تو اس کا دل ڈوب گیا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور اس کی چارپائی مع اس کے سارے اثاثے کے کوٹھری کے باہر ڈال دی گئی تھی۔ اس کی بکری پلنگ کے پائے سے بندھی تھی۔ نوراں سمجھ گئی کہ اسے گاؤں سے نکال مل گیا ہے۔ اوپر مٹیالے تاروں سے بھرا آسمان تھا۔ حویلی کے دروازے بند تھے۔ پاس شیشم کا درخت کسی بدروح کی طرح باہیں

پھیلائے تھا۔ قدرت کی اس وسعت میں فنا کی گونج تھی جو کسی بھی وقت بے آسرا نوراں اور شاداں کو دبوچ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے مالک۔ اسی دنیا میں جہنم ہے۔ تجھے صرف ہم جیسوں کا گناہ نظر آتا ہے۔'' نوراں خدا سے فریاد کرتی ہوئی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اب تو آنسو بھی نہیں بچے تھے جو اس کے غم کی آگ کو بجھاتے۔ سوچ کے ہر دروازے مقفل ہونے لگے۔ ہر حس اس کے جسم سے مٹنے لگی۔ بس اس کے دل کی دھڑکنیں تھیں۔ تیز اور پر شور جو اس کی زندگی کی ضامن تھیں اور اس کے وجود کی اطلاع۔ جب اسے ذرا ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے اور منہ میں دانے کے بغیر انسان گھڑی دو گھڑی ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ بے گھر ہو کر اس کا زندہ رہنا محال تھا۔ یہی وہ کوٹھری تھی جہاں اسے سکون ملتا تھا۔ یہیں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی، جوان ہوئی اور بیاہی گئی۔ یہیں اس کے ماں باپ کا ٹھکانہ تھا۔ لیکن وہ کوٹھری ملک ظہیر کی جائداد تھی۔ جہاں سے دوسرے مزارعوں کی طرح نوراں کو کسی وقت بھی نکالا مل سکتا تھا اور آج وہ المیہ ہو گیا۔ نوراں کو سزا مل گئی اس کے گناہ کی۔ خدا نے ایک انسان کو دوسرے انسان پر ظلم توڑنے کے لئے چنا تھا۔

''تیری ماں زندہ نہیں بچے گی۔ وہ مر جائیگی شاداں۔ اسے سہارا دے بیٹی......'' نوراں نے کانپتے ہونٹوں سے التجا کی۔ اس نے اپنے گال کو شاداں کے گرم لبوں سے لگا دیا۔ بیٹی کی بانہیں ماں کی گردن کے گرد مضبوط ہو گئیں۔ اس نے نوراں کو چوم لیا۔

''ماں...... ماں......'' محبت سے سرشار شاداں بولی۔

بیٹی کی آواز میں نوراں کو تحفظ کی طلب محسوس ہوئی۔ جیسے وہ کہہ رہی تھی مجھے اس آفت سے بچا جو تیرا مقدر بن گئی ہے۔ نوراں کو اپنے وجود میں کوئی شے تنتی محسوس ہوئی۔ توانائی کا ایک شعلہ اس کے دل سے لپکا اور اسے گرم کر گیا۔ نوراں نے شاداں کی آنکھوں کو تکا جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ملبوس سے اٹھتی آشنا بو کا نوراں کو احساس ہوا۔

''میں نہیں مروں گی۔ شاداں تیری خاطر تیری ماں زندہ رہے گی۔'' نوراں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی ہمت اور حوصلے کی بازگشت تھے۔ اس نے پوری طاقت سے شاداں کو لپٹا لیا۔ اس کے جسم کی گرمی طاقت بن کر نوراں کی رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ اس امانت کی امین تھی جس کی حفاظت کی امید کسی اور سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ چارپائی پر پڑے پھٹے

پرانے لحاف اور کپڑوں کو ایک جانب ہٹا کر لیٹ گئی۔ اس کی نگاہیں آسمان میں تاروں کے طلسمی جال میں الجھیں۔ اس نے رات کی اس دھند کو بار بار دیکھا جو چاروں طرف تھی۔ جس میں حویلی ایک دھبہ تھی۔ پتھر کی بنی مسجد، اس کے گنبد اور مینار پر سکوت اور خاموش تھے۔ اردگرد اس وقت کوئی دشمن نہیں تو دوست بھی نہیں تھا۔ پاس ہی شیشم کا درخت، جس کی شاخوں میں وہ جھولا ڈال کر جھولتی تھی۔ اپنے بچپن میں اور نوجوانی میں بھی، وہ بھی نا آشنا سا تھا۔

مسجد سے عشا کی اذان بلند ہوئی۔ آواز مجید ہی کی تھی۔ جس بیدردی سے اس نے واجد کو مارا تھا وہ نوراں کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ''ربا...... اس پر اپنا عذاب توڑ۔ اس حویلی پر اپنی بجلی گرا۔ ملک ظہیر کو مٹا دے، جس کی ننگی ٹانگوں کو مجھے مالش کرنا پڑتا تھا۔ امام میرا خاوند تھا۔ اس پر رحم کر۔'' نوراں نے بار بار دعائیں مانگیں۔ سوتے جاگتے اس نے رات گزار دی۔ ایک ایک کر کے تھکے ہوئے تاروں نے آنکھیں موند لیں۔ دور افق میں زرد صبح کا زرد اجالا آ گیا۔ مجید کے کھنکارنے کی آواز نوراں نے سنی۔

''تو اب یہاں نہیں رہ سکتی، ملک کا حکم ہے۔'' مجید جذبات سے عاری الفاظ میں بولا۔

نوراں اس کی پڑوسن تھی۔ اس کے ماں باپ اس کے پڑوس میں ساری زندگی گزار چکے تھے۔ نوراں کی طرح اسے اپنا سمجھتے تھے۔ مجید کے لئے ایسے رشتے بے معنی تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار گناہ کئے تھے، جنھیں وہ بھول چکا تھا چونکہ خدا نے اسے معاف کر دیا تھا۔ برسوں کی ریاضتیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ وہ خدا کا ہو چکا تھا۔ انسان اور اس کی زندگی، اس کی محبت اور نفرت، اس کی لالچ اور حسد، اس کی تمنا اور آرزو، خوشی اور غم، اس کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ خدا والوں کو ان پر سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عشق خدا میں جلنے والے کو اتنی فرصت کہاں جو وہ کسی دوسرے انسان کی کمزوری کو اپنی کمزوری سمجھ کر سوچیں۔

نوداں نے مجید کو جواب نہیں دیا۔ جو سامان اٹھا سکتی تھی اسے سر پر رکھ کر رینو کے پاس چل دی۔ کل کا واقعہ سارے گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ راستے میں جو بھی ملا اس نے نوراں کو گالیاں دیں۔ لیکن اس نے ان سنی کر دی۔ کوٹ فتح خان سے جو راستہ رینو کے پنڈ کی جانب آتا تھا اس پر نوراں کو سامان کے ساتھ آتے دیکھ کر رینو اس کی بے بسی سمجھ گیا۔ وہ اپنی کوٹھری کے سامنے بندروں کو پانی میں بھگوئے چنے کھلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میلی تھیں اور منہ میں دبے داتون سے لعاب نکل کر زمین پر گر رہا تھا۔ جب نوراں قریب آ گئی تو کچی نیند میں

ڈوبی شاداں پر اس کی نظر پڑی۔ رینو مشفقانہ مسکرا دیا۔

"میں یہاں کچھ دنوں کے لئے رہ سکتی ہوں؟" نوراں نے التجا کی۔ وہ پُر امید نگاہوں سے رینو کو تک رہی تھی۔ اس نے ذرا دیر کے لئے سوچا۔ پھر منہ سے داتون نکال کر بولا۔

"ہاں...... رہ جا یہاں۔ میری ایک ٹوٹی کوٹھری میں ڈھور ڈنگر بندھتے تھے۔ میں اس کی مرمت کر کے صاف کر دوں گا۔" اشراف کی عورت کو امان دینے سے اس کی توقیر بڑھ جائیگی اور اس کی بیٹی سے بھی چہل پہل رہے گی۔ رینو کو خیال آ رہا تھا۔

نوراں نے دو پھیرے لگائے۔ جو کچھ بھی اس کا مختصر سامان تھا اسے لے کر اپنی بکری کے ساتھ آ گئی۔ اس نے رینو کو بتایا کہ مسجد کے امام نے اس سے شادی کر لی تھی۔ لیکن گاؤں والوں نے کہا کہ یہ بہت بڑا گناہ اس نے کیا ہے، چونکہ اس کا پہلا شوہر ابھی زندہ ہے۔ اسی وجہ سے ملک کے حکم پر گاؤں والوں نے امام کو مار بھگایا اور ملک نے اسے بھی گاؤں سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ نوراں کی بات کو اس نے سچ سمجھا ہے یا نہیں اسے پتہ نہیں چلا۔ وہ ڈر ڈر کر زندگی گزارنے لگی۔ ہر روز وہ اس امید پر جیتی کہ شاید امام واجد اسے تلاش کرتا ہوا یہاں آ جائے۔

۴

کوٹ فتح خان کے چند سید بزرگ اگر واجد کو نہیں بچاتے تو اس کو پیٹنے والے اس کی جان لے چکے ہوتے۔ جب انھوں نے ہاتھ روک لیا تو واجد کو دھکے دیتے ہوئے گاؤں کے باہر اسے چھوڑ کر گالیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔ واجد کو یقین نہیں آیا کہ اسے نجات مل چکی ہے۔ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جو بچی کچی طاقت اس کے جسم میں تھی اس کے سہارے وہ بھاگنے لگا۔ نہ اسے دھوپ کی شدت کا احساس تھا اور نہ ہی سڑک کی سختی کا۔ دور ناریاں نام کے قصباتی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اسے کسی طرح پہنچنا تھا۔ کسی بھی طرح وہ کوٹ فتح خان اور اس کے گرد و نواح سے دور نکل جائے۔ کہیں ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ ہو، اور جہاں کوٹ فتح خان کے کسی باسی کا گزر نہ ہو۔ یہی اس کی خواہشیں تھیں۔ اس کی سانس تیز چل رہی تھی اور بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ سڑک کے کنارے برگد کے درخت کی چھاؤں میں لمحے بھر کے لئے بیٹھ گیا۔ ذرا اسے ہوش آیا تو اس نے پسینہ سے تر اپنے چہرے کو کرتے کے دامن سے صاف کیا۔ کپڑے پر سیاہی اور خون کے دھبوں کو دیکھ کر اس کی روح ذلت کی آگ سے ایک بار پھر شدت سے سلگ اٹھی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اس کی زبان خشک تھی اور سانسوں کی رفتار تیز۔ وہ منہ کھول کر کسی زخمی ہرن کی طرح سانس لے رہا تھا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی نگاہ اس سڑک پر گئی جس پر وہ مسلسل بھاگتا رہا تھا۔ کوٹ فتح خان سے وہ دور آ چکا تھا۔ گاؤں کا نام و نشان بھی اسے نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ مٹیالا افق جہاں سڑک درختوں کے درمیان گم ہوتی نظر آ رہی تھی وہاں پر اسے کچھ لوگ نظر آئے۔ وہ اسی کی جانب آ رہے تھے۔ واجد کو گمان ہوا کہ وہ اسے مزید سزا دینے آ رہے ہیں۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اب دوڑنا محال تھا۔ پیروں سے منوں وزن بندھے تھے۔ کسی طرح وہ خود کو گھسیٹتا ہوا چلتا رہا۔ خدایا...... میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ مجھے معاف کر دے۔ ان ظالموں سے بچا۔ اس کے منہ سے تھرتھراتے ہوئے الفاظ نکلے۔

کسی طرح واجد ناریاں پہنچ گیا۔ گرمی کی تپش سے جھلسا ہوا اور ویران سے نام کا ایک شہر۔ سامنے مشن اسکول بند تھا اور اس کے سامنے کھیل کے میدان میں ایک کتا بھاگ رہا تھا۔ کپڑوں کی ننھی دکانوں میں ان کے مالک واجد کو اونگھتے نظر آئے اور ایک گھنے درخت کے سائے میں تین ٹانگے خالی کھڑے تھے، اور ان کی اگلی نشست پر کوچوان باہر کی طرف پیر لٹکائے سو رہے تھے۔ کچھ دکانیں جلی ہوئی تھیں، اور وہ دھوئیں کی سیاہی سے سیاہ تھیں۔ ایک منہدم مسجد پر واجد کی نگاہ گئی اور اس سے کچھ فاصلے پر جو شکستہ مندر تھا، اس کے سامنے ٹوٹی ہوئی مورتیاں پڑی تھیں اور ذرا دور جو گوردوارہ تھا اس کے دروازے کو لوگ اکھاڑ کر لے گئے تھے اور گوردوارے کی دیوار پر چونے سے چاند ستارہ بنا دیا گیا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ کسی سے پوچھتا کہ یہاں کب بلوہ ہوا تھا؟ کتنے لوگ مارے گئے...... اور اگر اس سے فساد کی بابت پوچھا جاتا تو وہ بتاتا کہ کوٹ فتح خان میں فساد کے دوران مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن اس وقت اس طرح سوچنا ممکن نہیں تھا۔ اسے کہیں جانا تھا۔ کسی بھی جگہ...... دور بہت دور...... وہاں زندگی کس طرح گزرے گی؟ اس کا تصور بھی محال تھا۔ جو دیوانگی اس پر چھائی ہوئی تھی اور جو اسے مسلسل حکم دے رہی تھی۔ جاؤ...... جاؤ۔ اس سے فرار ممکن نہیں تھا۔ لیکن دل میں کہیں، کسی تاریک گوشے میں ایک مبہم سا خیال ضرور تھا۔ فاصلہ اور دوری شاید اس کرب کو کم کر دے جو اسے بیقرار کر رہی تھی۔

ایک دو راہگیر رُک کر اس کے خون آلودہ کپڑوں اور اس کے سوجے ہوئے منہ کو دیکھنے لگے۔ قبل اس کے کہ وہ واجد سے کچھ پوچھتے وہ ان کے پاس سے تیز تیز گزر گیا اور سڑک جدھر جاتی تھی وہ اس پر چلتا گیا۔ اس کی زبان خشک تھی اور پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ یہ بھی اس کی سزا تھی اور اسے واجد کو برداشت کرنا تھا۔ سڑک اسے ریلوے کراسنگ پر لے آئی۔ دونوں جانب گیٹ بند تھے۔ ایک مال گاڑی سرخ سگنل کے سبز ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹانگے، لاریاں، ٹھیلے اور راہگیر گیٹ کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک خیال بجلی بن کر اس کے ذہن میں کوندا۔ گیٹ سے آہنی تار کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ واجد تیزی سے ان کے درمیان

سے گزرا اور مال گاڑی کے ایک خالی ڈبے پر چڑھ گیا۔ گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اسے للکارا، گالیاں دیں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ لیکن واجد کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ جیب میں پیسے تو تھے نہیں جو وہ کہیں کا ٹکٹ خرید کر مسافروں کی ٹرین میں سفر کرتا۔ اس لئے جو اس نے کیا وہی درست تھا۔ اگر پکڑا گیا اور سزا ملی تو وہ بھی درست ہوگی۔ اس طرح وہ محفوظ ہو جائے گا۔ چند دنوں کے لئے ہی سہی۔

ریل کا ڈبہ دھوپ کی گرمی سے دہک رہا تھا۔ فرش پر لکڑی کے نم برادے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں برف ڈھوئی گئی تھی اس لئے برادے خنک تھے۔ واجد ان پر پڑ گیا۔ ان کی خنکی سے اسے ذرا آرام محسوس ہوا۔ اس نے ہاتھ پیر پھیلا دیئے۔ اپنے زخمی گالوں کو اس نے برادے پر ملا۔ انجن چیخا اور ٹرین کے پہیئے کڑکڑائے۔ مال گاڑی جھولتی اور ہچکولے کھاتی چل پڑی اور جلد تیز بھاگنے لگی۔ کھلے دروازے سے آتی گرم ہوا واجد کے چہرے کو جھلسنے لگی۔ واجد کو اپنے وجود کا احساس ہوا۔ اپنی زندگی کا خیال آیا۔ اس زندگی کے وہ لمحات یاد آئے جن میں اس کی آرزوئیں اور تمنائیں خاک ہو گئی تھیں اور اس کی لغزشوں نے اس کی پاکیزگی اور طہارت کو روند ڈالا تھا۔ وہ انا ختم ہو چکی تھی جو عبادت کے بعد توانا ہو جاتی تھی۔ اس کی روح غلیظ ہو گئی تھی، اس نے اپنے خالق کو رسوا کر دیا تھا۔ واجد رو پڑا۔ اذیت اور بے وقعتی کا کرب ہچکیاں بن کر اس کے حلق سے پھوٹ پڑا۔ زندگی اب بار تھی اور جینا حرام۔

ٹرین دریائے جہلم کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ واجد اٹھ کر ڈبے کے کھلے دروازے کے پاس آ گیا۔ نیچے دریا کا سبز پانی پرسکون تھا۔ دریا کی وسعت اور اس کی گہرائی جیسے واجد کی منتظر تھیں۔ صدیوں سے بہنے والا قدیم دریا نہ جانے کتنے انسانوں کو اپنی تاریک آغوش میں کسی نہ کسی بہانے گم کر چکا تھا۔ واجد کود جا۔ کود جا۔ جلد۔ اس نے خود کو کہتے سنا۔ لیکن میں شاید دریا میں نہ گروں۔ پل کے سیاہ ریلنگ سے ٹکرا کر صرف زخمی ہو جاؤں۔ پھر کیا ہوگا؟ زندگی اور بھی عذاب ہو جائے گی۔ گر یہ زندگی مشکل ہے تو مرنے کی کوشش اور بھی مشکل۔ واجد کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ ٹرین پل پر سے گزر گئی۔ دریا دور ہو گیا۔ ریلوے لائن کے ساتھ بھاگتی پگڈنڈی۔ کھیتوں میں لہراتی لچکتی گندم، اس کی لہراتی مور چھلیں۔ دور درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے مرد و عورت۔ سبھی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

کچھ دیر بعد ٹرین جہلم اسٹیشن کے یارڈ میں جا کر رک گئی۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہندوستان سے

آنے والے مہاجروں سے بھرا تھا۔ مرد، عورت، جوان، بوڑھے اور بچے حیران اور پریشان اور اپنے المیے کو سمجھنے سے قاصر بے رونق نگاہوں سے ادھر ادھر تک رہے تھے۔ ان کے گرد ان کے بستر، بکسے اور برتن بکھرے تھے۔ ان کے درمیان بازوؤں پر سبز پٹیاں باندھے اور پانی کا جگ اٹھائے رضا کار گھوم رہے تھے۔

واجد مال گاڑی کے ڈبے سے باہر نکل آیا۔ اس میں نہ اب سوچنے کی صلاحیت تھی اور نہ کچھ بولنے کی۔ بھوک اور تھکان نے اس کی زبان جکڑ دی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بجلی کے تار۔ کھمبے اور سگنل اس کے گرد آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے۔ رضا کاروں کی نگاہ واجد پر پڑی۔ اس کے خون آلودہ کپڑے۔ زخمی چہرہ اور داڑھی پر خشک خون دیکھ کر رضا کاروں نے سمجھ لیا کہ یہ وہ مسلمان ہے جو فساد میں کسی طرح بچتا بچاتا یہاں آپہنچا ہے۔ رضا کار تیزی سے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک جو پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے واجد کو اپنی بانہوں میں لے کر گرنے سے بچایا۔ سب واجد کو سہارا دیتے ہوئے پلیٹ فارم پر سائے میں لے آئے۔

''خدا کے لیے اسے پانی دو۔ دیکھتے نہیں۔ یہ انسان پیاس سے مر رہا ہے۔ اسے گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی لاؤ پانی۔''

پستہ قد رضا کار اپنے ساتھیوں پر چیخا۔ کسی نے واجد کے خشک منہ سے نیبو کے شربت کا گلاس لگا دیا۔ ایک کے بعد دوسرا۔ پھر تیسرا شربت کا گلاس واجد نے خالی کر دیا۔ اس کے جسم میں جو آگ لگی تھی وہ بجھنے لگی اور تراوٹ کا احساس وجود میں پھیل گیا۔ ذہن میں جو گھنی جالیاں تنی تھیں وہ ٹوٹنے لگیں۔ اس کے اردگرد ہمدرد انسان تھے۔

''بھائی کہاں سے آ رہے ہو؟''

''گورداسپور سے؟''

''جالندھر سے؟''

''کوئی اور زندہ نہیں بچا؟''

بولنے والوں کی آوازوں کی نرمی اور ان کے وہ ہاتھ جو اس کے بازوؤں اور کلائیوں پر تھے۔ ان ہاتھوں کے لمس کی اپنائیت سے واجد کو یقین آگیا کہ وہ اب دوسری دنیا میں ہے۔ جہاں اس کا کوئی واقف نہیں۔ اس کے ماضی کا جاننے والا نہیں۔ واجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ خاموشی میں ہی مصلحت تھی۔

''آپ لوگ کیا احمقانہ سوال کر رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا کونا ہے جہاں درندے کافر ہمارے بھائی اور بہنوں کو تہہ تیغ نہیں کر رہے ہیں؟ خدا ان بت پرستوں پر اپنا عذاب نازل کرے۔''

پستہ قد رضا کار جو واجد کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر سہارا دیتا ہوا پلیٹ فارم تک لایا تھا، وہ دونوں ہاتھوں کو آسمان کی جانب اٹھائے دہائی دے رہا تھا۔ اس کے گورے اور انڈے جیسے چہرے پر سیاہ داڑھی پسینہ سے بھیگی تھی۔ سینے اور توند پر خاکستری کرتا بھی نم تھا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا جوش تھا کہ سب لوگ خاموش ہو گئے۔

''مولانا غیظ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ان سوالوں کا وقت نہیں ہے۔'' کوئی دھیمے سے بولا۔

ایک خوبرو عورت نے اپنے دوپٹے کو پانی سے بھگویا اور واجد کے چہرے پر جمے خون کو صاف کرنا چاہا۔ واجد نے مارے ہیبت کے اپنے چہرے کو دوسری جانب کرلیا۔ عورت کے معصوم لمس سے سراسیمگی اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ مجھ پر پھر کوئی عذاب نہ ٹوٹ پڑے۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ واجد کی خوفزدہ آنکھیں خاموشی سے کہہ رہی تھیں۔

''بھائیو دیکھو۔ اس کی آنکھوں میں کیسی وحشت ہے۔ کتنا ڈر ہے۔ ضرور اس کی ماں بہنوں کو کافروں نے اس کی آنکھوں کے سامنے مارا ہوگا...... عین ممکن ہے ان کے ساتھ زنا بھی کیا ہو۔'' مولانا غیظ نے یقین سے کہا۔

''درست...... درست۔'' ان کے ساتھی ایک ساتھ بول پڑے۔

اچانک ایک ٹرین ہندو اور سکھ مہاجروں سے بھری گزری۔ ٹرین کے ڈبوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ بعض بند دروازوں کے نیچے سے زخمی مہاجروں کا خون نکل آیا تھا۔ ٹرین کی چھتوں سے چپکے ہوئے مہاجر چیختے ہوئے ٹرین کے ساتھ گزر گئے۔ ان کے ساتھ وہ تاریخ اس سرزمین سے رخصت ہوگئی جہاں اس کی جڑیں تھیں۔ جس آزادی کو ہندوستانیوں نے شادمانی کا آغاز سمجھا تھا، اس نے خنجر سے ملک کے تین ٹکڑے کر دیئے۔ وہ آزادی دشمنی لائی اور نفرت کے بیج بو گئی۔ وہ چہرے جو صدیوں سے آشنا تھے۔ جن پر ایک دوسرے کی خوشی دمکتی تھی اور ایک دوسرے کے غم کی پرچھائیں پڑ جاتی تھی، وہ اجنبی اور بدیسی بن گئے۔ وہ ان آقاؤں سے بھی بدتر ہو گئے جنھوں نے کھیتوں میں بھوک اگائی تھی اور غلامی کی ذلت کا طوق

گلے میں ڈال دیا تھا۔

"روکو...... روکو...... اس ٹرین کو روک لو۔ آؤ ان کافروں کو ہم ٹھکانے لگا دیں۔" مولانا غیظ لڑھکتے، اچھلتے اور اپنے ساتھیوں کو للکارتے ہوئے پلیٹ فارم پر بھاگتی ٹرین کی جانب دوڑے۔ لیکن وہ ان کی پہنچ سے باہر تھی۔ انسانی المیے کو سمیٹے وہ جہلم اسٹیشن سے جلد دور چلی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ کیا ہم سگنل آفس میں جا کر سگنل نہیں گرا سکتے تھے اور ٹرین کو نہیں روک سکتے تھے۔" مولانا غیظ پلیٹ فارم پر بکھرے مہاجروں سے مخاطب تھے۔ مولانا کے خیال میں بھاگتی ٹرین کو روکنا آسان تھا۔ وہ جس جوش اور نفرت سے جل رہے تھے اس میں کیا ممکن تھا اور کیا نہیں اس میں عقل کام نہیں کرتی۔

"تم سب بزدل ہو، جبھی تو اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔" مولانا نے مجبور و بے بس مہاجروں پر اپنا فیصلہ داغا۔

وہ صرف اپنے گھروں کو چھوڑ کر نہیں آئے تھے۔ وہ اس صبح اور شام کو چھوڑ کر آئے تھے جس میں تنوروں میں پکتی روٹیوں کی آشنا لذت لپکتی تھی اور شناسا پھولوں کی خوشبو ان سے لپٹ جاتی تھی اور بھی بہت کچھ انھوں نے چھوڑا تھا جو یاد تھا اور نہیں بھی۔

مولانا اپنے ساتھیوں کے پاس آ گئے جو اب بھی واجد کے پاس کھڑے تھے۔

"ہم لوگوں کو کشمیر جا کر جہاد کرنا چاہئے۔ وہاں ہمارے پٹھان بھائی کافروں سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوں گے۔ یہاں تو ہم سوائے رونے پیٹنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔" مولانا غیظ نے اپنا منہ بنا کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"یقیناً...... میں تو کئی دنوں سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں رضا کاروں کی کمی نہیں۔ جہاں حق اور باطل کا فیصلہ ہو رہا ہے وہاں ہمیں جانا چاہئے۔" مولانا غیظ کا ایک لمبا تڑنگا ساتھی بولا اور ساتھ ہی اس نے اپنی شلوار کو اپنی کمر کے اوپر کھینچا۔

"لو بھائی اسے پہنو۔ تمہارا کرتا تار تار ہو رہا ہے۔" مولانا غیظ نے پلیٹ فارم پر پڑے کپڑوں کے ڈھیر سے ایک قمیص اٹھا کر واجد کو دیتے ہوئے کہا۔ واجد نے جب اپنا کرتا اتارا تو اس کی پیٹھ پر زخموں کو دیکھ کر رضا کار عورت کی سسکی نکل گئی۔

"اُف ظالم ہندوؤں نے کس بیدردی سے ہمارے بھائی کو مارا ہے۔" عورت سسکتے ہوئے بولی اور دوپٹے سے اپنے آنسوؤں کو خشک کرنے لگی۔

واجد کو کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی، خاموشی ہی بھلی تھی۔ یہ نیک بندے جو بھی سمجھنا چاہیں انھیں سمجھنے دو۔ شاید خدا کو مجھ پر ترس آ گیا ہے۔ دو رضا کار واجد کو اسٹیشن کے باہر ایک خیمے میں لے آئے۔ وہاں دوائیں اور پٹیاں تھیں۔ خیمے میں کاربولک لوشن کی بو تھی۔ گردن سے اسٹےتھسکوپ لٹکائے ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ وہ ایک اخبار سے خود کو پنکھا جھل رہا تھا۔ جب اس نے واجد کے زخموں کو اسپرٹ سے صاف کیا تو وہ جلنے لگے۔ واجد بلبلا اُٹھا۔ کسی نے اُسے تسلی دی۔ کسی نے ہمت بندھائی۔ جب اس کی مرہم پٹی ہو چکی تو دو روٹی سالن کے ساتھ اُسے کھانے کو ملی۔ پیٹ کا دوزخ کسی طرح بجھ گیا اور واجد کو آرام آ گیا۔ لیٹنے کے لئے اسے ایک دری دے دی گئی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر ایک جانب پڑ گیا...... چوٹ سے نڈھال اور دن بھر کی تھکان سے چور اس کی آنکھیں مند گئیں۔ دن ڈھل گیا اور شام آ گئی۔ جب بھی کوئی ٹرین آتی تو واجد کی آنکھیں کھل جاتیں۔ ٹرین سے جو بھی اترتے وہ مہاجر ہی ہوتے۔ زخمی، حیران اور پریشان، جنھیں نہ حال کا پتہ تھا اور نہ مستقبل کا۔ ان کی آمد سے اسٹیشن پر نہ تھمنے والا شور کچھ اور بڑھ جاتا۔ رضا کار ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگتے۔ جہلم شہر کے رہنے والوں نے کھانا، کپڑے، شربت، پانی، چٹائیاں اور دریاں مہیا کی تھیں، وہ تقسیم ہونے لگتیں۔ مہاجروں کے شور میں سب سے پر اثر اور سب سے جان کاہ ان کی آہ وزاریاں تھیں جنکے عزیز و اقارب مار دیئے گئے تھے۔ واجد کے لبوں پر نہ آہ تھی اور نہ ہی شکایت۔ بغیر کسی ارادے یا فریب کے وہ بھی ایک لٹا لٹایا مہاجر قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے ماضی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کل کیا ہوگا اور وہ کہاں جائے گا؟ اس بابت بھی وہ فکر مند نہیں تھا۔ وہ اسٹیشن پر رک سکتا تھا۔ یہاں اسے دو وقت کی روٹی ملے گی اور تحفظ بھی۔ خدا نے اسے ٹھکرایا نہیں ہے۔ وہ اب بھی اس کا پاسبان ہے۔ واجد نے سوچا۔'' پلیٹ فارم پر نماز کے لیے صفیں بچھی تھیں۔ وقت کے آجانے پر مرد عورت اور بچے بھی نمازیں پڑھنے لگتے۔ واجد بھی اپنی چوٹوں سے دبی زبان میں کراہتا ہوا ان میں شامل ہو جاتا اور خشوع خضوع سے دعائیں مانگتا۔ آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کے ساتھ جو بھی دعا کا لفظ نکلتا اس میں معافی کی طلب ہوتی۔

خدایا۔ خدایا۔ بخش دے۔ رحم کر...... رحم کر۔

رات آ گئی۔ پلیٹ فارم پر بجلی کی بیمار سی روشنی پھیل گئی۔ انسانوں کا جو ہجوم وہاں تھا وہ سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ہوا میں کوئلے کا دھواں اور سڑے پھلوں کی بو تھی۔ کبھی کبھی کسی انجن

کے کوکنے کی آواز آجاتی۔ وہ بڑی لالٹین جس میں سرخ اور سبز شیشے تھے اسے اٹھائے ہوئے اور سفید وردی میں ملبوس ایک ریلوے ملازم واجد کے پاس سے گزر گیا۔ فوج سے بھری ایک ٹرین آکر رکی اور اس سے فوجی اتر پڑے۔ انھوں نے اپنے کندھوں سے رائفلیں لٹکائی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں بستروں کو بھی سنبھالا ہوا تھا۔ فوجی اپنے بوٹوں کو کھٹکھٹاتے ہوئے اسٹیشن سے باہر جاکر قطاروں میں ان فوجی ٹرک کے پاس کھڑے ہوگئے جو پہلے سے وہاں موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر جولوگ تھے ان میں کھلبلی مچ گئی۔ بہت سے مرد عورت اور بچے ریلنگ کے پاس جاکر باہر دیکھنے لگے۔ واجد اُٹھا نہیں۔ تھکان اور زخموں کے درد سے چور وہ بیقراری سے کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ فوجیوں کا آنا، اردگرد جولوگ تھے ان کی ہلچل، ان میں اسے دلچسپی نہیں محسوس ہوئی۔ لیکن باہر سے جو تحکمانہ آواز آرہی تھی اسے سننا ناگریز تھا۔

"افسر صاحبان اور جوان۔ کل تک جو ہمارے دوست تھے انھیں آج دشمن ماننا بہت مشکل ہے۔ جن کے ساتھ مل کر ہم نے برما، افریقہ اور یورپ میں جنگیں لڑیں۔ جن کے دکھ درد میں ہم شریک ہوئے ان ہی کے خلاف کشمیر میں ہمارا مقابلہ ہے۔ اب پاکستان ہمارا ملک ہے۔ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ اگر ہم اپنے دشمن کا خاتمہ نہیں کرتے ہیں تو وہ کل جہلم یا راولپنڈی میں ہوگا۔ ہمارا بھائی یا ہمارا پڑوسی اگر ہمارے ملک کا دشمن ہے تو وہ ہمارا بھی دشمن ہے۔ اسے ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ پاکستان زندہ باد۔"

"زندہ باد۔" فوجی اور پلیٹ فارم کی ریلنگ کے پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی للکارے۔

"بٹالین ڈسمس۔" کوئی فوجی گرجا۔ سپاہیوں کی قطاریں ٹوٹیں اور وہ ٹرک میں بیٹھنے لگے۔

واجد کے پریشان ذہن میں ان سب کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی۔ اردگرد جولوگ تھے وہ زور زور سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

"کشمیر میں زوروں کی جنگ ہورہی ہے۔"

"ٹرک جس راستے پر مڑے ہیں وہ میرپور جاتی ہے۔"

کشمیر...... جنگ...... کوٹ فتح خان...... مسجد...... گاؤں...... ظالم مجید اور ملک ظہیر......

عجیب وغریب سے ہیولے واجد کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس نے بے چینی سے کروٹیں بدلیں۔ لیکن اسے قرار نہیں ملا۔ دری کے نیچے زمین سخت تھی۔ اردگرد مچھروں کی بھنبھناہٹ اور ان کا اسے ڈسنا ایک کرب تھا۔ جو پتلی سی چادر اسے ملی تھی اس سے واجد نے اپنے

جسم کو ڈھکا۔ آخر کار درد سے کراہتی زبان تھک گئی اور تھکی آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہو گئیں۔

چند دن گزر گئے۔ واجد کے زخم بھرنے لگے۔ دو وقت کی روٹی اور دال سے اس کے جسم کی طاقت واپس آ گئی۔ لیکن ایک چپ اس کی زبان کو لگی تھی۔ کسی سے بات کرنے کی اسے خواہش نہیں ہوتی تھی۔ اس کی جو ذلت ہوئی تھی اس نے اس کی گویائی چھین لی تھی۔ کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے خاموش تکتا رہتا۔ دن کے وقت وہ پلیٹ فارم کی چھت کے نیچے آ جاتا اور رات میں سکھوں سے الگ تاروں سے بھرے آسمان کے نیچے پناہ لیتا۔ وقت کے مرہم نے اس کی رسوائی کے زخم کو جب کچھ مندمل کر دیا تو اسے تنہائی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ انسانوں کا جو ہجوم تھا وہ اب بھی اس کے لئے غیر تھا۔ اس ہجوم کے کسی فرد میں اسے کشش نہیں محسوس ہوتی۔ اس کے گرد جو زہرناک خلا تھا اس میں نوراں کی یاد تریاق تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے تصور سے اس کے وجود کو دور نہیں کر سکا۔ راتوں کو وہ اس کے سرہانے آ بیٹھتی۔ اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر اسے تکتی رہتی۔ واجد اس کی گرم انگلیوں کو اپنے گالوں، اپنی گردن اور چھاتی پر سرکتے محسوس کرتا۔ اسے اس آم کا مزہ منہ میں گھلتا محسوس ہوتا جو نوراں کبھی کبھی اپنے ساتھ لاتی تھی اور جسے دونوں ساتھ کھاتے تھے اور آم کے رس سے تر ہونٹوں سے ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ نوراں کا بے لباس جسم بھی واجد کو یاد آتا اور اس جسم کا اس سے لپٹنا۔ اسے وہ خوشی دینا جس میں بے پناہ طمانیت تھی۔ بے پناہ سکون تھا۔ سب کچھ واجد کو یاد آتا۔ نوراں نے اس سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ کسی شے کی طلب نہیں کی تھی۔ وہ قربت اس کے لئے کافی تھی جو اسے واجد سے مل جاتی تھی۔ وہ اسے فرشتہ کہتی تھی اور خدا کی وہ برکت جو اس کی روح کو پاک کر رہی تھی۔ واجد کو کبھی کبھی احساس ہوتا کہ نوراں کا تصور گناہ تھا۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ راتوں کو پٹریاں پھلانگتی ہوئی نوراں آ جاتی۔ کوئی ٹرین رکتی تو واجد کی نگاہیں مسافروں میں نوراں کو تلاش کرنے لگتیں۔ مہاجروں کا وہ ہجوم جو آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا جس میں اس کا تصور نوراں کو اس کے پاس لے آتا۔ اس کے خیال سے نجات مشکل تھی۔ واجد کو صرف اس کے جسم کی طلب نہیں پریشان کرتی اسے یہ بھی احساس ہوتا کہ وہ اسے بھگا لے آتا تو وہ دونوں ہر دن کی مشقت ساتھ برداشت کرتے۔ کئی بار واجد نے قصد کیا کہ وہ واپس کوٹ فتح خان جائے۔ لیکن جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور اگر وہاں وہ کسی طرح جاتا بھی تو عین ممکن تھا کہ پکڑا جاتا۔ اس کا خوف بھی اس کے پاؤں پکڑ لیتا۔ مجبور ہو کر وہ خدا

کی لو میں دل لگاتا۔ اسے اس کی مدد کی امید تھی۔ شاید نوراں کی محبت میرے دل سے نکل جائے۔ خدا مددگار ہے۔ خدا مددگار ہے۔ واجد اکثر خود سے کہتا۔

مولانا غیظ اور ان کے ساتھی رضا کار ہر روز مہاجروں کے لئے کپڑے اور کھانا لے کر آتے تھے۔ غیظ کا جوش و خروش ہر وقت یکساں رہتا۔ چہرہ سرخ اور سنجیدہ، کسی رضا کار کو بے دلی سے کام کرتے دیکھ نچلے ہونٹ کو چباتے ہوئے اسے گھورنا۔ کس مہاجر کو کونسا کپڑا دینا ہے۔ تحکمانہ لہجے میں بتانا۔ فربہی کے باوجود پلیٹ فارم پر ایک سرے سے دوسرے تک تیز قدموں سے چلتے ہوئے جانا اور ساتھ ہی ہندوؤں اور سکھوں کو گالیاں دینا۔ جو نئے مہاجر آتے اور اسٹیشن پر عارضی قیام کرتے ان کی دل جوئی کرنی۔ ان مہاجروں کو کہاں بسنا ہے اور کدھر جانا ہے۔ اس کے لئے دفتروں کے چکر لگانا۔ مقامی مسلم لیگ لیڈروں کو ساتھ لے کر مہاجروں کے کیمپوں میں پھرنا۔ ان کی دردمندی اور ان کے جوش و خروش نے انھیں لیڈر بنا دیا تھا۔ لوگ ان کے منتظر رہتے اور رضا کار خوشی خوشی ان کے احکامات مانتے۔

غیظ مدرسے کے تعلیم یافتہ تھے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے ان کا خاندان کانپور میں بسا ہوا تھا۔ جہاں ان کے بزرگوں کی جوتوں کی تجارت تھی۔ وہاں ایک بار جناح صاحب کا آنا ہوا تو انھیں جس فٹن میں بٹھا کر شہر میں گھمایا گیا اس فٹن میں مارے عقیدت کے بجائے گھوڑوں کے وہ اور ان کے ایک بہرے ماموں نے گھوڑوں کا کام انجام دیا، اور اس کے بعد مولانا غیظ نے بازاروں میں جا کر دھواں دھار تقریریں کیں۔ جوش میں ان کے باریش چہرے کو سرخ ہوتے اور منہ سے جھاگ اڑتے دیکھ کر منچلوں نے مولانا غیظ زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اس دن سے ان کا یہی نام ہو گیا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی ان کا خاندان لاہور آ گیا تھا۔ جہاں وہ اپنی آتش فشاں تقریروں کی وجہ سے جلد مشہور ہو گئے۔ لوگوں نے ان کا اصل نام جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور غیظ بھی اس نام سے خوش نظر آتے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں مولانا ہو جانا بڑی بات تھی۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر سیاہ داڑھی خوب جچتی تھی۔ جب لاہور میں ہندو مسلم فساد نے زور پکڑا تو وہاں سے ہندو اور سکھ سرکنے لگے۔ مولانا غیظ کے بزرگوں کو ایک عمارت سستے دام میں مل گئی اور دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک چھاپہ خانہ بھی ہاتھ آ گیا۔ جب اطلاع ملی کہ جہلم کے اردگرد زمین زرخیز ہے تو ان کے بزرگوں نے زمینیں بھی خرید لیں۔ وہ وہاں جب بھی جاتے تو کسانوں کو جان توڑ محنت کرنے کا سبق اپنی تقریروں کے

ذریعہ سمجھاتے۔ مہاجروں کے درمیان پھرتے ہوئے انھیں اکثر خیال آتا کہ انھیں بڑا کارنامہ کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لینے کی بابت بھی کبھی سوچنے لگتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا غلط بھی نہیں تھا۔ کھلے منہ میں تیز دانتوں کی دھار جیسے وہ ان سے کچھ کاٹنا چاہتے ہوں۔ چہرہ اور جسم پسینہ سے نم۔ سر پر جناح کیپ پیچھے کی جانب سرکی ہوئی۔ شب بیداریوں کی وجہ سے آنکھوں میں سرخ ڈوریاں۔ مہاجروں کی درد بھری داستانیں سن کر ان کی آنکھوں کا نم ہو جانا۔ ہر وقت متحرک۔ کبھی کھانا تقسیم کرنا۔ کبھی مہاجروں کے لئے خیموں کے کھونٹے ٹھونکنا۔ مولانا غیظ سچے رہنما تھے۔ دیگر رضا کار اس جانفشانی سے خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ نئی قوم کو ایسا ہی لیڈر چاہئے تھا۔ مولانا غیظ کی خوب شہرت تھی۔ اخبارات میں ان کی تصویریں آرہی تھیں۔ اپنے سماجی کاموں میں اس انہماک اور خلوص کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھے۔ وہ ایک آگ میں جل رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کر بیٹھتے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پاکستان کے رہنما اور فوج ایسا کیوں نہیں کرتی۔ ماضی میں مٹھی بھر مسلمانوں نے ہمیشہ دشمنوں کی کثیر تعداد کو شکست دی تھی۔ آج بھی یہ ممکن ہوسکتا ہے۔ مولانا کو رہ رہ کر یہی خیال آتا۔ بعد میں وہ یہ سوچ کر تسلی کر لیتے کہ اب سچے مسلمان نہیں رہے۔ وہ خود نہ فوجی تھے اور نہ ہی انھوں نے کوئی فوجی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھے کہ رائفل اٹھا کر پریڈ کرتے۔ اپنی مجبوری پر وہ تڑپ کر رہ جاتے۔ دن بھر کے کام کے بعد جب رات میں چند گھنٹے کا آرام انھیں میسر آتا تو وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہتے۔ انھیں پتہ تھا کہ کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ انھیں اس کا بھی علم تھا کہ وہاں صوبہ سرحد کے پٹھان لڑ رہے تھے جو فوجی نہیں تھے۔ ان کی طرح وہ بھی لڑائی میں حصہ لیں گے، غیظ تہیہ کر چکے تھے۔

مہاجروں کی امداد کے لئے فوجی افسر اور سپاہی بھی مقامی چھاؤنی سے آتے رہتے تھے۔ ایک دن مہاجروں کے کیمپ میں غیظ کی ملاقات فوج کے ایک بہت بڑے افسر سے ہو گئی۔ کیمپ کے حکام نے جب ان کی خدمات سے افسر کو آگاہ کیا تو وہ متاثر ہوا۔ انھوں نے جب اسے بتایا کہ وہ کشمیر کی جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور وہ ہر قسم کا کام کرنے کے لئے تیار ہیں افسر نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تو وہ خوش ہو گئے۔ ان کے کام میں اور مستعدی آ گئی۔

ایک دن وہ واجد سے بولے۔

''اس طرح بیکار بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہٹے کٹے آدمی ہو کہیں جا کر روزی کماؤ۔''

غیظ کے چہرے پر میٹھی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس طرح کھڑے تھے کہ ان کی موٹی پنڈلیاں واجد کے جسم سے لگی تھیں۔ واجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا سمجھے کہ اس پر جو ستم ٹوٹا ہے اس سے وہ اب بھی بہت متاثر ہے۔ وہ کچھ دیر واجد کے پاس کھڑے رہے پھر جھک کر اس کی رانوں کو تھپتھپا کر چلے گئے۔ ان کی اس عجیب حرکت کو واجد نہیں سمجھ سکا۔

واجد کو اپنے نکمے پن کا احساس تھا۔ روزی کی تلاش میں اس نے میلوں میل سڑکوں کی خاک چھانی تھی۔ دکانداروں سے اس نے ملازمت کے لئے التجائیں کی تھیں۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ واجد بڑی امیدیں لے کر مسجدوں میں بھی امامت کی جگہ حاصل کرنے گیا۔ لیکن وہاں جگہیں پُر تھیں۔ اس نے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے اور بتایا کہ وہ معلم ہے اور بچوں کو دینی تعلیم دے سکتا ہے اور خوش خطی بھی سکھا سکتا ہے۔ وہاں بھی اسے ٹکا سا جواب ملا۔ تنگ آ کر وہ ٹھیلے والوں کے پاس گیا جو قصابوں کی دکانوں سے بھیڑ، بکریوں اور گائے کی بے مصرف ہڈیوں اور سڑی ہوئی سبزی اور پھلوں کو پھینکنے لے جاتے تھے تو انھوں نے کہا کہ ان کی آمدنی میں بہ مشکل ان کا ایک وقت پیٹ بھرتا ہے۔ وہ کسی اور کو شریک کار نہیں کر سکتے۔ وہ یہ سب باتیں مولانا کو بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ریلوے بک اسٹال پر کھڑے گرج رہے تھے۔

''ان انگریزی کتابوں کا اب کوئی مصرف نہیں ہے اور یہاں اردو کی ادبی کتابیں اور رسالے واہیات ہیں۔ ایک بھی دینی کتاب اس دُکان میں نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ان لوگوں کی یہ حالت ان ہی کتابوں کو پڑھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔'' مولانا کا موٹا ہاتھ مہاجروں کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

''جی غلطی ہوگئی۔'' دکان کے ایک کونے میں دبکا ہوا مالک دُکان ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

''انھیں جلا دو۔'' مولانا کا ایک ساتھی چیخا۔

''نہیں بھائیو۔ ہرگز نہیں۔ ہم ایسی غیر مہذب حرکتیں نہیں کرتے۔'' مولانا غیظ کی دائیں انگشت شہادت نفی میں زور زور سے ہلی۔ انہوں نے حکم دیا۔ ''انھیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں ڈال دو۔''

پاس کھڑے ہوئے ایک پولس افسر اور اس کے ساتھ کھڑے سپاہیوں نے مسکرا کر اُن کی

خاموش حمایت کی۔ جلد ہی دکان کتابوں سے خالی کر دی گئی۔

''اس دکاندار کو سزا دینے کے لئے کتابوں کی شلف کو کوڑا کرکٹ سے بھر دیتے ہیں۔'' مولانا غیظ کا ایک لمبا تڑنگا ساتھی سنجیدگی سے بولا۔ قریب کھڑے مولانا کے دوسرے ساتھی نے چپکے سے ایک فلمی میگزین کو قمیص کے نیچے شلوار میں اڑس لیا۔

''نا...... نا...... خدا کے لئے آپ لوگ ایسا نہیں سوچئے۔ ہم نہ صرف اس دکان بلکہ پاکستان کی ہر دکان میں دینی کتابیں رکھیں گے۔ ان کے علاوہ ایسی تصانیف بھی ہوں گی جن میں ہمارا شاندار ماضی بھی لکھا ہوگا۔'' مولانا غیظ کے بازو اکڑے ہوئے تھے اور چھاتی نکلی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھیں ان کے ساتھیوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ مولانا کی لکیر دار قمیص کے نیچے ان کے زرد ریشمی ازار بند کا پھندنا لٹک رہا تھا۔

''مرحبا...... مرحبا۔ آپ کے کارنامے کے لئے میں سرمایہ دوں گا۔'' ایک شخص جس کے سر پر پگڑی تھی اور کڑیل مونچھیں بل کھائی ہوئی تھیں، اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ اس کے پیچھے اس کے ہالی موالی مہاجروں کے لئے دیگچوں میں کھانا لئے کھڑے تھے۔

۵

چند دنوں بعد جو صبح آئی وہ رات کی خنکی سے تازہ تھی۔ اسٹیشن کے پاس کا بازار جاگ پڑا۔ سڑک پر راہگیروں، ٹھیلے اور یکوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ قصاب نے اپنی دکان میں آہنی کیلوں میں گائے اور بکری کی رانیں ٹانگ دیں۔ جن پر اردگرد سے مکھیاں اڑتی ہوئی آکر جم گئیں۔ رانیں چیچک زدہ چہرے لگنے لگیں۔ ساتھ کی دکان حلوائی کی تھی۔ اس نے باسی برفیوں اور لڈو سے بھرے طشت دکان کے برآمدے میں لگا دیئے اور ایک بڑے سے مٹکے میں دہی گھونٹ کر لسی بنانے لگا۔ جب اس کے پڑوس کی تانبے کے ظروف کی دکان سے کسی برتن کو ٹھونکنے کی آواز بلند ہوئی تو حلوائی اس آواز سے تنگ آکر تانبے کے برتنوں کے دکاندار کو زیرلب گالیاں دینے لگا۔ اس کے غصے سے بے خبر اس کی دکان کے سامنے ایک نابینا گداگر آکر بیٹھ گیا۔ قریب ہی درخت کے نیچے مقامی پہلوان اپنا سر منڈوا رہا تھا۔ دبلے پتلے حجام کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اسے اجرت کبھی نہیں ملتی تھی اور پہلوان کا ڈر کچھ ایسا تھا کہ جب وہ زور سے اپنا گلا صاف کرتا تو حجام کے ہاتھوں میں رعشہ آجاتا۔ حجام کے سر پر گھنگریالے بال سجے تھے اور اس کی صاف قمیض میں پیتل کے بٹن تھے۔ اس کی شلوار بھی صاف تھی۔ حجام کی نفاست اور اس کی ہٹلر کٹ مونچھ سے وہ اردگرد کے افراد سے ممتاز نظر آرہا تھا۔ جب وہ رک کر استرے پر سے صابن کے پھین کو جھٹکتا تو اس کی نگاہ ان مہاجر جوان عورتوں پر جاتی جو سڑک پر کے نلکے سے پانی گھڑوں میں بھر رہی تھیں۔

ایک خستہ حال ٹرک بازار میں آکر رکا اور اس میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ ان کے چہرے کی تمتماہٹ اور زور زور سے ہاتھ بلند کر کے

نعرے لگانا ان کے عزم کو ظاہر کر رہا تھا۔ ٹرک کی سامنے کی نشست سے مولانا غیظ اترے۔ وہ بادامی رنگ کی قمیص اور سفید تنگ مہری کا پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر سیاہ ٹوپی تھی اور کمر کے گرد مفلر نما سبز کپڑا بندھا تھا۔ ان کی ابروئیں تنی تھیں اور ہونٹ ایک جانب کھنچے تھے۔ نہ چاہنے کے باوجود ان کا تکبر عیاں تھا۔ ان کے ہاتھ میں نیزہ اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں تلواریں اور خنجر دیکھ کر راہگیروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ دکانداروں نے سمجھا کہ بلوہ ہونے والا ہے۔ لیکن شہر میں کوئی ہندو یا سکھ تو تھا نہیں پھر یہ تیاری کیسی۔ سبھوں کو تشویش ہوئی۔

مولانا چونکہ پستہ قد تھے اس لئے انھیں ٹرک کے پچھلے حصے پر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے ایک ساتھی نے انھیں اوپر کھینچ لیا۔ مولانا نے نیزہ ہوا میں لہرایا اور آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔

''بھائیو۔ کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ ہمارے پٹھان بھائی ہمارے دلیر سپاہیوں کے ساتھ وہاں لڑ رہے ہیں۔'' مارے جوش کے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ چیخے۔

''مجاہدانِ صف شکن! یہ وقتِ جہاد ہے۔ ہم دشمن کے خلاف پہاڑ پر، جنگلوں میں، وادیوں میں، ہر مکان میں، ہر بازار میں، اپنے مقدس وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑیں گے۔''

زور زور سے سر ہلانے کی وجہ سے ان کی ٹوپی سر پر ترچھی ہو گئی تھی۔ مولانا نے اس زور سے ٹرک کی فرش پر نیزہ کے دستے کو مارا کہ لوگ دہل گئے۔ اپنے خالی ہاتھ کی انگشت شہادت کو زور زور سے ہلاتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ''دلیرو! ہماری غیرت کو للکارا گیا ہے۔ ہماری جرأت کی آزمائش کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ تاریخ ایک بار پھر ہماری شہادت کی منتظر ہے۔ قسم ہے وحدہ لاشریک کی ہم اپنے خون کا قطرہ قطرہ بہا دیں گے۔ مجاہدو مت بھولو۔ ایک وقت تھا جب ہمارا ہلالی پرچم ہندوستان کیا یورپ سے انڈونیشیا تک لہراتا تھا۔ ہمیں اپنے ماضی کو دہرانا ہے۔ زریں مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ آؤ عقاب بن کر اسے اپنے چنگل میں سمیٹ لیں۔''

''آہ......'' مسلمانوں کی عظیم سلطنت کے مٹ جانے پر کسی نے آہ بھری۔

''واہ......'' ہجوم میں دوسری جانب سے کسی اور نے بیخودی میں آواز لگائی۔ اسے محسوس ہوا کہ مولانا غیظ نے اس سلطنت کے دوبارہ قیام کے امکانات کو روشن کر دیا ہے۔

مولانا کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند تھے۔ لگاتار بولنے کی وجہ سے ان کے ہونٹ خشک

تھے۔ وہ گردن گھما گھما کر اردگرد دیکھ رہے تھے۔ شان اور تمکنت ان کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے نمایاں تھیں۔ وہ اپنی سحر بیانی سے مطمئن تھے۔ انھیں اپنی رہنمائی کا یقین تھا۔ ایک دن وہ پاکستان کے بہت بڑے لیڈر ہوں گے، ان کا دل کہہ رہا تھا۔

ہجوم کی وارفتگی دیکھنے کے لائق تھی۔ قصاب اپنی چھریاں لہراتا ہوا دکان سے نکل آیا۔ برتنوں کی دکان کا مالک ہتھوڑا اٹھا کر اپنے بازوؤں کو اکڑانے لگا۔ مجمع میں سے ایک پُر جوش نوجوان اچک کر ٹرک پر چڑھا اور مولانا غیظ کو اپنے کندھے پر اٹھا کر للکارا۔ 'مولانا غیض زندہ باد' ہجوم نے اس کے ساتھ آواز بلند کی۔

''ہمیں ایسے ہی لیڈروں کی ضرورت ہے۔'' اپنی شلوار کے ازار بند کی گرہ کستے ہوئے کوئی بولا۔

''چہ...... چہ...... چہ...... ہمارے مولانا کا منہ دیکھو کتنا خشک ہو رہا ہے؟'' ٹرک کے پاس کھڑے ایک بزرگ نے دردمندی کا اظہار کیا۔

درمیانہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص، جس کے گورے چٹے چہرے پر گھنی موچھیں بل کھائی ہوئی تھیں اور جس کی آنکھوں میں سرمہ تھا اور گلے میں چنبیلی کا ہار۔ وہ تیزی سے حلوائی کی دکان میں گیا اور لسی سے بھرا گلاس اٹھا کر الٹے پاؤں واپس پھرا۔ جلد بازی کی وجہ سے اسے ٹھوکر لگی۔ گلاس چھلک گیا اور لسی سڑک کے کنارے بیٹھے فقیر کے گنجے سر پر گر گئی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ خالی گلاس اٹھائے اور خشمگیں نگاہوں سے اسے تکتے دیکھ کر فقیر نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔

''اللہ تیرا شکر ہے......'' فقیر شکرانہ ادا کر رہا تھا اور ساتھ ہی چہرے پر بہتی لسی کو مزے لے لے کر چاٹتا بھی جاتا تھا۔

''بے ایمان! دھوکے باز! تیری آنکھیں تندرست ہیں اور تو اندھا بنتا ہے؟''

وہ شخص جو لسی کا خالی گلاس پکڑے ہوئے تھا غصے میں بولا اور ساتھ ہی اس نے فقیر کو لات رسید کرنا چاہا، لیکن حجام جو پاس ہی پہلوان کا سر مونڈ رہا تھا اس نے استرا تان لیا، جیسے وہ حملہ کرنے والا ہو۔

''خبردار جو اس سادہ گدا کو تم نے ہاتھ لگایا۔ یہ مجبور غریب اندھا نہیں بنے گا تو کیا کرے گا۔ کیا تم اس کے گنجے پن کی وجہ سے اسے بھیک دو گے؟'' حجام نے دھمکی دی۔

"کیا یہ بہن...... تمہارا بہنوئی ہے جو تم اس کی طرفداری کر رہے ہو؟ تم جیسوں کی وجہ سے اس وقت ملک میں برائی پھیل رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے مونچھوں والے بانکے نے حجام کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دھڑام سے گرا اور اس کے ہاتھ سے استرا چھوٹ کر دور جا گرا۔

"ابے منڈے...... تیری شامت آگئی ہے۔ اب میں تیرا پستہ بناتا ہوں۔" پہلوان مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سر کے نصف حصے کی مونڈن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے نصف سر پر ننھے سیاہ بال گڑ سے چپکی چونٹیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

"تم سمجھتے ہو میں بھاگ جاؤنگا۔ میں بجلی خاں ہوں۔ آگرے کے چنبیلی بازار میں میرے دو اکھاڑے تھے جہاں میں تم جیسے دودھ پیتے بچوں کو کشتی لڑنا سکھاتا تھا۔ ہمت ہے تو آؤ۔ تمہارے سر کو کدو نہیں بنا دیا تو میرا نام بھی بجلی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اُچک کر برتنوں کی دکان کے مالک سے ہتھوڑا چھین لیا۔

دکان کے مالک نے بھی ایک دیگچی سنبھال لی۔ وہ پہلوان کا دلی دشمن تھا۔ جس کی وجہ اس کے دکان میں کام کرنے والا ایک چھوکرا تھا، جس پر پہلوان کی بری نظر تھی۔ وہ اکثر اس چھوکرے کے گال مسلتا اور موقعہ ملنے پر اس کا بوسہ بھی لے لیا کرتا تھا۔ بجلی خاں کے ہاتھ میں ہتھوڑا دیکھ کر پہلوان جھجکا اور داؤ پیچ سوچنے لگا۔ اسے جھجکتے دیکھ کر حلوائی للکارا۔

"پہلوان۔ یاد رکھو۔ تم نے میری دکان کی بالائی کھائی ہے۔ اس کی لاج رکھو۔ اس تلنر کو دکھاؤ لاہوری ہاتھ۔ وہی تمہارا قینچی داؤ جس نے زور آور خاں کا زور ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ چونکہ بجلی خاں نے حلوائی کو لسی کی قیمت ادا نہیں کی تھی اس لئے وہ پہلوان کی مدد کے لئے سڑک پر کودا۔

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے پہلوان پھنکارتا ہوا بجلی خاں کی جانب بڑھا۔

اب ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ بلوہ ہونے والا ہے۔ وہ لوگ جو مولانا غیظ کی تقریر اشتیاق سے سن رہے تھے وہ پہلوان اور بجلی خاں کے داؤ پیچ دیکھنے کے لئے ان دونوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ مولانا جواب تک اپنے ساتھی کے کندھے پر براجمان تھے انھوں نے بھی موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ وہ اپنے دوست کے شانے پر سے کودے اور "خبردار۔ خبردار۔" چیختے ہوئے بجلی خاں اور پہلوان کے درمیان پہنچ گئے۔

''مجاہدو۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ ایک بھائی اپنے ہی بھائی پر وار کر رہا ہے۔ کشمیر میں جہاد برپا ہے۔ مجھے رضا کاروں کی ضرورت ہے اور آپ لوگ اپنے عظیم مقاصد سے بے خبر ہیں؟''

چہرہ سرخ، ٹوپی کے نیچے بکھرے بال، ہاتھ میں تنا نیزہ اور ساتھ ہی مولانا غیظ کا کڑکنا۔ بجلی خاں اور پہلوان ڈر گئے۔ انھیں خطرہ ہوا کہ کہیں مولانا غیظ ان کے پیٹ نہ پھاڑ دیں۔ دونوں ڈر کر ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔

''تم دونوں بھائی ہو کبھی مت بھولنا۔'' مولانا کا لمبا تڑنگا ساتھی جس کی کمر تک مولانا کا قد پہنچتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو ہوا میں زور زور سے لہراتے ہوئے پہلوان اور بجلی خاں کو سمجھا رہا تھا۔ دونوں اپنا رشتہ سمجھ گئے اور نادم ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ ہجوم مولانا کی اہمیت سے متاثر ہو کر نعرے لگانے لگا۔ ''مولانا غیظ زندہ باد۔'' مولانا بھی خوش تھے۔ انھوں نے نہ صرف اتنے بڑے اجتماع کو مسحور کر دیا تھا بلکہ ایک بلوہ بھی ان کی وجہ سے رک گیا۔ وہ مطمئن اور پُر اعتماد نگاہوں سے اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھتے ہوئے ٹرک پر آکر بیٹھ گئے۔ ان کی جیب میں کور کمانڈر کا وہ اجازت نامہ تھا جس کے تحت وہ اور ان کے ساتھیوں کو کشمیر کے محاذ پر شہری کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ ان کے کام کی نوعیت کا فیصلہ محاذ پر لڑنے والی فوج کے افسرِ اعلیٰ کو کرنا تھا۔

مولانا سردست صرف بیس رضا کار لے جانا چاہتے تھے۔ ٹرک میں اتنے ہی افراد کی جگہ تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ بعد میں وہ مزید رضا کاروں کو لے جائیں گے۔ ان کا ایک ساتھی رجسٹر میں ان لوگوں کے نام لکھنے لگا جو اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ ایک بارہ سال کا لڑکا بھی اپنا نام لکھانے پر مصر تھا۔

''مولانا...... اسے بھی ساتھ لے چلیں۔ پانی وانی پلانے کے کام آئے گا۔'' غیظ کا ساتھی جو رجسٹر میں رضا کاروں کے نام لکھ رہا تھا، اس نے پوچھا۔

مولانا نے اپنی آنکھوں کو نیم باز کر کے نفی میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ گورا چٹا لڑکا مہاجروں کے درمیان سے بھٹک آیا تھا۔ اس کے جسم پر بنیائن اور نیکر تھی۔ مولانا غیظ کو پتہ تھا کہ پانی پلانے کے علاوہ اور کون سی خدمات اسے انجام دینی پڑے گی۔ کسی نے انھیں لسی کا گلاس پیش کیا جسے مولانا چڑھا گئے اور دوسرے گلاس کی فرمائش کی۔ دو گلاس ٹھنڈی لسی سے ان

کا بھیجا ذرا ٹھنڈہ ہوا اور ان کے جسم کو ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اسٹیشن پر مہاجر، سڑک کی ہلچل اور بازار کا شور انھیں سنائی دیا۔ خشک لکڑی کی طرح سوکھی ایک خبطی فقیرنی مولانا کے قریب آئی اور آسمان کی جانب ہاتھوں کو بلند کر کے پکاری۔

"یا ربّا۔ اس نیک بندے کو فوراً شہادت دینا۔ دشمن کی تلوار اس کی گردن پر ایسی پڑے کہ اس کا سرتن سے جدا ہو جائے۔ پھر میں اس کے قبر کی مجاور بنوں گی۔ بناؤ گے نا؟" فقیرنی مولانا کی پنڈلیوں کو پکڑ کر التجا کرنے لگی۔

"جا بی بی۔ جا۔ سب کے لئے دعا کر۔" وہ کھسیا کر بولے۔ اچانک انھیں کچھ یاد آیا اور وہ اپنی نشست سے کود کر اس آدمی کے پاس پہنچے جو رضا کاروں کے نام لکھ رہا تھا۔

"بھئی...... جلدی جلدی لکھو...... کتنے آدمی ہوئے؟"

"چالیس ہو گئے۔"

"مرحبا...... لیکن اتنے لوگ تو ٹرک میں نہیں آسکتے...... بھائیو...... فہرست میں جن کے نام ہیں ان میں سے پہلے بیس آدمی ابھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ باقی بعد میں۔ مجاہدو۔ ہمیں ایسے ہی جوش و خروش کی ضرورت ہے۔ وہ دن دور نہیں جب دشمن کو کشمیر سے دم دبا کر بھاگنا پڑے گا اور وہ دن بھی ضرور آئے گا جب لال قلعے پر ہمارا ہلالی پرچم لہرائے گا۔" مولانا نے غیظ سے مٹھی باندھ کر کہا۔ وہ ایک بار پھر تقریر کرنے کے موڈ میں آچکے تھے۔ لیکن ان کے لمبے تڑنگے ساتھی نے انھیں اس کا موقعہ نہیں دیا۔ وہ رضا کاروں کو مخاطب کر کے بولا۔

"میں جو بیس نام پکار رہا ہوں وہ آج ہم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔ آپ لوگ بستر، دو جوڑے کپڑے اور ایک گلاس لے کر فوراً یہاں آجائیے۔"

سب سے پہلا نام واجد کا تھا۔ اس نے جب مولانا کی تقریر سنی تو جہاد میں شرکت اسے خدا کی جانب سے بھیجی ہوئی نعمت محسوس ہوئی۔ وہ جب کشمیر میں ہوگا تو وہاں اس کے ماضی کی بھنک بھی کسی کو نہیں ملے گی۔ اتنے دور دراز مقام پر کون جانے گا کہ اس نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی سزا اسے ملی تھی...... اور پھر جہاد میں شرکت اس سے بڑھ کر برکت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر اسے شہادت نصیب ہوتی ہے تو اسے جنت ملے گی اور وہ اگر زندہ رہ جاتا ہے تو وہ کشمیر میں اپنا مسکن بنا لے گا۔ گر خدا نے اسے سچ مچ بخش دیا ہے تو کشمیر میں بھی اس پر اس کی رحمتیں ہوں گی۔

رضا کاروں سے بھرا ٹرک چل پڑا۔ ان کے رشتہ داروں نے سنجیدہ چہرے اور آنسو بھری

آنکھوں سے انھیں رخصت کیا۔ بازار میں اس ہوٹل کے سامنے ٹرک رکا جس پر بڑے بڑے حرفوں سے ''خستہ سہارنپوری پراٹھے'' لکھا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے بڑے ادب سے مولانا غیظ کو سلام کیا اور ساتھ ہی اطلاع دی کہ ان کے حکم کے مطابق سب کچھ تیار ہے۔ یہ ہوٹل کبھی کسی سکھ کا تھا جس کے پشاوری تکوں کی شہرت تھی۔ لیکن سردار جی ہندوستان ہجرت کر چکے تھے اور ہوٹل مولانا کی کوششوں سے سہارنپور سے آئے ہوئے ایک خاندان کو مل گیا تھا۔ جلد ہی ٹرک میں قورمے سے بھرے دیگچے اور نان سے بھری ٹوکریاں مع رکابیوں اور چمچوں کے رکھدی گئیں۔ ہوٹل کا ایک ملازم بڑے مٹکے میں پانی لے آیا۔

ٹرک جہلم سے نکل کر کچھ دیر بعد اس سڑک پر آگیا جو نہر کے ساتھ ساتھ میر پور جاتی تھی۔ رضا کار اپنے بستروں پر بیٹھے تھے۔ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے اپنی جان نچھاور کر دینا چاہتے تھے۔ یہی خیال تھا ان کے دل میں اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دلوں میں جوش بھرا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ مولانا کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی کیا کارنامے انجام دیں گے۔ کور کمانڈر نے اپنے سفارشی خط میں صرف اتنا لکھا تھا کہ ان لوگوں سے محاذ کی حدود سے باہر جو بھی مناسب کام ہو وہ لیا جائے۔ خط بھورے لفافے میں بند تھا اور جس افسر نے مکتوب ان کے حوالے کیا تھا۔ اس نے انھیں شاباشی دے کر حوصلہ افزائی کی تھی......بس اتنا ہی......اور کچھ بھی نہیں کہا تھا اس نے۔ محاذ پر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنی۔ انھیں اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ خندقوں میں سپاہیوں کو کھانا پہنچانا اور اگر موقعہ ملے تو دشمن سپاہی کو ٹھکانے لگانا۔ یہی ہمارا کام ہوگا۔ مولانا ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے سوچ رہے تھے۔ نشست پر نیلے پلاسٹک کا غلاف چڑھا تھا۔ مولانا کی پشت میں نشست کی ڈھیلی اسپرنگ چبھ رہی تھی اور ان کے پیروں کے پاس ٹرک کو صاف کرنے کا گندہ کپڑا اور کھجور کی گٹھلیاں پڑی تھیں۔ انھیں اچانک کراہیت کا احساس ہوا اور اس تکلیف کا بھی جو ان کی پشت میں ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خاموش رہے۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔

سڑک کی دونوں جانب شیشم کے درخت تھے۔ ان کے سرسبز پتوں کا سایہ تھا۔ اور نہر کا مٹیالا پانی پُر سکون۔ جس پر مولانا کی نگاہ کبھی کبھی چلی جاتی۔ ان کے چہرے پر اس بچے کی سی معصومیت تھی جس کے دل میں آگ کو دیکھ کر تجسس جاگ اٹھتا ہے۔ جسے آگ کے شعلوں کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے......اور جو جلنے کے بعد کی اذیت سے واقف نہیں ہوتا۔ جس جنگ

میں حصہ لینے وہ جارہے تھے اس جنگ میں کشش تھی، اور ان کے حوصلے اور عزائم کی آزمائش بھی۔ انھوں نے ایک عظیم مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ وطن کی خدمت۔ عوام کی خدمت۔ ان تمام خدمات کی ایک کڑی کشمیر کی جنگ میں ان کی شرکت بھی تھی۔

ٹرک کے پچھلے حصے میں واجد خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے گرد جو رضا کار تھے ان کے لئے اس کے دل میں رفاقت کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کی طرح مستقبل سے بے خبر تھا۔ اس کی اور ان سب کی زندگی کس طرح گزرے گی۔ شب و روز کے مشاغل کیا ہوں گے؟ خطرات کیا ہوں گے؟ واجد نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی خوش گپیوں سے بے خبر تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے ویران کھیت اور کہیں کہیں پر مٹی کے بنے ہوئے ویران مکانات۔ ان گھروں کو دیکھ کر واجد کو نوراں کا خیال آیا۔ شب و روز اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد بھی وہ نوراں کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ وہ یاد آتی اور ہر یاد کے ساتھ وہ تڑپ جاتا اور اس وقت بھی اس کے تصور سے دل میں ٹیس اٹھی۔ وہ نوراں کو اپنی بیوی بنا کر ایسے ہی کسی گھر میں رہ سکتا تھا۔ اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کا نیچی آواز میں پوچھنا کہ وہ اسے چھوڑ کر تو نہیں چلا جائے گا...... اور وہ بھی اسے یاد آیا جب اس کی گرم انگلیاں اس کے چہرے، گردن اور سینے پر سرکتی تھیں اور جب وہ اس کی آغوش میں وصل کی لذت سے سسکنے لگتی تھی۔ اس کے جسم سے جو جنسی تسکین اسے ملتی تھی اس کا بھلانا اس کے لئے ناممکن تھا۔ آتشیں لہریں واجد کے جسم میں اٹھنے لگیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔ جسے بھاگتے ٹرک کے شور میں کسی نے نہیں سنا۔ گھٹنے سکیڑے اور بانہوں پر اپنا سر ٹکائے، جوان واجد ان سب کی نگاہ میں وہ انسان تھا جو قبل از وقت درویش بن جاتا ہے۔ خود فراموشی کے عالم میں واجد کے منہ سے یا خدا اور یا اللہ کی صدائیں رضا کاروں نے سنی تھیں اور چند نے اس کی وہ نمازیں بھی دیکھی تھیں جن میں وہ کھویا ہوتا۔ آنکھیں بند اور ارد گرد کی دنیا سے بے خبر اور کبھی دیر تک سجدے میں پڑا رہتا اور کبھی سبھوں سے بیگانہ وظیفے میں مشغول۔ اس کی موجودگی رضا کاروں کے لئے روحانی تسکین تھی اور وہ بھی مولانا کے علاوہ ان کے درمیان ایک اہم فرد تھا۔

ایک ٹرک ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس میں کچھ فوجی اور غیر فوجی بیٹھے تھے۔ جن کے سر اور بازوؤں پر خون آلود پٹیاں بندھی تھیں۔ پل بھر کے لئے ان کی بے جان آنکھیں مجاہدوں کی آنکھوں سے ملیں۔ جلد ہی وہ ٹرک سڑک کی دھول میں غائب ہو گیا۔

مجاہدین جب میر پور پہنچے تو انھیں وہ قصباتی شہر ہلچل اور شور سے کانپتا نظر آیا۔ شہر کے بیچ جہاں اِدھر اُدھر سے سڑکیں آ کر ملتی تھیں وہاں ان سپاہیوں کا ہجوم تھا جن کے جسم پر وردیاں بوسیدہ اور بے ترتیب تھیں۔ کسی کی شلوار پر خاکی قمیص تھی تو کوئی بغیر فوجی ٹوپی کے خاکی قمیص اور پتلون میں ملبوس تھا۔ ان کا چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے بولنا اور الجھنا عجیب تھا اور یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ فوج کے سپاہی نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی کمانڈر اُن کے ساتھ ہے۔

مولانا غیظ کا ٹرک میر پور میں نہیں رکا اور کچھ دیر میں پیر گلی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ دوپہر آ گئی تھی جلتے ہوئے آسمان سے آگ جیسی دھوپ ہر سو چھا گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلان سے جھاڑیاں دور تک لگی تھیں۔ ان میں پھول نہیں تھے اور ان کی پتیاں دھوپ سے جھلسی ہوئی تھیں۔ سامنے نشیب میں بنجر کھیتوں اور درختوں سے بھری وسیع وادی تھی اور دور سے توپوں کے گرجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وادی میں جو پگڈنڈیاں تھیں ان پر کچھ مسلح افراد کا گروہ آہستہ آہستہ پہاڑ کی جانب آ رہا تھا۔ وہ سب کے سب قمیص اور شلوار میں ملبوس تھے۔ سڑک کے کنارے ایک درخت کے سائے میں چار قبائلی پٹھان کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے نیچے ان کی زلفیں بکھری تھیں اور ان کے قریب ان کی رائفلیں درخت اور سڑک کی منڈیر سے ٹکی تھیں۔ ان کے تھکے چہرے اور گرد آلود کپڑوں میں وہ مشقتیں چھپی تھیں جنھیں انھوں نے دن رات برداشت کیا تھا۔ مولانا غیظ نے ڈرائیور کو ٹرک روکنے کے لیے کہا۔ رضا کار اپنے رہنما کے ساتھ ٹرک سے نکل آئے۔ ایک پٹھان جس کے جسم پر لمبی قمیص کے ساتھ مخملی صدری بھی تھی، اس نے اپنی نیلی آنکھوں سے نو واردوں کو تکا اور بولا۔

''سلام علیکم......آؤ کھانا کھاؤ۔''

مولانا خوش ہو گئے۔ انھوں نے بڑے خلوص سے وعلیکم السلام کہا اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کو ٹرک سے کھانا نکالنے کے لئے حکم دیا۔ جلد ہی منڈیر پر ٹوکریوں میں بھرے نان، دیگچے میں قورمہ اور ایک بڑی سی ہانڈی جس میں دہی تھا سجا دی گئی۔ گٹھریوں میں بندھی تام چینی کی رکابیوں اور چمچوں کو نکالا گیا۔ رضا کار اور پٹھان لذیذ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ سب کچھ جلد ہی ختم ہو گیا۔ سبھوں کے چہرے پر رونق آ گئی۔ مطمئن اور شکر گزار نگاہوں سے سبھوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ویرانے میں اتنا مزیدار کھانا میسر آئے گا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی تھی اور اس کی نعمت۔ سبھوں کے دل میں اس کی رحمتوں کا

اعتراف تھا۔ اس احساس کی وجہ سے سب کے سب ایک دوسرے کے لئے رفاقت محسوس کر رہے تھے۔

''یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' مولانا غیظ نے وادی میں جو مسلح افراد چل رہے تھے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لوگ نکلتا اے۔ رائیفل پکڑ لیا اور سمجھ لیا دشمن کو مار دے گا۔'' ایک پٹھان بولا جس کی عقاب جیسی آنکھوں میں حقارت تھی۔

''لیکن......؟'' مولانا کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

''وہ چڑیا مارنے کا بندوق اور کلہاڑی سے لڑائی لڑنے گیا تھا...... ہاہاہا۔'' پٹھان ہنس رہا تھا۔ اس کے اوپر کے دو دانت ٹوٹے تھے۔

''تو......تو کیا سب ختم ہو گیا؟' پانی سے بھرا گلاس غیظ کے منہ تک آ کر رک گیا تھا۔

وہ انسان جو جنگ کیا ہوتی ہے نہ جانتا ہو۔ فتح اور شکست سے ناواقف ہو۔ جو پسپائی کو بھی کامرانی سمجھتا ہو۔ اس کے لئے دل شکن اطلاع قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن تلخ حقیقت سامنے تھی۔ وادی میں مسلح افراد جنگ کے میدان سے واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ پٹھان جو منڈیر پر بیٹھے تھے وہ بھی جنگ کے میدان سے دور تھے۔ مولانا کو اپنے جسم میں کچھ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''نہیں......نہیں......لڑائی تو ہو رہا ہے۔ پاکستانی پھوج اب لڑ رہا ہے۔ ہم لوگ کسی سے حکم نہیں لیتا۔ ہم دشمن کو دیکھتا ہے پھن اس کا جان لیتا ہے۔ ہم کو کسی کا حکم نہیں چاہئے۔ ہم لوگ اب گھر جاتا ہے۔'' وہ پٹھان جس نے مخملی صدری پہن رکھی تھی وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''اب یہ رائیفل بیکار اے۔ اب دشمن دکھائی نہیں دیتا۔ گولا پھٹتا ہے اور جان چلا جاتا اے۔ تم کو گولی چلانے کا باری نہیں آتا۔ یہ لڑائی اب بیکار اے۔'' وہ پٹھان جس کے دو دانت ٹوٹے تھے اس نے تاسفانہ رائے زنی کی۔ اس کے چہرے پر اپنی بے وقعتی کے احساس سے افسردگی تھی۔ وہ غمگین آنکھوں سے زمین کو تک رہا تھا۔ اسے ان ساتھیوں کا غم تھا جو بغیر کسی جری کارنامے کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لڑائی کے میدان میں جن کی دھجیاں اڑ گئیں اور وہ ان کی موت کا بدلہ نہیں لے سکا۔ اس دشمن کو نہیں دیکھ سکا جو میلوں دور سے گولے چلا رہا تھا۔

ان پٹھان جنگ جوؤں کے لئے لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ نہ ان کی جیت ہوئی اور نہ ان کی

ہار۔ نہ ان کی پگڑیوں میں دلیری کی کلغیاں تھیں اور نہ ان کی زبانوں پر غیر معمولی معرکوں کی داستانیں۔ سرینگر کے گردونواح میں جب ان کا منظم فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ اسی تیزی سے پیچھے ہٹے جس تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ ان سب کو اس زیاں کا احساس تھا جس کی تلافی ناممکن تھی۔ ان سب کے پاس ٹوٹا ہوا خواب تھا۔ دلوں میں وہ پشیمانی تھی جس کا اظہار وہ اپنے قبیلے کے سامنے نہیں کر سکتے تھے۔

واجد کو سبھی کچھ بہت دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ درختوں اور چٹانوں کے سائے میں بیٹھے وہ لوگ جن کے ساتھ وہ کھانے میں شریک ہوا تھا۔ دور سامنے سرمئی پہاڑ اور اس سے بھی پرے کہیں سے آتی توپوں کی گرج۔ مولانا غیظ کا جوش و خروش اور اب ان کی مایوسی۔ بار بار اس کی نگاہ ان رائفلوں پر جاتی جنھیں قبائلی پٹھانوں نے ادھر ادھر رکھ چھوڑا تھا۔ کیا اسے بھی رائفل چلانے کے لئے کہا جائیگا، اور کیا اس کی چلائی ہوئی گولیوں سے دشمن مارا جائے گا؟ اس سوچ سے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اسے خوشی ہوئی۔

''مجاہدو...... ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ ہم لوگ نماز پڑھ کر فتح کے لئے دعا مانگیں گے۔'' مولانا نے اپنی موٹی کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔

وہ صراحیاں اور گھڑے جن سے سبھوں نے پانی پیا تھا، وہ اب خالی تھے۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ مجبوراً سبھوں نے تیمم کیا۔ اس کے بعد واجد نے اذان دی۔ اس کی آواز میں نغمگی، دبدبہ اور خدا سے قربت کی خواہش تھی۔ اذان دینے والا انتہائی خلوص سے خدا کی عظمت اور اپنے ایمان کا اعلان کر رہا تھا۔ اذان سننے والوں کو بھی اپنے دلوں میں یہی صدا گونجتی محسوس ہوئی۔ ان سب کو ایک عظیم اپنائیت کا احساس ہوا۔

نماز میں مولانا غیظ امام بنے اور جب آخر میں دعا مانگی جانے لگی تو اس وقت بیشتر کے دلوں میں حوصلہ اور ہمت تھی۔ اس وقت اپنی جانیں قربان کر دینے کے لئے کوئی انھیں کہتا تو وہ بغیر کسی جھجک کے ایسا کر دیتے۔ نماز کے بعد پٹھان وہیں ایک گھنے درخت کے سائے میں دریاں بچھا کر پڑ گئے۔ مولانا غیظ کا بھی دل چاہا کہ ان کی طرح آرام کریں۔ پیر گلی کی چوٹی پر بلندی کی وجہ سے اتنی گرمی نہیں تھی۔ ہوا کی گرمی کو جیسے نیچے وادی اور ڈھلان پر اُگے درختوں نے جذب کر لیا تھا۔ لیکن مولانا کو منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی اور وہ اب اتنی دور بھی نہیں تھی۔ انھیں بتا دیا گیا تھا کہ میر پور سے جو سڑک پونچھ کو جاتی ہے اسی پر سیدھے جانا ہے۔ دوسرا کوئی

اور راستہ نہیں ہے اس لئے گم ہونے کا امکان نہیں ہوگا۔ پیٹ بھر کھانے کی وجہ سے جو غنودگی انھیں محسوس ہو رہی تھی اسے انھوں نے ہمت کی کمی سمجھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کسی کمانڈر کی طرح سامنے دیکھنے لگے۔ سڑک ڈھلان پر سے ہوتی ہوئی وادی سے گزرتی تھی اور اس کے بعد دور پہاڑوں میں گم ہو جاتی تھی۔

مولانا نے سفر دوبارہ شروع کرنے کا حکم دیا۔ خستہ ٹرک ایک بار پھر ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر رینگنے لگا۔ رضا کار جلد اس مقام پر پہنچے جہاں راستہ پر ایک بند گیٹ تھا اور جس کے ساتھ سنتری باکس میں رائفل بردار سپاہی کھڑا تھا۔ اس نے ٹرک کو آگے جانے سے روک دیا۔ کچھ فاصلے پر چند سپاہی نئی سڑک بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے جسموں پر بنیائن اور خاکی پینٹ تھی۔ جہاں نئی سڑک بن رہی تھی اس کے ساتھ چڑھائی پر گاؤں ویران تھا۔ اس سے کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں چند خیمے، ایک ایمبولنس اور دو ٹرک کھڑے تھے۔

مولانا ٹرک کی سامنے کی نشست سے اپنی برچھی سمیت کودے اور انھوں نے محافظ سپاہی کو وہ خط دکھایا جسے وہ کور کے دفتر سے لے کر آئے تھے۔

''دلیر بھائی...... سلام علیکم! میں تمہارے افسر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' مولانا کی آواز میں سنجیدگی اور اعتماد تھا۔ ان کی آنکھیں سپاہی کی آنکھوں میں گڑی تھیں اور ان کا سینہ تنا تھا۔ سپاہی مولانا کے ہاتھ میں خط دیکھ کر چونک پڑا۔ اگر اس کی نگاہ لفافے کی مہر پر نہیں پڑتی تو عین ممکن تھا وہ مولانا کو دھتکار کر بھگا دیتا۔ اس نے مولانا کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر چند لمحوں تک دیکھنے کے بعد وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''ہتھیار ڈال دو اور یہیں رُکو۔ اس گیٹ کے آگے نہیں جانا جب تک میں حکم نہیں دوں۔'' یہ کہہ کر سپاہی نے سنتری باکس میں سے فون اٹھا کر کسی کو اس اہم لفافہ کی اطلاع دی۔ جواب سننے کے بعد اس نے لفافہ مولانا کو واپس کر دیا اور ایک خیمے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''سامنے میجر صاحب کا دفتر ہے۔ صرف تم وہاں جاؤ گے باقی لوگ یہیں رکیں گے۔''

مولانا غیظ تم کے لفظ سے مخاطب کئے جانے پر ذرا چونکے۔ لیکن یہ سوچ کر انھوں نے اطمینان کر لیا کہ اسلامی اخوت کے ناطے سب لوگ برابر ہیں۔ افسر کے خیمے کے باہر جو سپاہی چپراسی کے فرائض انجام دے رہا تھا اس نے مولانا غیظ کو کھڑا رہنے کے لئے کہا اور ان کے

ہاتھ سے لفافہ لے کر خیمے کے اندر گیا۔

''اندر جاؤ'' اسی سپاہی نے خیمہ سے باہر آ کر حکم دیا۔

میجر دارائی بارہ فیلڈ رجمنٹ کی سی کمپنی کا کمانڈر تھا۔ اس کے ذمہ ان دنوں سڑکوں کی مرمت اور اس سڑک کی تعمیر بھی تھی جو سامنے بن رہی تھی۔ یہ سڑک پاس کے گاؤں تندر سے پنجنی ہوتی ہوئی کالا دیو پہاڑ تک جاتی تھی۔ اس پہاڑ سے تین میل آگے گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ کس مصلحت کے تحت اسے یہاں ڈیوٹی دی گئی تھی، میجر دارائی سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ تنہائی سے عاجز تھا اور اسے مسلسل اکتاہٹ رہتی تھی۔ گٹھے ہوئے جسم اور لمبے تڑنگے میجر دارائی کے چہرے پر مہاسوں کے داغ تھے اور وہ چہرے پر بہتے پسینہ کو مسلسل اپنے سفید رومال سے خشک کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک چوبی میز تھی جس پر فائلیں قرینے سے رکھی تھیں اور ان کے علاوہ پانی کا جگ اور ایک گلاس تھا۔ مولانا غیظ کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔ چوبی کرسی سے اٹھ کر اس نے انھیں سیلوٹ کیا اور مولانا کے سلام علیکم کا جواب دیتے ہوئے میجر دارائی نے انھیں آغوش میں لے لیا۔ مولانا کا سر میجر دارائی کے سینے سے لگا تھا اور انھیں اس کے پسینہ کی کھٹی بو محسوس ہو رہی تھی۔ دارائی کی انگلیاں مولانا کی فربہ پشت میں گڑی تھیں۔ مولانا نے خواب میں بھی ایسی گرم جوشی کا تصور نہیں کیا تھا۔ ان کے بازوؤں کا حلقہ بھی میجر دارائی کے گرد تنگ ہونے لگا اور ان کے گالوں پر حیا کی سرخی آ گئی۔ کچھ دیر بعد جب دونوں علیحدہ ہوئے تو میجر دارائی انھیں معنی خیز نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا۔

''مجھے آپ جیسے دلیر آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس سڑک کے بنانے میں ہماری مدد کیجیے تاکہ میں اپنے سپاہیوں کو وہاں بھیج سکوں جہاں جنگ ہو رہی ہے۔''

''ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ آپ جو فرمائیں گے ہم وہی کریں گے۔ کیا ہم جنگ کے میدان میں کوئی کام نہیں کر سکتے؟'' مولانا غیظ نے اپنی نرم داڑھی کو کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''کون سا کام؟'' میجر کی بڑی بڑی آنکھیں مولانا کے بھولے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''جی! زخمیوں کو پانی پلانا۔ ان کی مرہم پٹی کرنی اور انھیں محفوظ مقام پر پہنچانا۔''

''چہ...... چہ...... چہ۔ اس کام کو سپاہی انجام دیتے ہیں اور وہی زخمیوں کو فوجی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں، جو اس وقت بٹالین کے ساتھ فرنٹ پر موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ جیسا کہیں گے وہی ہوگا۔'' مولانا غیظ کی بجھی ہوئی آواز میں ناامیدی تھی۔

''اور ہاں...... آپ میں کوئی بھی کیمپ کی حدود سے باہر نہیں جائے گا۔ سولین بس اسی کیمپ تک آسکتے ہیں۔ اس کے آگے وار زون ہے......''

مولانا نے اثبات میں سر ہلا کر ہامی بھر لی۔ گو وہ بد دل ضرور ہوئے پھر بھی انھیں میجر دارائی کی خوش اخلاقی کی وجہ سے قربت کا احساس ہوا۔ انھیں اور ان کے ساتھیوں کو پاس کے تندر گاؤں کے خالی گھروں میں رہنے کی اجازت دیدی گئی اور اسی دن سے وہ سب کے سب سڑک کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ ان کا نگراں ایک حولدار تھا جو انھیں بڑے بڑے پتھروں کو توڑ کر سخت مٹی کے ساتھ بچھانے اور ان پر رولر چلانے کی ہدایتیں دے رہا تھا۔ چونکہ کچی سڑک بنائی جارہی تھی اس لئے کولتار اور دیگر لوازمات کی ضرورت نہیں تھی۔

مولانا غیظ اور ان کے ساتھیوں کو یہ کام کافی سخت محسوس ہوا۔ لیکن یہ محنت کسی عظیم مقصد کے لئے کی جارہی تھی۔ اس لئے سب خوشی کے ساتھ اس مشقت کو برداشت کرنے لگے۔ واجد بھی ان کے ساتھ تندہی سے مشغول رہتا۔ ان کے ساتھ دال روٹی کھاتا اور مولانا کی امامت میں نمازیں پڑھتا۔ دیگر اوقات میں وہ رضا کاروں سے الگ تھلگ خاموش اور اپنے آپ میں گم زندگی گزارنے لگا۔ کبھی محض تجسس کی وجہ سے کوئی شخص اس سے کچھ پوچھتا تو وہ چند الفاظ میں ٹال دیتا۔ ''اپنی خواری اور اذیتوں کا ذکر میں کیسے کرسکتا ہوں اور نوراں کی یاد جو دھیمی آگ کی طرح میری روح میں سلگتی رہتی ہے وہ ایک ایسا راز ہے جس کی بھنک بھی ان مجاہدوں کو مل گئی تو یہ لوگ بھی مجھے سزائیں دیں گے۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر ہے۔'' واجد خود کو سمجھاتا۔

مجاہدین واجد کا احترام کرتے تھے۔ اس کی مترنم اذان کی تاثیر سے وہ جھوم جاتے۔ اس کی افسردہ نگاہوں میں انھیں معبودِ حقیقی کی تلاش نظر آتی۔ یہ خدا کے قریب ہے اسے اپنے آپ میں گم رہنے دو۔ سب یہی سوچتے۔ ہر روز جل جل کر کڑی دھوپ میں کام کرنے سے انھیں اپنے اجتماعی حوصلے اور توانائی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی با مقصد زندگی کے تصور سے انھیں اپنی انا فولاد بنتی محسوس ہوتی تھی۔ ایمبولنس گاڑی ہر روز محاذ پر سے زخمی سپاہیوں کو لے کر آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے زخموں کے درد سے چیختے ہوئے آتے۔ ان کی آہ و بکا اور خون آلودہ وردیوں کو دیکھ کر مجاہدوں پر خاموشی چھا جاتی اور وہ خوف زدہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے۔ واجد پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ گناہ کا شدید احساس ساتھ ہی نوراں سے اس کی محبت اور اس کے جسم کی خواہش اسے مضطرب رکھتی۔ اس کی دنیا میں ایک ہلچل تھی۔ اس کی آرزو تھی کہ کوئی آواز آسمان سے آتی اور

اس سے کہتی کہ وہ بخش دیا گیا ہے۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ آرزوئیں، تمنائیں اور خواہشات جو کسی ماورائی شے سے تسکین طلب کرتی ہیں ان کی تسکین اسی دنیا میں ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتی۔ پھر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے جو آسان نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ اس حد تک پریشان ہو جاتا کہ اسے موت کی طلب ہونے لگتی۔

رات کے وقت عشا کی نماز کے بعد رضا کار چارپائیوں پر مولانا غیظ کے گرد بیٹھ کر ان کی عاقلانہ گفتگو سنتے۔ تاروں کی مدھم سی روشنی میں جاننا مشکل تھا کہ کون جاگ رہا ہے اور کون سو رہا ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ دن بھر کی مشقت اور رات کے وقت پیٹ بھر کر دال روٹی کھانے کے بعد کئی رضا کار خراٹے بھرنے لگتے۔ لیکن مولانا پر اس بے ادبی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی بلند آواز جاگنے والوں کے دلوں کو گرم کر دیتی تھی۔ بلند پہاڑ اور ان کی ڈھلان پر ساکت درخت اور دور سے آتی توپوں کی گرج جو اس وقت اور بھی ہیبتناک ہو جاتی تھی، پھر بھی ان سب کا خوف کچھ کم ہو جاتا۔ مولانا بولتے وقت کبھی نیم دراز ہو جاتے اور کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ ان کی سحر بیانیاں اپنا اثر دکھاتیں۔

"جو اس جنگ میں مارا گیا وہ شہید ہو گیا اور اسے جنت مل گئی۔ جو زخمی یا اپاہج ہو جاتے ہیں ان پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ اپنی مجبوری کی وجہ سے خدا کو بار بار یاد کرتے ہیں اور پھر اس کی مدد انھیں ملتی ہے۔ اس تندر گاؤں کو دیکھو۔ یہاں کے رہنے والے بھاگ کر کسی غیر جگہ میں پناہ گزیں ہیں۔ وہاں روزی کمانے کے لئے وہ شب و روز محنت کرتے ہیں۔ اس طرح وہ توانا اور بہتر انسان بن رہے ہیں۔"

واجد ان کی گفتگو کو بڑے غور سے سنتا۔ ان کے الفاظ اس کے دل پر گہرا اثر کرتے۔ وہ عقیدت اور احترام سے ان کے ہر لفظ کو ذہن نشیں کرتا۔ مولانا غیظ کو اگر اس کی محویت کا احساس ہو جاتا تو وہ اور جوش میں آ جاتے، ان کی خرد افروزی مزید نمایاں ہوتی۔

"رات کے اندھیرے میں نہ یہ ہیبت ناک پہاڑ اچھی طرح نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان پر اُگے پیڑ۔ سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بس خدا ہوتا ہے اور اس کی خدائی، اور یہ بھی اسی خدا کی قدرت ہے جو اس ویرانے میں ہمیں دو وقت کی روٹیاں مہیا کر رہا ہے۔ گر ہم ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھیں تو ہمیں وہاں شفاف اور تازہ ہوا میں خدا سے قربت کا

احساس ہوگا، جبھی رشی جوگی پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنا بسیرا کرتے ہیں۔''

ایسی باتیں ساجد کو بہت متاثر کرتیں اور اس کی روح میں ایک نئی روشنی جلنے لگتی۔ کبھی کبھی مولانا غیظ کی عاقلانہ گفتگو میں میجر دارائی کے اردلی کی آمد سے مداخلت ہوتی۔ وہ انھیں اپنے افسر کے پاس لے جاتا۔ میجر دارائی اور مولانا کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو چکا تھا جو رات کی تاریکی میں پروان چڑھتا۔ مولانا کی پُر مغز باتیں میجر دارائی کے علم میں اضافہ کرتیں اور میجر اپنے فوجی کارناموں کی داستانیں سنا کر مولانا غیظ کے شوق جہاد کو تر و تازہ رکھتا۔ وہ اس درجہ ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے انھوں نے ماضی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کیمپ کے شب و روز میں جو المیہ ہونے والا تھا اس سے ایک رات قبل مولانا غیظ کرسی پر میجر دارائی کی چارپائی کے قریب بیٹھے تھے۔ وہ چارپائی پر پسرا تھا اور اس کے سلیپنگ سوٹ کی قمیص کے بٹن کھلے تھے جس سے اس کا چکنا سینہ نمایاں تھا۔ اگر پلنگ پوش سفید نہیں ہوتا تو وہ اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے اندھیری رات کا ہیولا لگتا۔ آج بہت دنوں کے بعد ہوا چل رہی تھی اور درختوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں...... کبھی تیز اور کبھی مدھم...... میجر دارائی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ مولانا غیظ کی فلسفیانہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیمپ کے دیگر افراد سو رہے تھے اور محافظ سنتری دور کیمپ کی حدود کے پاس تھے۔ مولانا غیظ کے ذہن میں ان کے افکار کی ریل پیل تھی۔

''میجر صاحب ذرا سوچیں۔ گھی جیسے ایک قطرے سے انسان جیسی پیچیدہ شے وجود میں آتی ہے اور اس ایک قطرے کے بننے کے لیے خون کے سو قطروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سب عظیم معجزے نہیں تو اور کیا ہیں؟''

''واہ واہ۔ کیا پتے کی بات کہی ہے۔ کاش کسی معجزے سے یہ سارے کافر گھی کے قطروں میں تبدیل ہو جاتے پھر یہ جنگ بھی فوراً ختم ہو جاتی اور ہماری فتح کے شادیانے بجتے۔'' میجر دارائی نے مولانا کی چکنی ران کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں میجر صاحب! قدرت کے ہر کارنامے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ گر کفار کے فوجی گھی کے قطروں میں تبدیل ہو جائیں گے تو ہمارا ایمان اور ہماری جرأت کو للکارنے والا کون ہوگا۔ ہم اپنی بہادری کس کے سامنے دکھائیں گے۔ سچ تو یہ ہے میجر صاحب کہ ہماری اور آپ کی محبت پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہمیں ہی حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔''

مولانا غیظ نے میجر دارائی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"بالکل درست۔ ہم اور آپ ایک ہی ہیں مولانا غیظ۔ آیئے ہمارے پاس۔"

مولانا نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ میجر نے مسہری کا پردہ گرا دیا۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت مولانا غیظ ایک درخت کے سائے میں چارپائی پر اونگھ رہے تھے۔ جو سڑک تعمیر ہو رہی تھی وہ ویران تھی اور اس پر رولر دھوپ کی حدت سے دہک رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب مٹی کا ڈھیر اور وہ پتھر تھے جو چٹانوں سے توڑے گئے تھے۔ آج مولانا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوب مشقت کی تھی۔ جس کے بعد انھوں نے ڈٹ کر روٹی، گھی اور بھنے پیاز میں ڈوبی دال کے ساتھ کھائی تھی۔ پھر لسی کے کئی گلاس انھوں نے پیئے۔ اونگھتی آنکھیں کچھ دیر تک پہاڑ، کچھ فاصلے پر درختوں کے سائے میں سفید خیمے اور ان کے پاس کھڑی ایمبولنس پر کشید سرخ کراس پر سستی سے منڈلائیں۔ دھندلا سا خیال انھیں آیا کہ ایمبولنس پر عیسائیت کا سرخ نشان اسلام کی توہین ہے۔ پھر انھیں گہری نیند آ گئی اور وہ زور زور سے خراٹے لینے لگے۔ آج ہوا تیز تھی۔ کچھ زیادہ ہی شور تھا اس کے اڑنے میں۔ درخت کی ٹہنیاں بھی بے چین سی ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ درخت سے زرد اور موٹا سا زہریلا سانپ چارپائی پر گرا اور مولانا کے گال کو ڈس کر چارپائی سے اترا اور قریب کی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ مولانا کی آنکھیں لحہ بھر کے لیے ذرا سا کھلیں۔ "شریر میجر صاحب۔" ان کے منہ سے نکلا پھر وہ موت کی نیند سو گئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد وہ مردہ پائے گئے۔ رضا کاروں میں کھلبلی مچ گئی۔ کیمپ کے دیگر افراد بھی پریشان ہو گئے۔ میجر دارائی بھاگا ہوا آیا۔ اس ویرانے میں جس شخص کی رفاقت اسے میسر آئی۔ جس نے اس کے ذہن اور جسم کا تناؤ دور کر دیا، وہ اس طرح اچانک دنیا سے رخصت ہو جائے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ فوج کی وہ زندگی جس میں ہر وقت چستی، مرنے مارنے کے لئے ہر دم تیار رہنا، ان سب سے وہ دور ہو چکا تھا۔ عموماً وہ میدان کارزار سے دور ہی رہا تھا۔ اسے ڈیوٹی کچھ اس طرح کی دی جاتی تھی جس میں فوجی خندق اور توپ کے پھٹتے گولوں کے قریب جانے کی اسے نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک سست زندگی کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ جس میں اکثر اکتاہٹ اسے محسوس ہوتی۔ مولانا غیظ نے اس اکتاہٹ کو دور کر دیا تھا۔ جس

وقت اس نے ان کی موت کی خبر سنی وہ دوپہر کی نیند پوری کر چکا تھا پھر بھی کچھ غنودگی اس پر تھی۔ موت کی خبر کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک جوان شخص کو بغیر کسی وجہ کے موت آجائے گی اس کے تصور میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کا اردلی یہ خبر لایا تھا اور پریشان سا پاس کھڑا تھا۔ اسے دارائی چند لمحوں کے لئے خاموش تکتا رہا، کھلے ہوئے منہ سے اس کے زرد دانت جھانک رہے تھے۔ اردلی کو محسوس ہوا کہ اس کا افسر ڈر گیا ہے چونکہ اسے بھی موت خیمہ کے باہر کھڑی نظر آرہی ہے، اور یہ سچ بھی تھا۔ میجر دارائی اٹھا اور بغیر کپڑوں کو تبدیل کئے خیمہ کے باہر چلا گیا۔ جب وہ مولانا کی لاش کے پاس پہنچا تو اس کی گھبراہٹ اور ہیبت نمایاں تھی۔ اس نے مولانا غیظ کے سینے پر کان رکھا۔ وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ مولانا کی سانس کی آمدورفت بند تھی اور جھنجوڑنے پر بھی وہ نہیں جاگے۔ ڈاکٹر محاذ پر تھا وہاں پر مولانا کو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

''یہ کیسے ہو گیا؟'' میجر دارائی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خدا کا حکم۔'' واجد نے غمگین لہجے میں مختصر جواب دیا۔ اس کی نگاہیں مولانا غیظ پر جمی تھیں۔ ان کے گول چہرے پر کسی انتشار کی علامت نہیں تھی۔ اس پر ایک عجیب سا بھولا پن تھا۔ ایک بچے جیسا بھولا پن جس نے مذاقاً اپنے چہرے پر سیاہ داڑھی چپکا لی تھی۔ مولانا کی بے چین آنکھوں میں اس وقت کوئی آگ نہیں سلگ رہی تھی۔ سب کچھ سے ماوراء وہ بے جان کہیں دور دیکھ رہی تھیں۔ ان کی موت کا واجد کو سخت صدمہ تھا۔ اس کی نگاہ میں مولانا سیدھے سادے انسان تھے۔ جن کے پاس سچا ایمان تھا۔ جبھی وہ مہاجروں کی ہر قسم کی امداد کے لئے مستعد رہتے تھے۔ واجد کو اس کا بھی احساس تھا کہ ان کی مدد کے بغیر وہ زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ انھوں نے اسے امید دی تھی۔ زندگی کا مقصد بتایا تھا اور انھوں نے اسے احترام دیا تھا۔ چونکہ جب وہ امامت نہیں کرتے تو یہ فرض واجد کو سونپ دیتے تھے۔ ''میں ان کے عاقلانہ الفاظ اور ان کے خطبوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔'' واجد سوچ رہا تھا۔ اس نے میجر دارائی کی آواز سنی۔

''ہمیں مولانا صاحب کو جلد دفن کرنا چاہئے ورنہ گرمی کی وجہ سے ان کی لاش گلنے لگ جائے گی۔''

''مولانا صاحب کی خواہش تھی کہ وہ جنگ کے میدان میں دفن کئے جائیں۔'' ایک دبلے پتلے اور لمبے رضاکار نے سنجیدگی سے اطلاع دی۔ اس خیال سے کہ مولانا کی فضیلت اسے آجائے، اس نے مولانا کی ٹوپی پہن لی تھی۔

''اس وقت سارا کشمیر جنگ کا میدان ہے۔ ہم انھیں یہیں ان کی برچھی کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں تاکہ وہ دوسری دنیا میں کافروں کے ساتھ جنگ کر سکیں۔'' میجر دارائی نے کہا۔

مجاہدین فوراً مان گئے۔ مولانا کو نہلا دھلا کر ایک صاف چادر میں لپیٹ کر چارپائی پر ان کی برچھی سمیت لٹا دیا گیا۔ چند لمحوں کے لئے واجد، میجر دارائی اور اس کی پلاٹون کے سپاہی خاموش کھڑے رہے۔

ہوا تھم گئی تھی۔ وادی اور پہاڑ پر درختوں کے جھنڈ ساکت تھے۔ سورج پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ چکا تھا اور دھوپ بھی کمھلاسی گئی تھی اور زیر تعمیر سڑک کی ویرانی مولانا غیظ کی یاد دلا رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں غیظ اپنے جوش اور ولولے کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ کچھ دیر بعد مجاہدوں اور فوجیوں نے وضو کیا پھر صف بندی کی۔ نماز جنازہ واجد نے پڑھائی۔ آج اس کی الم ناک آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ سورۃ کے الفاظ کی ادائیگی میں اس نے دل و جان کا اندوہ سمو دیا تھا۔ دیگر افراد کی طرح میجر دارائی بھی مسحور ہو گیا۔

اس دن کے بعد میجر دارائی کے دل میں واجد کے لئے احترام آ گیا۔ دارائی کو یقین ہو گیا کہ واجد سارے مجاہدین سے مختلف ایک متبرک انسان ہے۔ اسے دوسروں کی طرح سڑک پر مشقت نہیں کرنی چاہئے۔ اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ وہ سڑک پر کام کرنے والوں پر نگاہ رکھے اور ان کے حوصلے بلند کرے۔ واجد کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ جہاد میں حصہ لے رہا تھا جس میں ہر کام متبرک تھا۔

کبھی کبھی دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کے لئے ادھر آ نکلتے۔ لوگ پناہ کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگتے۔ لیکن واجد پر کسی قسم کی گھبراہٹ طاری نہیں ہوتی۔ وہ کوئی سورۃ پڑھ کر خود پر دم کرتا پھر آرام سے چلتا ہوا کسی گڈھے میں جا کر چھپ جاتا۔ اسے یقین تھا کہ گر موت کو آنا ہوا تو اس کی ہر احتیاط کے باوجود ضرور آئے گی۔ وہ اکثر سوچتا کہ موت جتنی جلدی آئے بہتر ہے۔ جس کشمکش سے اس کی زندگی اجیرن ہو رہی تھی اس سے جتنی جلدی نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔ جو سڑک بن رہی تھی وہ درختوں کے جھنڈ اور پہاڑ کی کھڑی چڑھائی کے ساتھ گذرتی تھی۔ جب کبھی بھی بم گرے اس سڑک کا نقصان نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی مارا گیا۔

چند میل کے فاصلے پر جنگ پوری شدت سے لڑی جا رہی تھی۔ خبر گرم تھی کہ پہاڑ کی دوسری جانب جو وادی تھی اس سے گزر کر دشمن کوٹلی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اور اس کا ایک بریگیڈ

کالا دیو پہاڑ پر سے ہوتا ہوا پنجنی پہنچنا چاہتا ہے۔ اس طرح نہ صرف میرپور اس کے زیرنگیں ہو جاتا بلکہ راولپنڈی بھی اس کی زد میں آجاتا۔ محاذ سے آنے والے زخمیوں کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور محاذ پر کمک تیزی سے پہنچائی جا رہی تھی۔ دھول اُڑاتے ٹرک آتے اور ان سے فوجی اپنی رائفلیں اٹھائے کود کر باہر آجاتے۔ افسروں کے حکم پر ان کی صف بندی ہو جاتی اور وہ اس کے ساتھ اس پہاڑی راستے پر چل پڑتے جو محاذ کو جاتا تھا۔ ان سب کو ادھر جاتے دیکھ کر واجد کو ان سے عقیدت محسوس ہوتی۔ ہر نماز کے بعد وہ فتح کی دعائیں مانگتا۔ اس کی پُرسوز صدا سے کبھی کبھی زخمیوں کی آہ و بکا میں بھی کمی آجاتی۔

جنگ کیمپ کے قریب نہیں آئی۔ کیمپ والوں کو دشمن نظر نہیں آیا۔ انھیں یقین آنے لگا تھا کہ واجد صاحب کرامات ہے۔ اس کی دعاؤں کا اثر تھا جس کی وجہ سے دشمن دور رہا۔ ایک دن ایک سپاہی واجد کے پاس آیا اور اس نے اپنی بیمار ماں کے لئے دعا مانگنے کے لئے کہا۔ واجد نے نہ صرف دعا کی بلکہ ایک تعویذ بھی سپاہی کی ماں کے لئے اسے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد سپاہی نے واجد کو بتایا کہ اس کی ماں تندرست ہو گئی ہے۔ اس نے مارے احترام کے واجد کے ہاتھ چومے اور اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔

کچھ دنوں کے بعد جب دھوپ میں شدت کی تمازت تھی اور واجد دیگر رضاکاروں کے ساتھ پتھر کو ایک ہتھوڑے سے توڑ رہا تھا تو دور کسی گاؤں سے کچھ لوگ ایک عورت کو خچر پر بٹھا کر لائے۔ عورت جوان تھی۔ وہ زور زور سے گردن ہلا کر بے معنی باتیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا خاوند بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی کی ایسی حالت پہلے بھی ہوتی تھی۔ لیکن آج جب وہ میرپور جا رہے تھے تو راستے میں اس کی حالت بگڑ گئی۔ کسی سپاہی نے واجد کی بزرگی کی اطلاع انھیں دی تھی اس لئے وہ یہاں آگئے ہیں۔ وہ سب کے سب کیمپ کے باہر گیٹ پر کھڑے سپاہی سے اندر جانے کے لیے منتیں کر رہے تھے۔ میجر دارائی کا حکم تھا کہ کیمپ کے قریب کوئی غیر فوجی جب آتا ہے تو اسے ضرور اطلاع ملنی چاہئے۔ اسے جب خبر ملی تو وہ اپنے دفتر سے باہر آیا اور واجد کو اس نے کہا کہ خبطی عورت کے لئے کچھ کرے۔ عورت کیمپ کے اندر اسی درخت کے نیچے لائی گئی جہاں مولانا غیظ کی موت ہوئی تھی۔ ان کی قبر پاس ہی تھی۔ جب واجد گاؤں والوں کے پاس آیا تو عورت کے مریل بارِیش خاوند نے اس کے پیروں کو پکڑ کر التجا کی۔

''شاہ جی۔ اللہ والے ہو اس بدنصیب کے لئے کچھ کرو۔'' بولنے والا پُر امید نگاہوں سے واجد کو تک رہا تھا۔ ارد گرد جو لوگ کھڑے تھے ان کی نگاہیں بھی واجد پر جمی تھیں۔ سبھوں کے لئے پاگل عورت ایک تماشہ تھی اور وہ معجزے کے منتظر تھے۔ کچھ دیر تک واجد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ لیکن جس خدا نے اس کی مدد کی تھی اس سے اسے امداد کی امید تھی۔ عورت کا دوپٹہ اس کے سینے پر سے ڈھلک گیا تھا اور میلی شلوار کے پائنچے اس کے ٹخنوں تک آ گئے تھے۔ وہ جھوم رہی تھی اور بار بار زمین پر ہاتھ مار کر ''میرا دل بھر دے'' کا ورد کر رہی تھی۔

واجد نے اس عورت کے قریب پہنچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''اے خدا میری مدد کر۔ اس عورت کو شفا دے۔ تیرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔'' اس دعا کے ساتھ واجد کو خود اعتمادی کا احساس ہوا، جیسے خدا کی برکتیں اس کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ ہوا کی گرمی اچانک ختم ہو گئی۔ جو لوگ اسے تک رہے تھے ان کا وجود نہیں رہا۔ اس وقت واجد کے سامنے وہ بلا تھی جو عورت کی کھوپڑی میں گردش کر رہی تھی۔ اس نے عورت کے سر کے خشک بالوں کو پکڑ کر زور سے کھینچا اور پھر اس کے سر کو اپنے سخت ہاتھوں سے دبانے لگا۔ وہ زیر لب سورۃ فاتحہ پڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کی سختی بڑھتی جاتی تھی۔ پھر اس کی مٹھیاں بند ہو گئیں اور اس کا چہرا غصہ سے سرخ ہو گیا۔ عورت کی آنکھوں کی وحشت غائب ہو گئی اس نے مجبور نگاہوں سے واجد کو لمحہ بھر کے لئے تکا۔ اس کی گھنی پلکیں، چوڑی پیشانی، کھڑی ناک جہاں موتیوں جیسے پسینے کے قطروں کے درمیان ایک سرخ مسہ ننھے سے یاقوت کی طرح دمک رہا تھا، دیدہ زیب داڑھی اور چہرے پر جلال، واجد کا ہر نقش عورت کے دل میں اتر گیا۔ عورت کے منہ سے دھیمی سی سسکی نکلی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی چیخ و پکار بند ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پیر کی والہانہ حرکتیں ختم ہو گئیں۔ اس نے گردن میں جھولتے زرد دوپٹے سے اپنا سینہ ڈھک لیا۔

''واہ......'' بھیڑ میں سے آواز بلند ہوئی۔

''دیکھ یار! میں نہ کہتا تھا اس عورت پر جن سوار ہے۔ دیکھا اس جن کو کس طرح استاد واجد نے اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔'' ایک مجاہد بولا۔

''بھائی...... پیر کو استاد مت کہو۔'' اس کے ساتھی نے اعتراض کیا۔

''جا...... اپنے خاوند کے پاس جا۔'' واجد نے عورت کو حکم دیا۔ ''اور تو......'' واجد اپنی بند مٹھی پر گرجا۔ ''......کبھی اس عورت کے قریب بھی نہیں پھٹکنا۔'' ساتھ ہی اس نے مٹھی کھول دی

اور غصے سے خلا میں دیکھنے لگا۔ جیسے خوفزدہ جن کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ عورت دزدیدہ نگاہوں سے واجد کو دیکھتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس چلی گئی۔ جو لوگ پاس کھڑے تھے وہ تعریف اور احترام کی نگاہوں سے واجد کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ بہت خوش۔ جب اس عورت کے سر پر واجد نے ہاتھ رکھا تو اس کے دل میں کوئی شہوانی خواہش نہیں جاگی۔ اس عورت کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کا گناہ اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ وہ پاک اور متبرک ہو چکا تھا۔ خدا نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اس کی عبادتیں قبول ہو گئی تھیں۔ ''اے خدا تو رحیم ہے۔ کریم ہے۔ اپنے بدنصیب بندوں کا سچ مچ نگہباں ہے۔''

واجد بڑبڑا رہا تھا اور آنسوؤں سے نم اس کا چہرہ دھوپ سے دمکتے آسمان کی جانب تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں لرزش تھی۔ کیف و وجد کی ایک ندی تھی جو اسے بہائے لئے جا رہی تھی۔ آس پاس کھڑے لوگ ڈر گئے۔ ان میں سے ایک پکارا۔

''نعرۂ تکبیر......''

''اللہ اکبر......' سبھوں نے مل کر آواز بلند کی۔ جوابی نعرے میں میجر دارائی کی آواز سب سے اونچی تھی۔

واجد پر دیر تک وجدانی کیفیت رہی۔ جب اسے اردگرد کا کچھ احساس ہوا تو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کیمپ کے کچن کے پاس جا کر اس نے پانی سے بھرے ڈرم سے لوٹے میں پانی بھرا اور وضو کرنے کے بعد اپنی کوٹھری میں آ کر شکرانے کی نماز پڑھنے لگا۔ آج کی نماز میں سرشاری تھی۔ خالق حقیقی سے اس قربت کا احساس تھا جس کے لئے وہ تڑپتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ نمازیں پڑھتا گیا۔ ایک کے بعد دوسری۔ دوسری کے بعد تیسری۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ دو مجاہد واجد کو بلانے کے لئے آئے لیکن ان کے قدم باہر ہی رک گئے۔ کوٹھری کی دیواروں کے بڑے سوراخوں سے روشنی کے ہالے واجد کے گرد پڑ رہے تھے اور وہ جائے نماز پر سجدے میں پڑا والہانہ انداز میں خدا کو اس کے متبرک ناموں سے پکار رہا تھا۔

اس دن کے بعد اور بھی معجزے ہوئے، اور جب وہ نہیں ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ خدا کی مرضی نہیں تھی۔ واجد نے فیصلہ کر لیا کہ اس جنگ میں گر وہ زندہ رہ گیا تو آس پاس کے کسی پہاڑ میں وہ اپنا مسکن بنا لے گا اور خود کو خدا کی ذات میں جذب کر دے گا۔

٦

نوراں آہستہ آہستہ اس بے نام بستی سے مانوس ہوگئی جہاں رینو اسے لے آیا تھا۔ چند مٹی کے گھروں کے افراد کے درمیان رینو کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے نوراں کو بھی تحفظ مل گیا۔ بستی کے ناپاک لوگوں کے درمیان نوراں کو زندگی جبر محسوس ہوتی، لیکن وہ مجبور تھی۔ کوٹ فتح خان کے کسی بھی گھر میں ملک ظہیر کے خوف سے اسے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔

بستی سے کچھ فاصلے پر ناریاں جانے والی سڑک کے قریب ایک بڑا کنواں بنایا جارہا تھا۔ وہاں پر اینٹوں کی بھٹی تھی جہاں جو مزدور کام کر رہے تھے ان میں نوراں بھی تھی۔ سارا دن اینٹیں ڈھونے اور ٹوٹی اینٹوں کو کوٹ کر برادہ بنانے میں گزر جاتا۔ جو اجرت وہاں ملتی اس میں وہ کسی طرح گزارا کرنے لگی۔ کام کے دوران شاداں کی دیکھ بھال میں بھی آسانی تھی۔ جسے نوراں پاس ہی کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتی اور جب وہ بھوکی ہوتی تو اسے کھلاتی پلاتی۔ شام کو جب نوراں بستی واپس آتی تو مسلسل مشقت کرنے کی وجہ سے سر، گردن اور پیٹھ میں ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوتیں۔ بستی پہنچنے کے بعد بھی اسے فرصت نہیں ملتی۔ کوٹھری کی صفائی، کھانا پکانا، جوٹھے برتن صاف کرنا اور قریب کے جوہڑ میں اپنے کپڑے دھونا۔ سبھی محنت کے کام تھے۔ رات کے وقت جب وہ اپنی چارپائی پر پڑتی تو جسم لکڑی کا کندہ محسوس ہوتا۔ اکثر تھکان اور بدن کے درد کی وجہ سے نیند بہت دور ہوتی اور نوراں کو واجد یاد آنے لگتا۔ اس کے وعدے اور اس کی محبت یاد آتی اور اس یاد سے اس کے آنسو گرنے لگتے۔ نوراں کو خیال آتا کہ شاید امام واجد اسے ڈھونڈتا ادھر نکل آئے پھر اس کی ساری اذیتیں دور ہو جائیں گی۔ کوٹھری کے باہر رات کی تاریکی میں کسی کے قدموں کی آواز آتی تو نوراں سمجھتی کہ شاید واجد آ گیا ہے۔ لیکن جلد ہی اس کی امید مایوسی میں

تبدیل ہو جاتی۔ آہستہ آہستہ اسے یقین آ گیا کہ واجد نہیں آئے گا۔ وہ اپنی تنہائی اور بے بسی کی عادی ہونے لگی۔ ننھی شاداں کو ماں کی اذیتوں کا احساس نہیں تھا۔ وہ پاس تھی، ہر دن اور ہر لمحہ اس کا تحفظ میسر تھا، اور راتوں کو اس سے چمٹ کر سونے میں سکون تھا اور فرحت تھی۔

کچھ دنوں میں نوراں کو معلوم ہو گیا کہ اس بستی میں زندگی کے ہنگامے ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ رات کے وقت جب سب سو رہے ہوتے اور سناٹا چھا جاتا تو اچانک گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز آتی۔ ان کے پیروں کی ٹاپ ٹاپ سے نوراں کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ آنے والوں کا خیر مقدم ہمیشہ رینو کرتا۔ اسی کی آواز باہر سے آتی۔

''آ ہو جی بادشاہو...... تہڈا ہی انتظار تھا۔'' رینو کہتا۔ پھر اس کی دبی زبان میں اجنبیوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آتیں۔ جن کا سننا محال ہوتا۔ اس کے کچھ دیر بعد اجنبی سرپٹ گھوڑوں کو دوڑاتے نکل جاتے۔ ان کے پیچھے گاؤں کے کتے بھونکتے ہوئے بھاگ پڑتے۔ پھر سناٹا چھا جاتا جس میں کبھی کبھی ہوا سنسناتی ہوئی اڑتی سنائی دیتی۔ نوراں پریشان ہو جاتی۔ وہ ان واقعات کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ ایک دن اس نے رینو سے پوچھا بھی۔ لیکن رینو نے اسے اس طرح ڈانٹا کہ نوراں کو دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ان واقعات کے علاوہ بستی میں زندگی اکتائے ہوئے ڈھرّے پر چلتی رہتی۔ جس میں تبدیلی بستی میں رہنے والوں کے تہواروں میں آ جاتی۔ جس میں رونق رات کے وقت ہوتی تھی اور جس میں شرکت کے لئے آس پاس سے بھی مرد و عورت آ جاتے تھے۔ پہلے سب مل جل کر درخت کے گرد کھڑے ہو کر اس کی پوجا کرتے۔ اس کے بعد مرغیاں، گلہریاں اور نیولے ذبح کر کے پکائے جاتے جنھیں دیسی شراب کے ساتھ ہضم کیا جاتا۔ گانا بجانا ہوتا اور جوان مرد و عورت گندہ مذاق کرتے۔ کبھی شراب کے نشے میں کوئی عورت اٹھ کر اندھیرے میں دو تین مردوں کے ساتھ غائب ہو جاتی۔ لیکن کسی کو پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ سوچ کر کہ ان کے درمیان کیا ہوتا ہے نوراں مارے ڈر سے تھرا جاتی۔ اسے خیال آتا کہ شراب کے نشہ میں کوئی اسے بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ رینو عقاب کی طرح اس پر نگاہ رکھتا تھا۔ کبھی کوئی نوراں سے گندہ مذاق کرتا یا معنی خیز اشارے کرتا تو رینو اسے تھپڑ جڑ دیتا۔ بستی کے دو تین اور مرد اس سزا میں شریک ہو جاتے۔ رینو نہ شراب پیتا اور نہ ہی تہوار کے ہنگاموں میں شریک ہوتا۔ وہ ایک جانب بیٹھا سارے تماشے دیکھتا رہتا۔ نوراں اس کے لئے ایک بہتر طبقے

کی نہ صرف فرد تھی بلکہ کسی بزرگ کی بیوی یا محبوبہ بھی۔ نیز نوراں کی بیکسی نے بھی رینو کی انسانیت جیت لی تھی۔ اس کی اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ آج نوراں سے مختلف نہیں دکھائی دیتی۔ وہ ایک متبرک امانت تھی جس کی حفاظت رینو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی بے نور دنیا نوراں اور شاداں کی موجودگی سے روشن ہوگئی تھی۔

وہ لوگ کون تھے جو گھوڑوں پر چڑھ کر بستی میں رات کے وقت آیا کرتے تھے، انھیں جاننے میں نوراں کو زیادہ مدت نہیں لگی۔ ایک اندھیری رات میں جب ہوا بگولے اڑا رہی تھی۔ خشک پتے اس کی زد میں دیوانوں کی طرح رقص کر رہے تھے اور ننھی بستی کی کٹیاؤں کے دروازے زور زور سے بج رہے تھے تو گھوڑے پر سوار ایک شخص بستی کے قریب پہنچا۔ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم اور گرد و غبار سے بچنے کے لئے اپنے چہرے کو پگڑی کے شملہ سے چھپائے ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جس سے اس کے مخدوش انسان ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ رینو کی کٹیا کے سامنے پہنچ کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور وہ نیچے کودا۔

''رینو! ابے حرامزادے رینو! جلدی باہر آؤ!'' ہوا کے شور میں اس شخص کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔

رینو گھبرایا ہوا اپنے گھر سے نکلا۔ اس کے جسم پر صرف ایک ڈھیلی سی دھوتی تھی۔ وہ نیند بھری آنکھوں سے گرد و غبار میں اجنبی کو پہچاننے کی کشش کر رہا تھا۔ جب رینو اس کے پاس پہنچا تو اجنبی کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ آگئی۔

''سور کے بچے...... احسان فراموش۔ میری وجہ سے تیری بستی بچی ہوئی ہے ورنہ مسلمان بلوائی تم نیچ ذاتوں کا کب کا سفایا کر چکے ہوتے۔ لیکن تو ذلیل ہے۔ تو نے ان خالصاؤں کو بتا دیا ہے کہ میں اور میرے ساتھی ان کے گاؤں کو لوٹ کر جلا رہے ہیں۔ ہم کیوں نہ کریں؟ بزدل کافر تمام ہندوستان میں مسلمانوں کی جان لے رہے ہیں اور ان کی عزت لوٹ رہے ہیں۔ حرامی! کیا تجھے پتہ نہیں ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دو تھپڑ رینو کو جڑ دیئے۔

رینو کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے گالوں کو سہلاتا ہوا اجنبی کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔

''نہیں نہیں۔ سرداروں کے سردار۔ میں نے ہمیشہ انھیں وہی خبر دی ہے جو تمھیں دیتا رہا ہوں۔ میں صرف امیروں کی حویلیوں کی خبریں لاتا ہوں۔ کہاں شادی ہو رہی ہے۔ کس حویلی

میں صرف بوڑھے رہتے ہیں۔ کہاں پہرہ ہے اور کہاں نہیں۔ کس نے لگان وصول کر کے تجوری بھری ہے۔ بس یہ بتاتا ہوں اور کچھ نہیں۔ کون مسلمان یا سکھ ہے یا ہندو۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ مائی باپ میرے لئے سب شکار ایک جیسے ہوتے ہیں...... سچ...... بالکل سچ۔''

''اب وہ کافر آئیں تو انھیں بتا دینا۔ نواب خان سے ان کا بھائی چارہ ختم ہوا۔ میرا بھی ان سے آمنا سامنا ہوا تو میں انھیں بھون دوں گا۔ یہ زمین جس پر میں کھڑا ہوں وہ پاکستان ہے۔ اس پر کافر نہیں رہ سکتے۔ یہاں میری حکومت ہے اور رہے گی۔'' نواب خان نے دھمکی دی اور اپنی رائفل کی نال سے رینو کے پیٹ میں بار بار ٹھوکا دیا۔

ڈاکوؤں کو خون کا چسکہ ہوتا ہے۔ نیچ ذات رینو کی جان کی قیمت ہی کیا تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ ہر طرف معصوم انسانوں کی جان لی جا رہی تھی۔ نواب خان کی چلائی ہوئی گولی رینو کا خاتمہ کر دیتی تو قیامت نہیں آ جاتی۔ مجرم کا کوئی کھوج نہیں لگاتا۔ رینو کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے نواپ خان کے پیروں کو پکڑ لیا۔

''تم ہمارے ماں باپ ہو۔ اپنا کرم کرو۔ میں ان سکھ ڈاکوؤں کو تمہارے جال میں گرفتار کرا دونگا۔'' رینو کی آواز لرز رہی تھی اور خوف سے اس کی آنکھوں کی سفیدی پھیل گئی تھی۔

''نہیں۔ میں بزدل نہیں۔ ان میں ہمت ہو تو ہتھیار سے بچ کر آئیں۔ میں دیکھ لونگا۔''

''جیسی تہڈی مرضی۔ تم تھک گئے ہو گے۔ یہاں پاگل ہوا میں مت کھڑے رہو۔ آؤ۔ اس غریب کی کوٹھری میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لو۔ تمہارے کام کے لئے آدھی رات پڑی ہے۔''

''نواب خاں کو پتہ ہے اسے کہاں آرام کرنا چاہئے۔ تیری کٹیا کے ساتھ والی کوٹھری میں ہیرا ہے۔ تو میرے گھوڑے کو سنبھال۔'' نواب خان نے فاتحانہ ہنستے ہوئے لگام کو رینو کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور نوراں کی کوٹھری کی جانب بڑھا۔

''بادشاہو...... ایسا غضب مت کرو۔ وہ پیر کی بیوی ہے۔ اس پر ہاتھ مت ڈالو۔'' رینو نے تھرتھراتے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''چپ رہ۔ مجھے پتہ ہے وہ کون ہے۔ جس جوان عورت کے پاس اس کا خاوند نہیں ہوتا اسے مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔'' نواب خان بے خطر بولا اور اپنے چہرے پر سے سیاہ پگڑی کے شملے کو ہٹا دیا۔ رات کی تاریکی میں اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ نواب خان کو کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ جس زمین پر کھڑا تھا اس کے چپے چپے سے

واقف تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اعتماد تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی کبھی خطا نہیں ہوگی۔ اسے علم تھا۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ یہاں سے چھلاوے کی طرح نکل سکتا ہے، وہ یہ بھی جانتا تھا۔

نوراں کی کوٹھری کے دروازے پر اس نے زور سے دھکے دیئے۔ وہ جاگ پڑی۔

''کون ہے؟'' وہ ڈر کر پکاری اور شاداں جو پاس کی کٹھیا پر سو رہی تھی، اس کی حفاظت کے لئے اس پر نوراں نے ہاتھ رکھ دیا۔

دروازہ زور سے کھلا۔ دیوانی ہوا شور مچاتی اندر گھس آئی۔ گہری تاریکی میں نوراں کو ایک شخص کا ہیولا اپنی جانب بڑھتا نظر آیا۔ ''شاہ جی بچاؤ'' وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اس کا محبوب ہی اسے بچا سکتا تھا۔ نوراں کو گمان ہوا کہ وہ بزرگ ہونے کی وجہ سے اس کی ماورائی طاقت اس کی امداد کے لئے شاید آجائے۔ لیکن نوراں جیسی مجبور عورت کی مدد کے لئے کوئی نہیں آتا۔ نواب خان کا سخت ہاتھ اس کی گردن پر پڑا اور فولاد جیسی انگلیوں کا حلقہ ان کے گرد تنگ ہونے لگا۔

''حرام زادی...... ذرا بھی شور مچایا تو تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔'' نواب خان پھنکارا۔

نوراں کی آواز گھٹ گئی۔ ایک مرد کا بھاری جسم اسے کچلتا محسوس ہوا۔ نواب خان نے اس کے کپڑوں کو نوچ کر اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ جابر مرد کا برہنہ جسم مجبور عورت کو مسلنے لگا۔ خوف کی وجہ سے نوراں کا جسم اکڑ کر منجمد ہو گیا۔ نوراں کو احساس ہوا کہ اس کے پیٹ میں اس کا رحم سکڑ کر گیند بن گیا ہے اور اس سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ وہ اپنی اذیت اور خواری پر مسلسل روتی رہی۔ نواب خان دیر تک نوراں کے ساتھ رہا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اسے گالیاں دیتا۔ اس کی رانوں، کولھوں اور پستانوں میں زور زور سے چٹکیاں لیتا۔ نوراں کو کراہتے سن کر اسے اور بھی لذت ملتی۔

دوسرے دن نوراں سے رینو آنکھیں نہیں ملا سکا۔ وہ دن بھر اپنے جھونپڑے میں شرم سے چھپا رہا۔ وہ جس قبیلے کا فرد تھا اس کی معاشرے میں کیا حیثیت تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک بزرگ کی محبوبہ کو پناہ دے کر اس کی روح نے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی کوشش رائگاں گئی۔ وہ نیچ ہونے کی وجہ سے نوراں کی حفاظت نہیں کر سکا۔ ''نوراں کو میرا آسرا تھا جبھی اس بدمعاش نواب خان نے اس کی عزت لوٹی۔ وہ اگر کوٹ فتح خان میں ملک کی حویلی میں ہوتی تو اس پر آنکھ اٹھانے کی ہمت اس کمینے ڈاکو کو نہیں ہوتی۔'' اپنی کھٹیا پر پڑا ان

باتوں کو بار بار دہراتا رہا۔ وہ اپنی نگاہ میں گر چکا تھا۔ اس میں اور بستی کے دیگر نیچ افراد میں اب کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ اس نے کچھ کھایا نہ پیا۔ کروٹیں بدلتے اس نے دن کاٹ دیا۔ جب رات آئی تو اس نے خوب شراب پی۔ خالی پیٹ ہونے کی وجہ سے اس پر نشہ جلد چڑھ گیا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور اونچی آواز میں اپنی مردہ بیوی کے اعضا کا ذکر کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا نوراں کی کوٹھری کے پاس گیا اور پکارا۔

''نوراں۔ اب تو دیوی نہیں رہی۔ باہر آ۔ نہیں تو مزہ لوٹنے میں اندر آتا ہوں۔'' اس نے اپنا جملہ بہ مشکل ختم کیا تھا کہ اچانک اسے زور کی الٹی آئی۔ وہ چکرا کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ اس کی بیہوشی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ لوگ اسے اٹھانے کے لئے آئے۔ ہوش میں لانے کے لئے اس کے گندے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ لیکن رینو نے کچھ دیر تک غوں غوں کرنے کے بعد دم توڑ دیا۔ بستی کے مرد وعورت رینو کے مردہ جسم کے گرد بیٹھ کر زور زور سے بین کرنے لگے۔ رات کے سناٹے میں ان کے رونے کی آواز بڑی ہولناک تھی۔ صبح کے وقت بستی والوں نے رینو کی لاش کو مرگھٹ میں لے جا کر جلا دیا۔

نوراں جن لوگوں کے درمیان رہتی تھی انھیں معلوم ہو گیا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ ان میں سے چند نے نواب خان کی بھاری آواز کو سنا تھا۔ اس کے گھوڑے اور اس کے پاس رینو کو بیٹھے ہوئے بھی دیکھا تھا اور نوراں کی چیخیں بھی سنی تھیں۔ لیکن اس پر انگلی اٹھانے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ نوراں اب بہت بڑے ڈاکو کی منظور نظر تھی۔ بستی کے افراد کی سلامتی کے لئے اس ڈاکو کی خوشنودی ضروری تھی۔

دو ہفتوں کے بعد ایک اور ڈاکو جو نواب خان کا دوست تھا وہ نوراں کے پاس رات کے وقت آیا اور اپنی ہوس کی آگ بجھا کر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک معمول سا بن گیا۔ مہینے میں ایک دو بار رات کے وقت کوئی نہ کوئی ڈاکو یا خونی چور نوراں کے پاس شب بسری کے لئے ضرور آتا۔ ان سے نوراں کو علم ہوا کہ رینو ان کا جاسوس تھا جو گاؤں گاؤں گھوم کر انھیں مال و دولت کی خبر دیتا تھا۔ نوراں نے جان لیا کہ وہ اب بیسوا بن چکی ہے اور اس زندگی سے فرار ممکن نہیں۔ اس نے رینو کی کوٹھری پر قبضہ جما کر بُرے کاموں کے لئے اسے وقف کر دیا۔ کسی کو چوں چرا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنے یاروں سے نپٹنے کے لئے نوراں نے جلد ہی نت نئی حرفتیں سیکھ لیں۔ کبھی اپنا جسم انھیں حوالہ کرنے سے پہلے ہی ان کے ہیجان کو ختم کر دیتی پھر

انھیں نامردی کے طعنے دے کر انھیں شرمندہ کرتی اور کبھی روٹھ کر ایسے مطالبے کرتی جس کا پورا کرنا اس کے عاشقوں کے لئے ناممکن ہو جاتا۔ یہ مطالبے عام طور پر عطر، صندل کا تیل یا ریشمی کپڑوں کے لئے ہوتے۔

نوراں کی زندگی میں اس تغیر نے اس کا جینا آسان کر دیا۔ اسے کمر توڑ محنت کی ضرورت نہیں رہی۔ کبھی اسے پیسوں کی کمی ہو جاتی تو کوٹ فتح خان میں پنساری کی دوکان پر جاتی۔ وہاں کسی جوان یا ادھیڑ عمر کے مرد کو اپنی جانب راغب پا کر اشاروں اور کنائے سے رات میں ملاقاتیں طے کر لیتی۔ اس کے بعد گنے کے کھیتوں میں یا ملک کے وسیع باغ میں کسی پیڑ کی آڑ میں اپنے گاہکوں کو فیضیاب کرتی اور قیمت وصول کرنے کے بعد اپنی بستی میں لوٹ آتی۔

دن، مہینے اور سال گزر گئے۔ نوراں کو ان کا پتہ بھی نہ چلا۔ برسات میں شیشم کے پیڑوں کی ہریالی نکھر آتی۔ بہار کے ساتھ پیپل کے درختوں میں کونپل پھوٹنے لگتے۔ سرما میں گندم کی بالیاں لچک لچک کر سنہری موجیں بکھیرتیں۔ آسمان سے اڑتی ہوئی چڑیائیں آتیں اور ان چند خستہ مکانوں کے سامنے اڑتی ہوئی آسمان میں کہیں گم ہو جاتیں۔ کوئے درخت کی شاخوں پر آ کر بیٹھتے اور اپنی کائیں کائیں سے درخت کے تنے پر بنے عجیب وغریب سفید نقوش میں چھپے ماورائی رازوں کی حقیقت پوچھتے اور جب انھیں جواب نہیں ملتا تو خاموش ہو جاتے۔ زندگی کی نکھرتی اور پھیلتی رنگا رنگی میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ نوراں بھی ایک طرز کی زندگی کی عادی ہو کر اپنے آپ کو بھلا بیٹھی تھی۔ بستی کی عورتیں کبھی کبھی کہتیں کہ نوراں خوش قسمت ہے۔ ورنہ عین ممکن تھا وہ اغوا کر لی جاتی اور شہر میں اسے بیچ دیا جاتا۔ پھر اس کا حشر بُرا ہوتا۔ لیکن نوراں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی آرزوئیں، تمنائیں اور خواب شاداں کے گرد مرکوز تھے۔ جو کمسنی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جس کے گال اور گردن کسی جوان مرد سے باتیں کرتے وقت سرخ ہو جاتے اور جن کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے وہ ہکلانے لگتی۔ نوراں بیٹی پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ لیکن اسے پتہ تھا کہ عورت ہونے کی وجہ سے وہ کمزور ہے اور اس کی حفاظت کے باوجود شاداں کی عزت لوٹی جا سکتی تھی یا اپنی معصومیت کی وجہ سے کسی کی ہوس کا نشانہ بن سکتی تھی۔ اس لئے نوراں کو خیال آتا کہ اگر اس کا شوہر ہوتا تو وہ بھی شاداں کا محافظ بن جاتا۔

نوراں کے گاہکوں میں کبھی کبھی فوجی سپاہی بھی ہوتے تھے جو فوج سے کسی جرم کی بنا پر

نکال دیئے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ آزاد کشمیر میں اپنی پلٹنوں کے ساتھ رہ چکے تھے۔ باتوں باتوں میں وہ نوراں کو ایک مشہور پیر کی بابت بتاتے جس کی خانقاہ میر پور کے شمال میں تیس میل دور پنجنی نام کے گاؤں میں تھی۔ جو گوشہ نشین نہیں تھا اور نیک کاموں کے لئے ارد گرد کے گاؤں میں بھی جاتا تھا اور جس کی اذان اور قرائت بلا کی شیریں تھی۔ جس کی ناک پر ایک سرخ مَسَہ کسی قیمتی پتھر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ جس کی گفتگو مختصر ہوتی تھی اور جو بیشتر وقت خاموش رہنے کی وجہ سے چپ شاہ کے نام سے مشہور تھا۔

''وہ شاہ جی ہی ہوں گے۔ کوٹ فتح خان کی مسجد کے امام۔ میرے پرانے محبوب۔'' سپاہیوں کی باتیں سن کر نوراں خود سے کہتی۔ واجد کے تصور سے نوراں کے دل میں نہ درد اٹھتا اور نہ ہی اس کی قربت کی خواہش نوراں کو تڑپاتی۔ بہت سی یادوں کے ڈھیر میں واجد کی یاد بھی گزرے ہوئے وقت کی پت جھڑ میں چھپ چکی تھی۔

ایک رات نوراں کے پاس زری خاں نام کا جوان مرد آیا۔ گھنی سیاہ داڑھی اور مونچھوں میں ڈھکا مٹیالا چہرہ اور طویل قامت۔ گلے میں نیلے پتھروں کی مالا اور باتوں میں نرمی۔ وہ سکھر میں اپنے چچا کو قتل کرنے کے بعد چوری ڈکیتی کرتا ہوا نوراں کی بستی میں پہنچا تھا۔ وصل یاب ہونے سے پہلے اس نے نوراں کی ٹانگوں، بازوؤں، گردن اور پیٹھ پر چنبیلی کے تیل کی مالش کی۔ نوراں اس انوکھی خدمت سے خوب مسرور ہوئی۔ اس نے زری خاں کو ہنس ہنس کر رجھایا۔ اس کے جسم سے زری خاں کو کچھ ایسی لذت ملی کہ اس دن کے بعد وہ پھر آیا اور اس نے نوراں سے شادی کی درخواست کی جو فوراً قبول کر لی گئی۔

۷

صبح کا وقت تھا اور سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپا تھا۔ پنجنی جانے والی سڑک سنسان تھی۔ دوپہر کے وقت ایک دو راہگیر اس راستے پر نظر آجاتے تھے یا کوئی فوجی ٹرک گرد اڑاتی پنجنی کی جانب چڑھائی پر بھاگتی ہوتی۔ لیکن صبح سویرے یہاں ہمیشہ خاموشی اور ویرانی ہوتی۔ آس پاس کوئی جھونپڑی یا بستی نہیں تھی اور نہ ہی کسی انسان کا نام ونشان تھا۔ پہاڑ چیڑھ کے درختوں سے ڈھکے تھے۔ جن کی برچھی جیسی پتیاں ہوا کے شور میں سسک رہی تھیں۔ جب اندھیرا ہوتا تو کوئی شخص یہاں تک کہ پنجنی کے رہنے والے بھی اس راستے پر نظر نہیں آتے تھے۔ چونکہ یہ سڑک جنگ بندی لائن سے زیادہ دور نہیں تھی، اور فوجی اکثر اس سڑک پر گشت کرتے رہتے تھے۔ جنھیں جاسوسی کے شبہ میں کسی بھی شخص کو نہ صرف گرفتار کرنے بلکہ گولی ماردینے کی بھی اجازت تھی۔

دو آدمی سڑک کے موڑ پر نمودار ہوئے۔ ان کے پیر گرد آلود تھے اور ان کی پیشانیاں پسینے کے قطروں سے بھیگی تھیں۔ وہ تیز چلتے ہوئے آرہے تھے اس لئے ان کی سانس چڑھی تھی۔ ان میں آگے چلنے والا واجد تھا۔ اس کی عمر اب چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی گدلی زلفیں سفید پگڑی کے نیچے سیاہ داڑھی کے دونوں جانب بکھری تھیں۔ گو چڑھائی کی وجہ سے سڑک پر چلنا دشوار تھا۔ پھر بھی اس کے سنجیدہ چہرے پر تھکاوٹ نہیں تھی۔ اس کا قد سیدھا تھا اور اس کی چوکنی نگاہیں ادھر ادھر پڑرہی تھیں۔ جب دونوں پتھروں سے بنے ہوئے پل کے پاس پہنچے تو واجد کے قدم سست پڑ گئے اور وہ رک گیا۔ جیسے کسی نے اچانک اس کے پیروں کو پکڑ لیا ہو۔ وہ پل کی منڈیر سے ٹک گیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ جب چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ کسی بھولی بسری یاد میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی خوف اس کے دل میں تھا تو اسے

ان یادوں نے مٹا دیا۔ وہ پتھروں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ ان پر جو دھول پڑی تھی وہ مٹ گئی۔ واجد کا چہرہ متبسم ہو گیا۔ جیسے ان پتھروں پر کوئی تحریر تھی جسے پڑھ کر اسے خوشی ہو رہی تھی۔ اس مسرت کے ساتھ اسے ہوا کی تازگی کا احساس ہوا۔ اور وہ خوشبو بھی اسے محسوس ہوئی جو چیڑھ کے درختوں کے تنے سے نکلتے گاڑھے رس سے آ رہی تھی۔

''مگن شاہ! یہاں کچھ دیر کے لئے رکتے ہیں۔'' واجد اپنے گول مٹول نوجوان ساتھی سے بولا۔ جو اسے بے معنی نگاہوں سے تکتا ہوا سر دھن رہا تھا اور ساتھ ہی مسکرا بھی رہا تھا۔

''رکتے ہیں۔'' مگن شاہ نے واجد کے آخری الفاظ کو دہرا دیا اور زور سے ہنس پڑا۔ اس کا قہقہہ اس کی روح میں موجزن مسرت کا اظہار تھا۔ ایک ایسی مسرت جسے نہ مگن شاہ سمجھتا تھا اور نہ ہی واجد، اور نہ ہی کوئی دوسرا انسان۔ مگن شاہ کے گول سرخی مائل چہرے پر شادابی تھی۔ لعاب اس کے منہ سے نکل کر اس کی ٹھڈی پر اُگی نرم اور چھوٹی سی داڑھی پر بہہ آیا تھا۔ اس کی ننھی منی آنکھیں واجد پر جمی تھیں۔

واجد پل پر جھک کر نیچے بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ جہاں سے غل غل کرتی آواز آ رہی تھی۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد اور بغیر مگن شاہ پر نگاہ ڈالے واجد بولا۔

''مگن شاہ! میں اس سڑک کے ہر ٹکڑے سے واقف ہوں اور اس جنگل میں جتنی پگڈنڈیاں ہیں میں ان سب کو جانتا ہوں۔''

مگن شاہ نے جواب دینے کی کوشش کی۔ جن الفاظ کو وہ بولنا چاہتا تھا وہ اس کے ذہن میں الجھ کر رہ گئے۔ بے معنی سی آواز اس کے منہ سے نکلی اور وہ بے بسی سے واجد کو دیکھنے لگا۔ لیکن واجد کو اس کی سمجھ یا ناسمجھی کی کوئی پرواہ نہیں تھی وہ بولتا چلا گیا۔

''مگن شاہ۔ مرنے کی خواہش مجھے کشمیر لے آئی تھی۔ اس وقت یہاں ہندستان اور پاکستان کے درمیان خوفناک جنگ ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی ذلت کا خیال اتنا زیادہ تھا کہ میں چاہتا تھا کہ میں مارا جاؤں۔ رائفل کی گولی یا کوئی بم میرا خاتمہ کر دے۔ لیکن میں زندہ ہوں۔ لوگ مجھے بہت بڑا پیر سمجھ کر میری عزت کرتے ہیں۔ میری خاموشی کی وجہ سے لوگ مجھے پیر چپ شاہ کہتے ہیں۔ میں صرف چند سے باتیں کرتا ہوں۔ وہ بھی کم کم۔ ان میں مگن شاہ تو بھی ہے۔ تو میری اولاد کی طرح ہے، دوست اور خادم بھی ہے۔ تو جتنا مسٹنڈا ہے تیرا بھیجا اتنا ہی نرم اور ننھا ہے۔ میں بھی کچھ تجھ سے بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتا ہوں اور تو کچھ بھی نہیں سمجھے گا۔ تو کسی اور

دنیا میں گم رہتا ہے۔ ہیں نا مگن شاہ۔'' واجد نے مگن شاہ کی پیٹھ کو تھپتھپایا اور اسے مشفقانہ تکا۔

لیکن مگن شاہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ واجد کی نگاہ کا اور نہ ہی واجد کی باتوں کا۔ مگن شاہ مسکراتا ہوا اپنا سر دھنتا رہا۔ جیسے وہ وجد میں ہو۔ واجد نے اس کی خاموشی کا برا نہیں مانا۔ اس کی آنکھیں پھر پل کے نیچے مرکوز تھیں۔ جہاں مچلتا پانی پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس کی زندگی کی طرح۔ بہت سوں کی زندگی کی طرح۔ آفتیں کس پر نہیں ٹوٹتیں۔ کون مصائب سے ٹکرانے کے بعد نہیں کھڑا ہو جاتا۔ بس ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ واجد نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

''مگن شاہ۔ میں مشہور پیر ہوں۔ مجبوروں کی مدد کرتا ہوں۔ جن کا مرض لادوا ہوتا ہے انھیں شفا دلاتا ہوں اور عبادت میں جو خوشی ملتی ہے..... آہ۔'' واجد نے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیے اور سرگوشیوں میں بولنے لگا۔ ''اے خدا۔ میں تیرا احسان مند ہوں۔ تو سچ مچ رحیم ہے۔ کریم ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔''

مگن شاہ کے مبہم تصور میں کوئی شے اچانک چمکی۔ اس کی مسکراہٹ مٹ گئی۔ چہرے کی شادابی رخصت ہو گئی اور وہاں بلا کی سنجیدگی آگئی۔ کسی گہری سمجھ کی وجہ سے اس کی آنکھیں نکل آئیں۔

''اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔'' مگن شاہ پورے جوش سے بولا اور اس کے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ اس کی سمجھ بوجھ کی محدود دنیا میں ان الفاظ کی عظمت تھی۔ ان سے وابستہ ایک آگ تھی۔ جس کی تپش سے اللہ اکبر کہتے وقت وہ سلگ اٹھتا تھا۔ واجد کی لگاتار شب و روز کی محنت کے بعد مگن شاہ ان الفاظ کو بولنے کے لائق ہو سکا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مگن شاہ کی زبان سے بامعنی جملے ادا ہونے لگتے۔ مگن شاہ کے سر پر بوسیدہ فوجی بیرٹ تھی جس میں مور کا ایک پر گھسا تھا۔ اس کے جسم پر پھٹی پرانی خاکی قمیص اس کے ٹخنے تک لٹکی تھی اور خاکی نیکر کے پائچے اس کے ٹخنے اور گھٹنے کے درمیان جھول رہے تھے۔ اس کا ملبوس کسی رحم دل سپاہی کا عطا کردہ تھا۔

''مگن شاہ۔ خدا کون ہے؟'' واجد نے اچانک پوچھا۔ اس کی نگاہیں دور افق میں تک رہی تھیں جہاں چیڑھ کے درختوں کی ہریالی خلا میں بہہ رہی تھی۔

''خدا؟'' مگن شاہ کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

''ہاں مگن شاہ۔ مجھے بتا خدا کون ہے؟'' واجد کے لہجے میں نرمی تھی۔

مگن شاہ جس گٹھری کو اٹھائے ہوئے تھا اسے اس نے ایک ہاتھ سے دوسرے میں سرکایا اور جواب کی تلاش میں اس نے واجد پر نگاہ ڈالی۔ وہ اس ننھے سے سرخ مستے کو سہلا رہا تھا جو اس کی ناک پر تھا۔ اچانک مگن شاہ کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ ایک قہقہہ اس کے منہ سے پھوٹ پڑا اور ساتھ ہی اس کی آنکھیں زور سے بچ گئیں۔ جیسے دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی جانب مگن شاہ نے دیکھنا بند کر دیا تھا اور اب اس کی نگاہیں اس منور کائنات پر تھیں جو اسکی روح میں بسی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر واجد غصے میں آ گیا۔ اس نے مگن شاہ کے کان کو زور سے مڑوڑا۔

''میں نے تجھے ہزار بار سمجھایا ہے کہ جب خدا کی باتیں ہوں تو مت ہنسا کر۔'' واجد کے چہرے پر کرختگی اور ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مگن شاہ کو اذیت دے کر اسے خوشی ہو رہی تھی۔

''آں......آہ......خدا......نہیں......خدا......خدا۔'' مگن شدید تکلیف سے کراہا۔

واجد نے مگن شاہ کا کان چھوڑ دیا اور اس کی پیٹھ پر ایک دھپہ مار کر اسے سمجھانے لگا۔

''مگن شاہ۔ اس دنیا کو بنانے والا خدا ہے۔ جو ہمیں دیکھتا ہے لیکن ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اس دنیا میں سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ تو نرا احمق ہے۔ یہ اس کا حکم ہے۔ میں جنگ میں زندہ بچ گیا یہ اسی معبود کی خواہش تھی۔''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ مگن شاہ کی سمجھ میں مشکل سے کچھ آتا ہے، واجد اس سے مذہبی گفتگو کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں مگن پر سے ہٹ کر ادھر ادھر گردش کرنے لگیں۔ درختوں اور جھاڑیوں، بل کھاتی مٹیالی سڑک جو بلندی کی جانب جا رہی تھی۔ پہاڑ کی وہ سطح جہاں برہنہ چٹان تھی۔ سکھوں پر اس کی نگاہیں چند لمحوں کے لئے رکیں۔ جیسے وہاں کچھ تھا جسے صرف وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کا غصہ دور ہو گیا اور چہرے پر پرانی یادوں کا سایہ آ گیا جس نے چہرے کی سختی کو دور کر دیا۔ واجد پھر بولنے لگا۔

''مگن شاہ۔ میں نے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ مل کر اس سڑک کی تعمیر کی تھی۔ میں اپنے ان ساتھیوں کے چہروں کو اس پل کے پتھروں اور سڑک کی اڑتی دھول میں دیکھ سکتا ہوں اور میں مولانا غیظ کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ عالم فاضل۔ پکے ایمان والے اور دنیاوی کاموں میں بھی پیش پیش۔ ان سے مجھے بڑا فیض پہنچا۔ خدا انہیں ہمیشہ اپنے سائے میں رکھے۔ ہم صرف دو

روٹی اور تھوڑی سی دال پر گزارا کرتے تھے۔ میں تپتی دھوپ میں بڑے بڑے پتھر ڈھوتا تھا لیکن میرے منہ سے کبھی آہ بھی نہیں نکلتی تھی۔ جب مولانا غیظ کو خدا نے اٹھالیا تو مجھ پر اس کی رحمتیں برس پڑیں۔ میری دعاؤں میں تاثیر آگئی۔ جو بھی میرے پاس مرادیں لے کر آیا وہ میری دعاؤں سے پوری ہو گئیں۔ دشمن کے جہاز بم گرانے آتے لیکن کوئی بھی بم اس سڑک پر نہیں گرا جسے ہم تعمیر کر رہے تھے۔'' واجد ہنس پڑا۔ اردگرد جو کچھ بھی تھا، جو خاموشی تھی اور جو سکون تھا ان سب سے اسے خوشی ہونے لگی۔ اسے شبنمی صبح کی خنکی بہت بھلی لگی اور ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔

مگن شاہ نے جو سزا برداشت کی تھی اس کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ جو بھی اس نے سنا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا پھر بھی وہ آہستہ آہستہ سر دھنتا رہا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھے طوطے پر پڑی جو اپنی سرخ چونچ کو اپنے سبز پروں میں گھسائے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ مگن خوش ہو گیا۔ چڑیا کی جانب وہ انگلی اٹھا کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''طوطا۔''

وہ ایک کھلونا تھا جو اس کے ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔ پھر بھی جس کے شوخ رنگ اور اڑان سے اسے خوشی ہوتی تھی۔

''وہ بھی تیری طرح میاں مٹھو ہے۔ چل آ...... دو رکعت نفل کی نماز پڑھتے ہیں۔'' واجد نے جواب دیا اور نیچے نالے میں چلا گیا۔ جو اتنا گہرا نہیں تھا۔ پانی اس کے گھٹنے تک آتا تھا۔ زیریں آب ننھے ننھے پتھر صاف نظر آرہے تھے۔ واجد نے جھک کر چلو میں پانی بھرا اور آہستہ آہستہ وضو کرنے لگا۔ اس نے کئی بار چہرے اور گردن کو دھویا۔ پانی کی خنکی اس کی تھکاوٹ کو دور کرنے لگی۔ اللہ تیرا شکر کہتے ہوئے نالے سے باہر آکر اس نے اوپر پل کے پاس کھڑے مگن شاہ کو پکارا۔

''مگن شاہ نیچے آ...... بغیر وضو کیے تو نماز نہیں پڑھ سکتا۔ نالے کے پانی میں تو غرق نہیں ہو جائے گا۔''

ڈھلان پر اترنا مگن شاہ پر ہیبت طاری کر دیتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خوفزدہ نگاہوں سے ڈھلان کو تکتا رہا پھر گٹھری کو سنبھالے ہوئے رینگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ گرنے کے خوف سے وہ کبھی کسی جھاڑی کی مضبوط شاخ کو پکڑتا یا کسی چٹان کا سہارا لیتا۔ بار بار اس کی سہمی ہوئی

نگاہیں واجد پر مدد کی طلب میں جاتیں۔ لیکن وہ اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔ مگن شاہ کو مجبور دیکھ کر واجد کو خوشی ہو رہی تھی۔ مگن شاہ کسی طرح نالے میں پہنچ گیا اور اپنی کامیابی پر اس نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

''یقیناً اللہ سب سے بڑا ہے۔'' واجد نے تصدیق کی۔ وہ نالے کے باہر ہموار چٹان پر کھڑا پگڑی کے شملے سے اپنے چہرے کو خشک کر رہا تھا۔

وضو کرنے کے بعد دونوں نے پتھریلی زمین پر نماز پڑھی۔ واجد جس طرح نماز کے ارکان ادا کر رہا تھا مگن شاہ اس کی نقل کرتا رہا۔ جب نماز ختم ہوگئی تو واجد اسی جگہ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اس کی خانقاہ چھ میل دور پنجنی میں تھی۔ اگر وہ آرام سے چلتے رہے جب بھی وہ شام ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ جس بستی میں وہ گئے تھے وہاں سے وہ پو پھٹنے سے پہلے روانہ ہوئے تھے۔ دیر تک مسلسل چلنے کی وجہ سے واجد کو اب بھوک لگ رہی تھی۔ واجد نے وہ گٹھری کھولی جسے مگن شاہ ڈھوتا رہا تھا۔ اس میں درجن بھر مکئی کی روٹیاں تھیں اور ایک ہانڈی جس پر اس کے ڈھکنے کو ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا، اس میں دہی بھرا تھا۔ روٹی کو دہی میں ڈبو کر دونوں کھانے لگے۔ مگن تیزی سے روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو چبا چبا کر کھانے لگا۔ اس کے منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نکل رہی تھی اور لعاب بھی ٹپک رہا تھا۔ جب روٹیاں ختم ہوگئیں تو وہ ملتجی نگاہوں سے واجد کو دیکھنے لگا۔ روٹیاں اسی نے زیادہ کھائی تھیں لیکن وہ اب بھی بھوکا تھا۔

''خانقاہ میں کھانے کو کچھ ضرور ہوگا۔ وہاں پہنچ کر تیری جتنی مرضی ہو کھا لینا۔'' واجد مشفقانہ انداز میں بولا۔ قبل اس کے کہ مگن کچھ کہتا واجد نے اس سے پوچھا۔

''مگن شاہ...... ہم کہاں گئے تھے؟''

اس کی ننھی آنکھیں بار بار جھپکیں۔ اس کے دہی سے تر ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر کھنچ گئے۔ اس کی پتلی مونچھ جو لبوں کے دونوں جانب جھکی تھی اسے وہ سہلانے لگا۔ وہ جواب سوچ رہا تھا۔ اچانک وہ زور سے بول پڑا۔

''نماز پڑھنے۔''

''ہاں۔ نماز ہی تھی۔ لیکن کس لئے؟''

''کس لئے؟'' مگن شاہ نے واجد کا جواب دہرا دیا۔

''اس بستی میں جس کا انتقال ہوا تھا۔ ہم اس کی نماز جنازہ پڑھانے گئے تھے۔ تاکہ خدا

اس پر مہربان ہو...... آہ ہم سب کو ایک دن مرنا ہے۔" واجد نے ایک سسکی کے ساتھ جملہ ختم کیا۔

"مرنا؟"

"ہاں مرنا۔ پہلے میں پھر تو۔ میرے مرنے کے بعد نہ جانے کیا تیرا حشر ہوگا۔" واجد نے منہ بنا کر ناامیدی کا اظہار کیا اور جہاں اس نے نماز ادا کی تھی وہیں وہ پڑ گیا۔ پیٹ بھر جانے کی وجہ سے ہلکی سی گرمی اس کے جسم میں آ گئی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے اور نالے میں بہتے پانی کا ہلکا سا شور اور ہر طرف خاموشی۔ واجد کو بڑے سکون کا احساس ہوا۔

"مگن شاہ۔ ذرا میرے پیروں کو تو دبا۔" واجد اپنے پیروں کی جانب اشارا کرتے ہوئے بولا۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے واجد کی ٹانگوں کو سنبھال لیا اور انھیں زور زور سے دبانے لگا۔

'احمق۔ تو میرے پیر توڑ رہا ہے۔" واجد کراہا۔

مگن شاہ کے ہاتھوں میں اور سختی آ گئی۔ درد کی شدت سے واجد کے چہرے پر اذیت کی شکنیں آ گئیں۔

"بس بس۔" واجد چیخا اور اس نے اپنے پیر کھینچ لئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اتنے زور سے کراہنے پر اسے ندامت ہو رہی تھی۔

لیکن مگن شاہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ وہ شخص جو اسے ڈانٹا ڈپٹا رہتا تھا، وہ اس کی طاقت سے بے بس ہو گیا تھا۔ مگن شاہ کو اسی وجہ سے خوشی ہو رہی تھی۔

"چھوکرے! میں تیری طرح مضبوط نہیں۔" واجد نے پیار سے مگن شاہ کو ڈانٹا اور چٹان پر دوبارہ پڑ گیا۔ اس نے اپنے سر کو داہنے بازو پر رکھ لیا۔ اسے سکون اور فرحت کا احساس پھر سے ہونے لگا۔

"اب میرے پیر آہستہ آہستہ دبا۔ سمجھا۔"

مگن شاہ نے حکم کی تعمیل کی۔ واجد پر ایک ایسی کیفیت چھانے لگی جس میں نہ نیند تھی اور نہ جاگنے کی خواہش۔ اس کا جی چاہا اسی طرح پڑا رہے۔ اٹھے نہیں۔

چودہ سال پہلے جب کشمیر کی جنگ بغیر کسی اہم نتیجے کے ختم ہو گئی تو واجد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اب کہاں جائے؟ سڑک مکمل ہو چکی تھی اور اس کے لئے کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ فوجی ٹرک میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے تھے اور واجد کے وہ ساتھی جو مولانا غیظ کے ہمراہ آئے

تھے وہ بھی جاچکے تھے۔ چونکہ عبادتوں میں اس کی محویت اس کی رفیق تھی اس لئے ان سب کے جانے کے بعد واجد کو کسی کی کا احساس نہیں ہوا۔ تندر سے کیمپ اٹھ چکا تھا اور اس بستی کے باسی واپس آنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے ایک ہنگامہ رہتا تھا۔ واجد کو خاموشی اور تنہائی کی طلب تھی اور ان کی تلاش میں اس سڑک پر چل دیا جس کی تعمیر میں وہ مصروف رہا تھا۔ وہ سڑک چند میل کے بعد ایک پہاڑی کے دامن میں ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد کھڑی چڑھائی تھی جس پر مسلسل چڑھنے اور اترنے کی وجہ سے سیڑھیاں سی بن گئی تھیں۔ جنگ کے دوران غیر فوجیوں کو اوپر جانے کی ممانعت تھی۔ واجد نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ اوپر جا رہے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ اوپر پہاڑی پر دور دور تک ہموار جگہ تھی اور جو بستی وہاں تھی وہ گولہ باری کی وجہ سے جل چکی تھی۔ یہی حال آس پاس کے کھیتوں کا بھی تھا۔ لوگوں نے اس بستی کا نام پنجنی بتا یا اور ہموار جگہ کے شمال میں جو پہاڑی تھی اور اس سے پرے جو پہاڑ کی چوٹی نظر آتی تھی وہ کالا دیو کے نام سے مشہور تھی، اور اب وہاں پاکستانی فوج کے بٹالین کی ایک کمپنی کا کیمپ تھا۔ پنجنی کے مغرب میں بھی کھڑی ڈھلان کے نیچے ایک وادی تھی جو دور دور تک چلی گئی تھی۔ جنگ بندی لائن کالا دیو اور وادی کے مغرب میں تھی۔

واجد نے پنجنی کے باسیوں کی ہمت بندھائی اور گھروں کے دوبارہ تعمیر کرنے میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کام اور عبادت سے جب اسے فرصت ہوتی تو بستی سے ذرا فاصلے پر جو تنہا اخروٹ کا درخت تھا اس کے نیچے وہ پڑا رہتا۔ گرمی کے دن تھے اس لئے رات اگر خنک بھی ہوتی تو اسے تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ بستی والے اس کی عجیب سی خاموشی اور ایک عجیب سے علیحدہ پن سے اسے خدا کی جانب سے بھیجا ہوا بزرگ سمجھنے لگے۔ انھوں نے مٹی اور پتھروں سے درخت کے قریب برآمدے کے ساتھ دو کوٹھریاں بنا دیں۔ ان ہی دنوں ایک غار میں واجد کو مگن شاہ اپنے ماں باپ کے ساتھ روپوش ملا۔ اس وقت اس کی عمر پانچ سال تھی۔ اس کے والدین ضعیف اور انتہائی غریب تھے۔ واجد نے انھیں پناہ دی۔ مگن شاہ کی ماں کھانا پکانے لگی اور باپ واجد کی خدمت اور گھر کی صفائی اور چشمے سے پانی لانے کی ذمہ داری پوری کرنے لگا۔ جب کھیتوں میں مسلسل اچھی فصلہو نے لگی اور بادوباراں سے بھی پنجنی میں کوئی تباہی نہیں آئی، تو لوگ واجد کے اور بھی معتقد ہو گئے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اس کا گھر خانقاہ مشہور ہو گیا۔ خانقاہ سے نکل کر آس پاس کی بستیوں میں جنازے کی نماز پڑھانے جانا،

واجد کا وہ نیک کام تھا جس سے لوگ اور بھی زیادہ متاثر تھے۔ اس کا شادی نہیں کرنا لوگوں کو کچھ عجیب ضرور محسوس ہوا لیکن اسے خدا کی مرضی سمجھ کر کسی نے اس بابت کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی۔ بٹالین کے سپاہی یا افسر کبھی ادھر سے گذرتے تو خانقاہ میں رک کر عقیدت کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں مگن شاہ کے والدین ملیریا میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ اس کی پرورش واجد نے اپنے ذمہ لے لی۔ مگن شاہ عام گفتگو کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ہر وقت ہشاش بشاش رہنے کی وجہ سے لوگ اسے مگن پکارنے لگے تھے اور یہی اس کا نام پڑ گیا۔ اس کے والدین کے مرنے کے بعد واجد نے اس کی ہر طرح دیکھ بھال کی، اسے اپنی گندگی کو صاف کرنا سکھایا اور ایسے کاموں کو کرنے کی اسے تربیت دی جنھیں ہر روز ایک ہی طرح سے انجام دینا ہوتا تھا اور جنھیں کرنے کے لئے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن واجد کی بے پناہ محنت کے باوجود وہ قرآن کی آئتیں یاد نہیں کر سکا۔ مگن شاہ جیسے بے یار و مددگار انسان کی پرورش واجد کو ثواب کا کام محسوس ہوا۔ وہ اس کا خادم، بیٹا اور ایک ایسا رفیق تھا جس کے سامنے واجد اپنے دل کا حال بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتا تھا۔ واجد نے شادی نہیں کی۔ نوراں کی جدائی کے وجہ سے جو خلا اس کی زندگی میں رہ گیا تھا وہ کبھی پُر نہیں ہوا۔ طویل مدت کے بعد بھی وہ نوراں کو نہیں بھلا سکا تھا۔ جو کچھ بھی اس نے نوراں کے ساتھ کیا وہ گناہ ضرور تھا، جس کے لئے اس نے خدا سے معافیاں بھی مانگیں، لیکن وہ گناہ اس نے کیا تھا، نوراں نے نہیں۔ ایک بے بس عورت نے سہارے کے لئے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور وہ بھاگ کر چلا آیا۔ جو اذیتیں اس نے اٹھائی تھیں ان کے باوجود نوراں کی تلاش میں اسے جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے وفا کی اب یہی صورت تھی کہ کوئی اور عورت اس کی زندگی میں نہیں آئے۔

اس وقت پیر کے دبائے جانے سے جو فرحت واجد کو ہو رہی تھی اور جس سکون کا اسے احساس ہو رہا تھا وہ نوراں کی یاد لے آیا۔ جو لمحات وہ اس کے ساتھ گزارتی تھی اس میں وہ ایسی ہی خدمتیں کرتی تھی۔ جو آرام اسے ملتا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا۔

"میں مضبوط......" مگن شاہ اچانک بولا۔ وہ واجد کے پیروں کو جھٹک رہا تھا۔

"سچ مچ؟ پھر ڈھلان پر اترتے ہوئے تو ڈر کیوں رہا تھا؟"

"پتہ نہیں۔" مگن شاہ بیچارگی میں سر ہلا رہا تھا۔

"تجھے جنگل سے خوف نہیں آتا؟"

''نہیں۔''

''تو وہاں لکڑیاں لانے ہر روز جاتا ہے۔''

''ہاں۔''

''وہاں اگر بھیڑیے تجھے پکڑلیں تو؟'' واجد نے دانت نکال کر اور اپنے چہرے کو خوفناک بنا کر کہا۔

مگن شاہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔ ''میں لڑونگا۔''

''کیا؟ تو ان سے لڑے گا؟''

مگن شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن تو اپنے باپ سے کیوں نہیں لڑتا ہے؟''

''باپ؟''

''ہاں۔ میں تیرا باپ ہی تو ہوں۔'' واجد نے نیم سنجیدگی سے کہا۔

مگن شاہ نے نفی میں زور سے سر ہلایا۔

واجد کو صدمہ ہوا۔ گو وہ اس کا حقیقی باپ نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک باپ ہی کی طرح مگن شاہ کی دیکھ بھال کی تھی۔

''اگر میں تیرا باپ نہیں ہوں پھر میں تیرا کیا ہوں؟''

مگن شاہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ احمقوں کی طرح واجد کو گھورنے لگا۔ واجد کے پیروں پر مگن شاہ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ واجد سے اس کی کیا رشتہ داری تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے واجد سے وابستگی ضرور تھی۔ ایک ایسی قربت جس میں اسے اپنے پاس دیکھنا مگن شاہ کو مطمئن رکھتی تھی۔ اسی لئے اس کا حکم ماننا اور اس کی خدمت مگن شاہ ضروری سمجھتا تھا۔ اسے جب بھی فرصت ملتی تو وہ پنجنی کے قریب جنگل میں نکل جاتا جہاں طوطوں کی آوازوں سے آواز ملاتا یا موروں کے رقص دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا۔ پنجنی کے رہنے والے سمجھتے تھے کہ واجد کی صحبت میں مگن شاہ بھی ایک مجنون بزرگ ہو گیا ہے جبھی ہر وقت مسکراتا یا ہنستا رہتا ہے۔ انھوں نے واجد کو مگن شاہ سے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے اکثر دیکھا تھا۔ اسی لئے وہ اسے مگن شاہ پکارنے لگے تھے۔

مگن شاہ دوبارہ واجد کے پیر دبانے لگا۔ اس کی آنکھیں کبھی واجد کے چہرے، کبھی آسمان اور کبھی درختوں کی جانب جاتیں۔ کچھ اس کے دل میں تھا جسے بولنے کی اسے بے چینی

تھی۔ لیکن وہ کس طرح بولے اور کیا کہے، وہ اسے مشکل محسوس ہو رہا تھا۔

''مگن شاہ۔ تو نے جواب نہیں دیا۔ بتا میں تیرا باپ کیوں نہیں ہوں؟'' واجد کے لبوں پر اداس مسکراہٹ تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا بیٹا ہوتا تو اس طرح کا جواب نہیں دیتا۔

''تم روتے نہیں ہو۔'' مگن شاہ نے معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''روؤں؟ کیوں؟ کس کے لئے روؤں مگن؟'' واجد چونک پڑا تھا۔ اس کی ابروئیں حیرت سے سکڑ گئی تھیں۔ وہ خوفزدہ مگن شاہ کو تک رہا تھا۔ کیا مگن شاہ واقعی ایک بزرگ ہے؟ خدا جسے چاہے صاحب کرامات بنا سکتا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو کیا مگن شاہ کو میرے گناہوں اور میری ذلتوں کا علم ہو گیا ہے؟ واجد کو خیال آیا۔

''جب میں بیمار پڑتا ہوں تو تم میرے لئے روتے نہیں ہو۔''

جیسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ مگن شاہ کی زبان پر الفاظ اچانک آنے لگتے اور اس کی بات چیت عام انسانوں جیسی ہونے لگتی۔ اس کے دھند سے بھرے ذہن میں چند یادیں محفوظ تھیں۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ بیمار پڑتا تھا تو اس کا باپ چیخ چیخ کر رویا کرتا تھا۔ اس کا جواب سن کر واجد نے اطمینان کا سانس لیا۔

''مگن شاہ۔ تیرا باپ کہاں ہے؟''

''وہاں۔'' مگن شاہ نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہونے والے آفتاب سے منور ہو رہا تھا۔

''اور تیری ماں کدھر ہے؟''

مگن شاہ نے انگشت شہادت آسمان کی جانب بلند کی۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے اور ان کی خاموشی ویرانے کی خاموشی سے ہم آہنگ ہو گئی۔ نہ چڑیوں کی چہکار، نہ کسی اور انسان کے پیروں کی چاپ اور نہ کسی جانور کی آہٹ۔ درختوں کی شاخوں میں بھی کوئی حرکت نہیں۔ سوائے نالے میں بہتے پانی کے سب کچھ خاموش اور افسردہ۔

اچانک تین سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں سنبھالے پہاڑ کی ڈھلان پر جو جنگل تھا اس سے نکل کر ان کی جانب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ رات بھر گشت کرنے کے بعد واپس آ رہے

تھے۔ ان کے قمیص کے بٹن کھلے تھے اور ان کی پتلون کی کریزیں مٹ چکی تھیں۔ جوں ہی انھوں نے واجد کو پہچانا ان کی ساری تھکان مٹ گئی اور وہ مودبانہ اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ادب سے اسے سلام علیکم کہا۔ ان میں جو حولدار تھا وہ عاجزی سے بولا۔

''خدا کی مہربانی ہے۔ صبح ہی صبح تمہاری زیارت ہو گئی۔''

واجد کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت آ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن مگن شاہ کے ہاتھ اس کے پیروں پر ہی رہے۔ واجد نے زیر لب دعا پڑھی اور باری باری تینوں سپاہیوں کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

''مگن شاہ۔ تم بھی ہمارے لئے دعا کرو۔'' حولدار نے احترام سے اسے مخاطب کیا۔

تینوں سپاہی واجد کے سامنے تعظیماً جھکے ہوئے تھے۔ مگن شاہ نے تینوں کی پیٹھ پر زور سے مکے مارے اور ساتھ ہی بلند آواز میں اللہ اکبر کہا۔ سناٹے میں مگن شاہ کا نعرہ ہیبت ناک تھا اور مکے کی ضرب اتنی سخت تھی کہ سپاہیوں کے چہروں پر تکلیف سے شکنیں پڑ گئیں۔ سپاہیوں میں سے ایک جس کی گھنی مونچھیں تھیں، اس نے کہا۔

''بزرگو! ہم بڑے گنہگار ہیں۔ اللہ کو یاد نہیں کرتے۔''

''حضرت...... ہمیں بھی عزت بخشو۔'' سپاہیوں میں جو سب سے لمبا تھا، وہ بولا اور واجد کے پیر دبانے لگا۔ باقی دونوں بھی اسی کار خیر میں شامل ہو گئے۔

واجد نے خوشی سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا چہرہ آسمان کی جانب کر دیا۔ وہ صدق دل سے ان کے لئے سرگوشیوں میں دعائیں مانگنے لگا۔ سپاہی اور بھی خوش ہو گئے۔ وہ پیرومرشد جو زیادہ تر اپنی خانقاہ میں بند رہتا تھا اس کی نہ صرف زیارت ہو گئی تھی بلکہ اس کی خدمت کا موقعہ بھی انھیں مل گیا تھا۔

''چپ شاہ۔ تم اتنے سویرے اس علاقے میں گھومتے رہتے ہو۔ تمھاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہم پرانے فوجی ہیں اس لئے تمھیں جانتے ہیں۔ لیکن اب پلٹن میں نوجوان چھوکرے آ گئے ہیں جو تمھیں دور سے نہیں پہچان سکتے۔ وہ تمھیں دشمن سمجھ کر تم پر گولی چلا سکتے ہیں۔'' حولدار نے سمجھانے کی کوشش کی۔

واجد نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے لاپرواہی کا اظہار کیا اور سلام علیکم کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اور مگن شاہ سڑک کی جانب چل دیے۔ وہاں پہنچ کر مگن شاہ نے سینہ اور آنکھیں

نکال کر بڑے جوش سے اللہ اکبر کہا۔ رائفل بردار سپاہیوں کو دیکھ کر وہ ترنگ میں آ گیا تھا۔

وادی میں ابھی تک دھوپ نہیں پھیلی تھی۔ واجد اور مگن شاہ گھنے پیڑوں کے سائے میں اس بلندی کی جانب جا رہے تھے جہاں سڑک گم ہو جاتی تھی۔ نشیب میں کھڑے سپاہیوں کو وہ کسی ماورائی ہیولے کی طرح لگے۔ ان پر سپاہیوں کی نگاہیں گڑی ہوئی تھیں۔

''مگن شاہ مجذوب ہے۔ وہ دن رات خدا کی یاد میں گم رہتا ہے۔ اس کے کاموں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے ہم بندے کتنے حقیر ہیں، اسی لئے وہ ہر وقت ہنستا رہتا ہے۔ اس کی نوجوانی اور بھولپن سے دھوکا مت کھاؤ۔ اسے پتہ ہے آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ شاید چپ شاہ سے زیادہ بڑا بزرگ ہے۔ جبھی اس کا مکّہ لوہے کی طرح بھاری تھا۔ اللہ تیرے راز کو کون سمجھ سکتا ہے۔'' خیالوں میں گم حولدار نے اپنی ننھی داڑھی کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے رائے زنی کی۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اونچے پہاڑوں اور جنگل کے درمیان انھیں اپنے ادنیٰ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

۸

صبح ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے باہر بادلوں کی وجہ سے کمھلائی ہوئی دھوپ درخت اور بستی کے گھروں پر پھیلی نظر آئی۔ دیر سے اٹھنے والی نوراں یونہی پڑی رہی۔ ہر روز کی طرح آج کا دن بھی کل کی طرح گزارنے کا خیال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ اس کی نگاہ شاداں کی خالی کھٹیا پر گئی جو کچھ دیر سے خالی تھی۔ اچانک باہر سے اس کے کراہنے کی آواز آئی۔ نوراں گھبرا گئی۔ وہ بستر سے اٹھ کر تیزی سے باہر گئی۔ شاداں گھر کی دیوار کی اوٹ میں بیٹھی الٹیاں کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ اور قے کے زرد پانی سے داغدار تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی اور اس کا سبز دوپٹہ زمین پر گرا تھا۔

"شاداں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تو نے کون سی بری چیز کھائی ہے؟" نوراں مضطرب ہو کر بولی اور شاداں کو اس نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

"مجھے نہیں پتہ ہے ماں۔ تو جانتی ہے کچھ کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا ہے۔" شاداں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ تھکان سے اس کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ چند ہفتوں سے اس کا کھانا پینا نہ صرف برائے نام تھا بلکہ وہ صبح کے وقت متلی بھی محسوس کرتی رہتی تھی۔

"کیا یہ ماں بننے والی ہے؟" نوراں نے سوچا۔ ساتھ ہی جیسے کسی کے سخت ہاتھ نے اس کے دل کو مسل دیا۔ یہ ناممکن تھا۔ اس نے بیٹی پر عقاب کی طرح نگاہ رکھی تھی۔ جب تک اس نے زری خاں سے شادی نہیں کی تھی، جب بھی کوئی گاہک آتا تو وہ ساتھ والی کوٹھری میں اس

کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اپنی کوٹھری میں چادر تان دی تھی جس کی دوسری جانب شاداں سوتی تھی۔ یہ سلسلہ بیٹی کی نوجوانی کے آغاز کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔

نوراں نے چبھتی ہوئی نگاہ شاداں پر ڈالی۔ وہ مرجھائی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کی گلابی رنگت غائب ہو چکی تھی۔ اگر یہ ماں بننے والی ہے تو اس کے بچے کا باپ کون ہے؟ اس خیال کے ساتھ نوراں کا چہرہ اتر گیا اور شاداں کے گرد اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔

''ماں...... مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' شاداں کمزور آواز میں بولی اور اپنے سر کو اس نے نوراں کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''مجھے نہیں پتہ بیٹی۔ تو بتا۔''

''ماں...... میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ مجھے دوا کی ضرورت ہے۔ مجھے حکیم صاحب کے پاس لے چل۔''

''شاداں...... کوٹھری کے اندر آ۔'' بیمار بیٹی ماں کے پیچھے اندر آکر چارپائی پر پڑ گئی۔ نوراں نے دروازے کو بند کیا۔ تاریکی چھا گئی۔ اندھیرے کی وجہ سے شاداں اپنی ماں کے چہرے پر غصے کو نہیں دیکھ سکی۔

''شاداں...... سچ سچ بتا...... تیرا مہینہ کب آنے والا تھا؟''

''چھ ہفتے پہلے۔ ماں۔ میں نے تجھے بتا تو دیا ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔'' شاداں دھیمی آواز میں بولی۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا ایک بازو اس کی پیشانی پر تھا۔

''کسبی۔ ناپاک۔ اٹھ میری چارپائی پر سے۔ بتا تو کس مرد کے ساتھ ننگی ہوئی تھی؟''

مارے ہیبت کے شاداں کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے نوراں کو اجنبی آنکھوں سے تکا۔

''ماں...... تو کیا کہہ رہی ہے۔ میں سمجھی نہیں۔''

''تو ضرور سمجھتی ہے۔ اگر تو نہیں جانتی تو میں جانتی ہوں۔ یہ تیرا املیوں کو اچانک پسند کرنے لگنا۔ انھیں بار بار چبانا۔ تیرے مہینے کا وقت پر نہیں آنا۔ بیوقوف کتیا۔ تو ماں بننے والی ہے۔ بتا تیرے ساتھ عیش کس نے کیا ہے؟''

نوراں کے منہ سے الفاظ تھوک کی طرح جھڑے اور اس نے زور سے ایک طمانچہ شاداں کو جڑ دیا۔ پھر اس پر تھپڑ اور گھونسے برسنے لگے۔

"ماں...... ماں...... یہ ظلم مجھ پر مت کر۔ رسول واسطے اتنے زور سے مجھے نہ مار۔ تو نے جو کہا وہ سچ نہیں۔ وہ سچ نہیں ہو سکتا ماں...... مجھے نہ مار...... میں بیمار ہوں۔ بے گناہ ہوں۔ ماں...... ماں...... ماں۔"

بیٹی کو بے تحاشہ مارنے کی وجہ سے نوراں تھک کر زمین پر ڈھیر ہو گئی اور گھٹنوں میں سر چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔ اسے شدید خواری اور بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ ماضی میں جب کبھی اس نے عزت بیچی اور اسے ذلت کا اگر احساس ہوا، تو یہ خواری اس کی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی بیٹی خوار کر دی گئی تھی۔ نوراں کی انا گندے کیچڑ سے غلیظ کر دی گئی تھی۔ اس نے شاداں کو پاک دامن رکھنے کی قسم کھائی تھی اور اپنی بیٹی کو کسی اچھے انسان سے بیاہنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تھا۔ یہی اس کے خواب تھے جن کے سہارے وہ زندگی بسر کرتی رہی تھی۔ ورنہ اس کی زندگی میں تھا ہی کیا؟ اس کی وقعت محض ایک فاحشہ جیسی تھی، اور وہ اس حال کو محض ان مردوں کی وجہ سے پہنچی تھی جن پر کبھی اس نے اعتبار کیا تھا۔ ان مردوں میں خدا کا وہ سچا خادم بھی تھا اور اب اس کے شوہر کو اس کے جسم ہی کی طلب رہتی تھی۔ جس کی ضرورت جب اسے ہوتی تھی تو وہ اس کے پاس آتا تھا۔ وہ گھر سے بے گھر ہوئی۔ کوٹ فتح خان میں جن سے اسے رفاقت محسوس ہوتی تھی، ان سے ہمیشہ کے لئے وہ دور ہو گئی۔ وہ غلاظت میں رینگتے کیڑے سے بھی بدتر تھی۔
نوراں اپنی بے وقعتی پر بے تحاشہ رونے لگی۔ شاداں اپنی اذیت کو بھول گئی۔ اس نے اپنی ماں کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نوراں کے قریب سرک کر آ گئی۔ اس کے پیر پر شاداں نے نرمی سے ہاتھ رکھا اور پھر ماں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ شاداں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

"ماں...... مت رو...... رسول واسطے اس طرح نہ رو۔ میں بے گناہ ہوں۔ کسی مرد نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ بستی کا کوئی بھی شخص مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ باپ جب آئے تو تم اس سے بھی پوچھ سکتی ہو کہ میں نے کوئی برائی کی ہے یا نہیں۔" شاداں نے منت کی۔

بیٹی کے منت بھرے الفاظ تیر کی طرح نوراں کے دل پر لگے۔ اس کی نگاہ شاداں کے چہرے پر گئی۔ جس کی آنسو سے بھری سیاہ آنکھیں ماں کو خود پر قابو پانے کے لئے کہہ رہی تھیں اور جس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ نوراں نے اپنے کرتے کی آستین سے اپنے نم گالوں کو خشک کیا۔ شاید میری سمجھ غلط ہو۔ اس نے سوچا اور بولی۔

''آ...... میں تیرا منہ دھو دیتی ہوں۔ اس سے تیری قے کی بو آ رہی ہے۔ میں تجھے کوٹ فتح خاں لے چلتی ہوں۔ وہاں ایک تجربہ کار عورت ہے جس نے مجھے جنوایا تھا۔ وہ بتا دے گی کہ تجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں نے جو سمجھا ہو شاید وہ ٹھیک نہیں ہو۔ ممکن ہے تو سچ مچ بیمار ہو۔ اللہ کرم والا ہے۔ وہ ہم پر ضرور مہربان ہوگا۔'' نوراں کے لہجے میں پیار اور مصالحت تھی۔

کچھ دیر بعد ماں اور بیٹی کوٹ فتح خان کی جانب جا رہی تھیں۔ آسمان پر بادل تھے۔ کھیتوں میں گیہوں کی بالیوں کی زرد رنگت مسلی ہوئی تھی۔ شیشم کے درخت پُرسکون تھے اور ان کی ڈالیوں میں نہ جنبش تھی اور نہ ہوا کی سرسراہٹ۔ وہ جھکی ہوئی خاموش نوحہ خواں تھیں۔ نوراں اور شاداں ایک دوسرے کے قریب چل رہی تھیں۔ ایک دوسرے کی محافظ۔ ایک دوسرے کی نگہبان۔ اپنے خیالوں میں گم اور اپنے خیالوں سے پریشان۔

کوٹ فتح خان کے سرے پر جو ننھا سا گھر تھا، اس کی بوسیدہ دیواروں پر اُپلوں کے داغ تھے اور لکڑی کا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ نوراں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے باریک لیکن چبھتی آواز آئی۔ ''جا گو...... جا گو۔'' تالے میں کسی نے کنجی ڈالی اور دروازہ آہستہ سے کھلا۔ سامنے خشک لکڑی جیسی سوکھی ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ جسم پر ڈھیلا سیاہ کرتا اور میلی، ٹخنے کے پاس سے پھٹی شلوار۔ عورت کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا اور سر کے سارے بال سفید تھے۔ اس کی کمر جھکی تھی اس لئے وہ گردن کو سارس کی طرح تان کر دونوں عورتوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ننھے آنگن کے گرد جو دیوار تھی اس پر ایک جانب جو پنجرہ ٹنگا تھا اس میں ایک طوطا اپنی منی آنکھوں سے سبھوں کو تکتا ہوا۔ ''جا گو۔ جا گو۔'' کی چہکار لگا رہا تھا۔ ضعیف عورت کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔

''نوراں!'' اس کے پوپلے منہ سے صدا بلند ہوئی۔ ''تو بھی اپنی نانی دلریا کو بھول گئی؟'' بوڑھی عورت نے پیار بھرے لہجے میں ملامت کی اور اپنے بال کی چوٹی کو کَسنے لگی۔

''نہیں...... نہیں۔ میں نہیں بھولی۔ اس گاؤں میں میرا آنا نہیں ہوتا۔ شوہر موجود ہے وہ ضرورت کی چیزیں لے آتا ہے۔''

''آ...... اندر آ۔ یہ تیری بیٹی ہے؟ اللہ کی رحمت۔ نوراں تو اب بھی جوان ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو جوان لڑکی کی ماں ہے۔ تیری بیٹی بالکل تیری طرح ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سگی

بہنیں میرے سامنے کھڑی ہیں۔ ویسا ہی گیندے کے پھول کی طرح رنگ، بھوری آنکھیں جیسے شیشے کی کٹوریوں میں شہد بھرے ہوں اور سر کے بال اسی طرح گھنگریالے۔ اللہ کا کرم۔'' دلریا نے آخری جملہ ادا کرتے وقت آسمان کی جانب ہاتھوں کو بلند کر دیا۔

نوراں خوش ہوگئی اور شاداں بھی مسکرانے لگی۔ تینوں ننھے سے آنگن میں بیٹھ گئیں۔ کسی زمانے میں دلریا کوٹ فتح خان میں بچے جنوانے کا کام کیا کرتی تھی۔ لیکن اب ضعیفی کی وجہ سے ایسی محنت کے لائق نہیں رہی تھی اس لئے ناداری کی حالت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ نوراں نے ایک روپیہ دلریا کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیا، اور اس کے کان میں سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ دلریا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ شاداں کی سمجھ میں کچھ کچھ آگیا۔ وہ کانپ گئی اور اس کا منہ خشک ہو گیا۔

''اس کی کتنی عمر ہے؟''

''پندرہ......'' نوراں نے دلریا کو جواب دیا۔

''جا...... کوٹھری میں جا کر چارپائی پر لیٹ جا۔'' دلریا نے شاداں کو حکم دیا اور ساتھ ہی اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہتی ہوئی اٹھی۔

کوٹھری میں بوسیدہ کپڑوں اور سرسوں کے تیل کی بو تھی۔ پھونس کی چھت میں کوئی شے سرک رہی تھی۔ نیم وا دروازے سے دن کی روشنی کوٹھری کی تاریکی میں شگاف ڈال رہی تھی۔ شاداں کو برہنہ چارپائی کی ڈوریاں پشت میں گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ خوف سے اس کا دل منجمد ہونے لگا۔

''شلوار اتار دے۔'' دلریا پھنکاری۔

شاداں کو محسوس ہوا کہ کسی خوفناک جادوگرنی کے حکم نے اسے مجبور کر دیا ہے۔ اس میں انکار کی طاقت نہیں رہی۔ کچھ دیر بعد اسے دلریا کی انگلیاں اس کے جسم کے اس حصے کو ٹٹولتی محسوس ہوئیں جسے اس کی ماں بھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ اسے شدید گھن کا احساس ہوا۔ نہ صرف دلریا بلکہ اپنے آپ سے بھی جو اس ذلت کو برداشت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور دوپٹے سے چہرے کو ڈھک لیا۔

''چھوکری۔ تو ماں بننے والی ہے۔ کس نے تجھے اس حال میں کیا ہے۔ کیا وہ کوٹ فتح خان کا رہنے والا ہے؟'' دلریا نے رازدارانہ پوچھا۔

شاداں چپ رہی۔ انوکھے جذبات نے اسے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ اسے اپنی ذات کی تکمیل کا خوشگوار احساس ہوا۔ ماں بننے کے تصور سے اسے بے پناہ مسرت ہوئی۔ میں ماں بننے والی ہوں تو باپ کون ہے؟ وہ اپنے خوابوں میں اکثر دلہن بنی تھی۔ اکثر اس کی جوانی سے سرشار جسم نے خواب میں بہت کچھ کیا تھا۔ وہ سب کچھ جو وہ زبان سے کسی کو نہیں کہہ سکتی تھی۔ جب خواب کسی کو نہ بتائے جائیں تو سچ ثابت ہو جاتے ہیں۔ شاداں سوچ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے برہنہ جسم کو ڈھک بھی رہی تھی۔

کوٹھری کے باہر نوراں کو دلریا سرگوشیوں میں بڑے وثوق سے بتا رہی تھی۔ ''تیری بیٹی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اس کا باپ کون ہے اس نے نہیں بتایا، اور اگر وہ بتا بھی دیتی تو وہ شخص شاداں کو بیاہنے سے رہا۔ لیکن نوراں تو فکر نہیں کر، تیری دلریا ابھی زندہ ہے۔ اس کی بانس کی تیلیاں اب بھی موجود ہیں۔ انھیں سرسوں کے تیل میں بھگو کر کیسے استعمال کرنا چاہئے اسے اب بھی اچھی طرح پتہ ہے۔ تیری چھوکری کو زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ اس کے پیٹ سے سب کچھ نکل جائے گا۔''

نوراں کا دل بیٹھ گیا اور چہرے کی رنگت سفید پڑ گئی۔ حاملہ عورتوں کے حمل گرانے میں دلریا کے ہاتھوں کتنی عورتوں کی جانیں گئی تھیں۔ نوراں کو پتہ تھا۔ وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دے گی۔ اس کی نگاہ شاداں پر پڑی جو ماں کی حالت دیکھ کر اداس ہوگئی تھی اور اس سے نگاہیں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''میں سوچوں گی۔'' نوراں دھیمے سے بولی اور اٹھ کر کٹیا سے باہر نکل گئی۔ شاداں بھی اس کے پیچھے ہولی۔ پنجرے سے طوطا پکارا۔ ''جاگو جاگو۔''

چلتے چلتے وہ اس چڑھائی پر رک گئی جو اس کی بستی سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کی طاقت جواب دینے لگی تھی۔ ایک تھکان اسے مفلوج کیے دے رہی تھی۔ اس کی بیٹی بھی کسبی کی زندگی گزارے گی۔ وہی گندگی اس کا بھی نصیب بنے گی جسے اس نے مجبوراً قبول کیا تھا۔ تیزاب میں ڈوبی حقیقتیں کرب بن کر اسے جلا رہی تھیں۔ خوابوں کا وہ رنگین شیشہ جس میں روشنیاں دمکتی اسے کبھی نظر آئی تھیں وہ اب چور ہو گیا تھا۔ ہمیشہ کے لئے۔ آسمان میں گدلی بدلیاں اڑتی ہوئی نہ جانے کہاں جا رہی تھیں۔ انسانوں کے قدموں سے گھسی پگڈنڈی کسی رکھوالے کے گھر کے پاس سے گزرتی تھی۔ لیکن اب وہ غیر آباد

تھا۔ اس کی چھت گری تھی اور دروازے ٹوٹے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک بکری، جس کے ایک پیر میں کوئی نقص تھا، لنگڑاتی ہوئی سوکھی گھانس چر رہی تھی۔ شاداں گھبرائی ہوئی اور پریشان نوراں کے پاس کھڑی تھی۔ اسے ماں کا اس طرح خاموش رہنا بہت دکھ دے رہا تھا۔ وہ اچانک بہت دور چلی گئی تھی اور بیٹی کو وہاں تک پہنچنا غیر ممکن لگ رہا تھا۔ ماں کچھ بولتی...... اسے ڈانتی...... کچھ بھی کہتی...... شاداں کو سن کر اطمینان ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوجاتا کہ ماں پاس ہی ہے اور وہ اس کا ہاتھ کسی وقت بھی پکڑ سکتی ہے۔ دونوں دیر تک چپ چاپ کھڑی رہیں۔ اچانک نوراں نے چبھتی ہوئی نگاہ شاداں پر ڈالی اور اس سے سوال کیا۔

''اب چھپانے کا فائدہ نہیں ہے۔ بتا تیرا عاشق کون تھا۔ میں تیرے باپ سے کہوں گی کہ اسے پکڑ کر لائے اور اس سے تیرا بیاہ کردے۔''

نوراں کو پتہ تھا کہ اس کا خاوند ایک نکما اور لا ابالی انسان ہے۔ پھر بھی وہ مرد تھا۔ جس کڑی آزمائش کا سامنا ماں اور بیٹی کو تھا اس میں مرد ہونے کے ناتے وہ مدد کر سکتا تھا۔ یہی موہوم سی امید نوراں کو تھی۔ شاداں سر جھکائے خاموش کھڑی دھوپ سے جلی گھانس کو تکتی رہی۔

''کچھ بولے گی یا نہیں؟ اگر تو اپنی ماں کو نہیں بتا سکتی تو پھر کس کو بتائے گی۔'' نوراں کی آواز میں پُر درد اضطراب تھا۔

''ماں...... سچ مجھے نہیں معلوم۔ میری طبیعت اس رات کے بعد خراب ہونے لگی جس رات بابا نے ہمیں کچے آم کا شربت پلایا تھا۔ جس کے بعد ہم اتنی گہری نیند سوئے کہ دوسرے دن شام کو اٹھے۔'' شاداں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ وہ خود بھی اس راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

لیکن نوراں اس راز کو فوراً سمجھ گئی۔ اب کچھ مخفی نہیں تھا۔ کسی نے بیدردی سے چاقو اس کے دل میں اُتار دیا اور وہ درد سے تڑپ اٹھی۔ چھ ہفتے پہلے اس کے خاوند زری خاں نے کچے آم کا شربت بنا کر ماں اور بیٹی کو بڑی محبت سے پلایا تھا۔ وہ دن کچھ ایسا تھا جب اچھے کھانے کی خواہش ہوئی تھی۔ نوراں نے گھی میں ڈوبے پراٹھے بنائے تھے اور مرغی بھونی تھی۔ مرغن غذا کے بعد اس نے اور شاداں نے بھی جی بھر کر لذیذ شربت پیا۔ وہ گہری نیند نہیں سوتی تھی۔ لیکن اس رات وہ بیہوشی کی نیند سوئی۔ یہی حال شاداں کا بھی تھا۔ جو کمرے میں تنی چادر کی دوسری جانب بے سدھ سوتی رہی تھی۔ بعد میں زری خاں نے ہنس ہنس کر بتایا کہ اس نے شربت میں

بھنگ ملا دیا تھا۔" تو اس رات میرے ذلیل خاوند نے شاداں کی عزت لوٹی۔ اس کتے نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ زنا کر رہا تھا۔ یا ربا کیا میں انسان نہیں؟ تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا؟ کیا میں ہی ہر ظلم کو سہنے کے لئے رہ گئی ہوں؟ اب میں کس سے مدد مانگوں؟ کس کا سہارا لوں؟" نوراں دل ہی دل میں بولی۔

ہارے ہوئے انسان کی طرح نوراں کا سر جھک گیا۔ ماں سچ مچ ہار گئی تھی۔ وہ بیٹی کی آبرو نہیں بچا سکی۔ بیٹی بے گناہ تھی، معصوم تھی۔ پھر بھی ماں نے اسے سنگدلی سے پیٹا تھا۔ نوراں کی بے چین نگاہیں مغربی افق کی جانب گئیں۔ جہاں اڑتی دھول میں کوٹ فتح خان تھا۔ اس گاؤں کی مسجد تھی۔ مانوس حویلیاں تھیں۔ نوراں کا بچپن تھا اور جوانی تھی۔ اس کے جاننے والے تھے۔ لیکن اب وہاں اس کے لئے نہ محبت تھی اور نہ ہی اس کے دردمند تھے، اور ادھر کچھ فاصلے پر وہ ننھی بستی تھی جہاں اس نے گھر بنایا تھا وہاں بھی اس پر کسی نہ کسی شکل میں ستم ہی ٹوٹتا رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ ایسی تنہائی، ایسا اکیلا پن اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ خاموش سوالات ...... شکائتیں...... شکوے اسے کچلنے لگے۔ اس کے دل کو کوئی دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ ایک سسکی اس کے منہ سے نکل گئی۔ آنسوؤں کی دولت وہ کب کی لٹا چکی تھی۔ جی کا اب ہلکا ہونا محال تھا۔ لیکن وہ اس طرح بے سدھ نہیں کھڑی رہ سکتی۔ کچھ تو کرنا تھا۔ کوئی نئی ترکیب۔ کوئی نیا مددگار تلاش تو کرنا تھا۔ سوچ نوراں۔ اچھی طرح سوچ...... اچانک خلا سے ایک نام ہوا کے تیز جھونکے کی طرح آیا اور اس کے وجود کو ہلا گیا۔ شاہ جی! امام واجد! میرا سچا چاہنے والا۔ میں اس سے مدد طلب کروں گی۔ بے رحموں نے اسے مجھ سے چھین کر بھگا دیا ورنہ وہ مجھے نہیں چھوڑتا، اور کیا وہ میری مصیبتوں کا ذمہ دار نہیں ہے؟ اگر وہ واپس آکر مجھے لے جاتا تو آج مجھے اس دن کا سامنا تو نہیں کرنا پڑتا؟ لیکن...... تیرہ سال کے بعد اس سے ملنا اور باتیں کرنا۔ کیا بولوں گی میں اس سے؟ اور وہ کیا بولے گا؟ جو کچھ بھی ہو وہی ایک بندہ ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔ کوئی راہ دکھا سکتا ہے۔ اللہ والوں کی باتیں اللہ جلد سن لیتا ہے۔ میں اسی کے پاس جاؤں گی۔ اس کے پاس پہنچنا مشکل نہیں۔ نوراں کے دل میں خیالات تیزی سے دوڑ رہے تھے۔

کوٹ فتح خان کے آگے دنیا کیسی ہے نوراں کو علم نہیں تھا۔ وہ ناریاں تک کبھی گئی تھی۔ وہاں سے ٹرین پر چڑھ کر دور جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لیکن ڈاکوؤں اور چوروں کی صحبت نے اسے دلیر بنا دیا تھا۔ ماضی میں اس کا دل بھی چاہا تھا کہ وہ بھی اپنے عاشقوں کے ساتھ

ڈاکہ ڈالنے جائے۔ رات کے اندھیرے میں حویلیوں سے مال و اسباب اٹھا لے آئے۔ لوگوں کو لرزتے، کانپتے اور گڑگڑاتے دیکھے۔ بُرے لوگوں کی صحبت میں برائی کا ڈر اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ جب وہ اپنے جسم کا سودا کیا کرتی تھی تو اس کے گاہک اپنے جسم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے بعد اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ جنھوں نے پنجنی اور وہاں کے پیر کا ذکر کیا تھا، انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ جہلم سے بسیں میرپور جاتی ہیں اور وہیں پنجنی جانے والی سڑک بھی ملتی ہے۔ نوراں نے سوچا کہ وہ میرپور پہنچ سکتی ہے اور وہاں سے آگے بھی جا سکتی ہے۔ اگر وہاں سڑک ہے تو اس پر چلنے والے بھی ضرور ہوں گے۔ لیکن میرپور دور تھا۔ پنجنی اور بھی دور...... اور اگر وہ وہاں پہنچ بھی گئی تو کیا ضروری ہے کہ امام واجد ہی اس جگہ پیر ہو؟ شک کا کانٹا نوراں کے دل میں گڑا۔ مجھے کیا کرنا ہے، میں سوچوں گی۔ اس نے خود سے کہا۔

کسی طرح خود کو گھسیٹتی ہوئی نوراں اپنی کوٹھری تک آئی اور اپنی کھاٹ پر گر گئی۔ کسی بھی کام کو کرنے کی طاقت اس کے جسم میں نہیں رہی تھی۔ اسے شاداں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بیٹی ایک اندھے کوئیں میں گر چکی تھی، جہاں سے اس کا نکلنا آسان نہیں تھا۔ شاداں دروازے سے لگی باہر تک رہی تھی۔ اسے اپنے جرم کا احساس ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ جرم کیسے ہوا اور کیوں ہوا وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ ماں سے کچھ پوچھنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماں اسے پکار کر اپنے پاس بٹھا لے اور اس سے اسی طرح پیار سے باتیں کرے جیسے وہ پہلے کیا کرتی تھی۔ اس کی خواہش بر آئی۔

''شاداں...... میرے پاس آ۔''

بیٹی لپک کر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نوراں اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے سہلانے لگی۔ اسے بیٹی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بڑی مشکل سے بولی۔

''شاداں! میرے برے کرموں کا پھل تجھے بھی کھانا پڑا۔ پر غم نہ کر۔ پنجنی میں ہمارا ایک رشتہ دار ہے۔ وہ بہت مشہور اور اثر والا ہے۔ ہم اس کے پاس جائیں گے۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ تو کسی سے کچھ کہنا نہیں۔''

دوسرے دن نوراں کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہفتوں سے غائب زری خاں واپس نہیں آیا ہے۔ وہ سویرے ناریاں کے لیے نکل جانا چاہتی تھی۔ رات کی بچی چند روٹیاں تھیں اور ایک

پرانے بوتل میں آم کا اچار تھا۔ اس نے سب کچھ سامنے رکھا اور شاداں کو بلایا۔ اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی جب وہ ہچکچاہٹ کا اظہار کرنے لگی تو نوراں نے اسے ڈپٹ کر کھانے کے لیے کہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد نوراں نے دیوار کے قریب سے صندوق کو کھینچا اور اس کے نیچے کونے میں جو زمین تھی وہاں پر سے مٹی ہٹا کر اس پرانے کپڑے کو نکالا جس میں پچاس روپے بندھے تھے۔ اسے اس نے شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ صندوق سے دو جوڑے کپڑے اپنے اور شاداں کے لیے نکال کر اس نے ایک گٹھری بنائی اور کوٹھری کے دروازے میں تالا لگا کر بستی سے نکل گئی۔ جس کسی نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہے تو اس نے بتا دیا کہ وہ اور شاداں لاہور داتا کے دربار جا رہے ہیں۔

ناریاں جانے والی کچی سڑک برگد اور پیپل کے درختوں کے درمیان دور تک چلی گئی تھی۔ ماں بیٹی اسی پر چل دیں۔ اکا دکا راہگیر نظر آئے وہ ان پر نگاہ غلط انداز ڈال کر ان کے پاس سے نکل گئے۔ کچھ دور جا کر انھیں بوریوں سے بھری بیل گاڑی نظر آئی جو ایک کنویں کے پاس کھڑی تھی۔ گاڑی کا مالک کنویں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ نوراں اس کے پاس گئی اور منت بھرے لہجے میں بولی۔

''ویرا...... مجبور بہن کو ناریاں تک پہنچا دے۔ اللہ ثواب دے گا۔''

گاڑی بان کی رنگت دھوپ سے جلی تھی۔ اپنے منہ کو آستین سے خشک کرتے ہوئے اس نے گھور کر دونوں کو دیکھا۔

''ناریاں جانا ہے کہ کہیں اور؟''

''اسی داتا کے دربار میں حاضری دینے لاہور جا رہے ہیں۔'' نوراں نے گاڑی بان سے بغیر آنکھ ملائے جواب دیا۔

گاڑی بان کے سخت چہرے پر نرمی آگئی اس نے گاڑی کی جانب اشارہ کر کے انھیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ بیلوں کو ہانکنے سے پہلے وہ بولا۔

''داتا کو کہنا میری بیوی کو کالی کھانسی ہوگئی ہے۔ اس کے لیے دعا کر دیں۔''

نوراں نے زور سے سر ہلا کر ہامی بھری۔ بیل گاڑی چل دی۔ لمحہ بھر کے لیے نوراں کی نگاہ آسمان پر گئی جہاں بادلوں نے سورج کو ڈھک دیا تھا جس کی وجہ سے صبح بھی کجلا سی گئی تھی۔ ویران سڑک اور دور کا اجنبی سفر، نوراں کو اداسی اور پریشانی نے گھیر رکھا تھا۔ لیکن پیچھے

جانا محال تھا۔ اللہ کو یاد کرتی ہوئی وہ ناریاں پہنچ گئی۔ ٹکٹ کی کھڑکی کے پیچھے کلرک ان مکھیوں کو اڑا رہا تھا جو اس کے سامنے رکھی جوٹھی چائے کی پیالی سے اڑ کر اس کے سر کے گرد آجاتی تھیں۔ نوراں سے پندرہ روپے لے کر کلرک نے ٹکٹ اس کے حوالے کر دیئے۔ پلیٹ فارم پر نوراں، شاداں کے ساتھ اس جوان عورت کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی جو دوپٹے سے اپنے شیر خوار بچے کو ڈھک کر دودھ پلا رہی تھی۔ شاداں کی نگاہ اس بھوری کتیا پر پڑی جو لائنوں کو پار کر کے دوسری جانب جا رہی تھی۔ اس خیال سے اسے جھرجھری آگئی کہ کہیں اچانک کوئی ریل آکر اسے کچل نہ دے۔ اچانک پلیٹ فارم کے باہر جو درخت تھا وہاں سے کوؤں کا ایک غول کائیں کائیں کرتا ہوا ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ گاڑی آئی اور انجن کا دھواں لہراتا ہوا سیاہ چادر بن کر اڑنے لگا۔ نوراں کو عورت اور اس کے خاوند کی وجہ سے اس ڈبے کی شناخت میں آسانی ہوئی جہاں اسے بیٹھنا تھا۔ مسافروں کی بھیڑ تھی نوراں کو کسی طرح کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔ وہ دیوار سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔

۹

کوٹ فتح خان سے نوراں اور شاداں کو نکلے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ میر پور میں تھیں۔ نیا قصبہ...... نئے لوگ...... ان کی نئی بول چال، اور ساتھ ہی یہ بھی خوف کہ پہنچنے کے بعد وہاں امام واجد کے بجائے کوئی دوسرا ہوا تو پھر وہ کیا کرے گی؟ یہ سوال بار بار نوراں کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اسے شدید گھبراہٹ ہوئی۔ وہ بوکھلائی ہوئی ایک سڑک سے دوسری پر گئی۔ ایک دُکان کے بعد دوسری دُکان کے سامنے سے گزری۔ پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ وہ اور شاداں اتنی دور بہ آسانی آ گئے تھے۔ سوائے سفر کی صعوبتوں کے انہوں نے کوئی اور تکلیف نہیں اٹھائی تھی۔ نوراں کے پاس اب بھی پیسے بچے ہوئے تھے۔ اگر کوئی آسرا نہیں ملا تو کسی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھیک مانگ کر گزارا کرے گی۔ نوراں نے ٹھان لیا تھا۔

ماں اور بیٹی بھوکی تھیں۔ دوپہر آ چکی تھی۔ صبح کے بعد سے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ نوراں ایک ہوٹل کی جانب بڑھی۔ چولھے پر چڑھی دیگچی سے پکے گوشت کی مہک آ رہی تھی اور تنور سے گرم روٹیاں نکالی جا رہی تھیں۔ نوراں کی رال ٹپک پڑی۔ اسے پیٹ میں کلبلاہٹ محسوس ہوئی۔ ہوٹل خاکی وردی میں ملبوس سپاہیوں سے بھرا تھا۔ وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ چند کی گرسنہ نگاہیں نوراں اور شاداں پر جم گئیں۔ دونوں وہاں سے جلد ہٹ گئیں۔ سڑک کے کنارے ایک چائے والا خوانچے میں بتاشے سجائے چائے گھونٹتا نظر آیا۔ نوراں کو دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور چائے کو زور زور سے گھونٹنے لگا۔ اس کے گندے اشارے کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ نوراں اسے زیرِ لب گالی دیتی ہوئی اس کے

سامنے سے تیز گزر گئی۔ ایک بوڑھا پھل بیچنے والا نوراں کو شریف لگا۔ اس سے نوراں نے تربوز خریدا جسے اس کی فرمائش پر دوکان والے نے کاٹ دیا۔ ماں اور بیٹی ہوٹل کے سائے میں بیٹھ کر تربوز کھانے لگیں۔ شاداں بھی نئی جگہ میں خود کو پا کر گھبرائی ہوئی تھی۔ لیکن ماں ساتھ تھی جو اسے ہر مصیبت سے بچالے گی، شاداں کو یقین تھا۔ وہ ماں سے لگی بیٹھی تھی۔ تربوز کا ٹھنڈا گودا اس کے منہ میں گھل رہا تھا اور پھل کا عرق اس کے منہ سے نکل کر اس کی کلائی اور ان میں پہنی گلابی چوڑیوں پر بہہ رہا تھا۔ تربوز کھانے کے بعد دونوں کی جان میں جان آ گئی۔

جہاں لاریاں کھڑی تھیں وہاں نوراں نے پنجنی جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ پنجنی جانے والے مسافروں کو پیر گلی کی ترائی میں پونا اور سمانی نام کے گاؤں کے پاس اتر جانا پڑتا تھا اور پھر وہاں سے میلوں کا سفر پیدل چل کر پنجنی پہنچنا ممکن ہوتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ پنجنی صرف فوجی گاڑیاں ہی جا سکتی تھیں۔ وہ بس جا چکی تھی جو اسے پونا تک لے جاتی۔ دوسری کے لئے اسے دو دن انتظار کرنے کی اطلاع ملی۔ نوراں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس نے پنجنی کی طرف جانے کا راستہ پتہ کیا اور ادھر جانے والی سڑک پر شاداں کے ساتھ چل پڑی۔ اسے امید تھی کہ شاید ادھر کو جاتی کوئی بیل گاڑی مل جائے، پھر اس میں بیٹھ کر وہ کچھ دور کی مسافرت طے کر لیں گی۔ بھولی عورت کو یہ علم نہیں تھا کہ پہاڑی راستوں پر بیل گاڑیاں نہیں چلتیں۔ اگر لاریاں نہ ہوں تو مسافروں کو اپنی ٹانگوں یا خچروں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

راستہ فوجی ہسپتال کے سامنے سے گزرتا تھا۔ وہاں گیٹ پر کھڑے نائک کو جب دو خوبصورت عورتیں خستہ حال اور پریشان سڑک پر چلتی نظر آئیں تو اسے کچھ جستجو ہوئی۔ نائک کی بائیں کلائی پر پٹی بندھی تھی اور اس کی فوجی ٹوپی سر پر پیچھے کی جانب سرکی ہوئی تھی۔

''کدھر جا رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

نوراں رک گئی۔ اسے نائک کا لہجہ ہمدرد محسوس ہوا۔ ''اسی پنجنی جا رہے ہیں۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا؟ پنجنی؟ تم لوگ اتنی دور پیدل نہیں جا سکتیں۔ وہ ان پہاڑوں سے بھی پرے ہے۔'' نائک ہاتھ سے ان سرمئی پہاڑوں کی جانب اشارہ کر رہا تھا جو مغربی افق پر تھے۔

''ویرا۔ ہماری مدد کر۔ آج ہمارا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔'' نوراں گڑگڑائی۔

نوراں اور شاداں کی دلکشی نائک کے دل میں اتر گئی تھی۔ دونوں کے جسم پر میلی سی شلوار۔ پھولدار قمیص، نوراں کے سر پر سیاہ اور شاداں کے سر پر زرد رنگ کا دوپٹہ۔ دونوں شاید بہنیں ہیں۔ نائک نے سوچا۔ اس نے اپنی ٹوپی کو ذرا ترچھا کیا اور وہ ہاتھ جس پر پٹی نہیں تھی اس سے اپنی مونچھ اور کلین شیوڈ گالوں پر آہستہ سے پھیرا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد وہ بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔ فوجی ڈاکٹر ایمبولنس گاڑی میں بیٹھا ہے۔ وہ نیک انسان ہے۔ شاید وہ تمہاری مدد کر دے۔''

نوراں اور شاداں نائک کے پیچھے پیچھے چلدیں۔ ایمبولنس گاڑی خاکی رنگ کا ٹرک تھا جس پر تارپولن کی چھت تھی، اور دونوں جانب سرخ رنگ کا کراس بنا تھا۔ ٹرک ایک درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ فوجی ڈاکٹر کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے سے اکتاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ نائک اس کے قریب پہنچا اور پیر پٹخ کر سیلوٹ کیا۔ ڈاکٹر نے آہستہ سے اپنا سر اٹھایا اور خوابیدہ نگاہوں سے نائک کو تکتے ہوئے اس کے سیلوٹ کا سست جواب دیا۔ کپتان ڈاکٹر نے گزشتہ رات آفیسر میس میں خوب بیئر پی تھی۔ گو اس کا نشہ اتر چکا تھا لیکن اس کا سر اَب بھی بھاری تھا۔

''سر! ان مجبور عورتوں کو پہنچنی جانا ہے۔ انھیں بس نہیں ملی۔ یہ چاہتی ہیں کہ آپ ان پر ترس کھایئے اور انھیں اپنی ایمبولنس میں بٹھا لیجیے۔'' نائک نے پرزور سفارش کی۔

''اللہ واسطے ہم پر رحم کھاؤ۔ میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ زیادہ دور پیدل نہیں چل سکتی۔'' نوراں نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

ڈاکٹر کو دونوں عورتوں پر رحم آ گیا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ غیر فوجیوں کو فوجی گاڑی میں بٹھانا ممنوع تھا۔ ڈاکٹر کچھ سوچتا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فوجی سپلائی ڈپو میں خالی ٹرک کھڑے تھے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سڑک پر فوجی پولس کے کسی فرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ فوجی ہسپتال کے گیٹ پر سنتری کی پشت ایمبولنس کی جانب تھی۔ سوائے ایمبولنس ڈرائیور، نائک، ڈاکٹر اور اس کے اردلی کے کوئی اور ایمبولنس میں سفر نہیں کر رہا تھا۔ اگر یہ عورتیں ساتھ چلتی ہیں تو یہ تینوں شکایت نہیں کریں گے، ڈاکٹر اس حقیقت سے واقف تھا۔

اچانک ڈاکٹر کو اپنا اردلی تیزی سے بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی کھلی ہوئی پتلون کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو خوف سے اس کا چہرہ زرد اور منہ کھلا تھا۔ بمشکل اٹینشن میں آ کر اس نے ڈاکٹر کو سیلوٹ کیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولنے لگا۔

"سر! خدا نے مجھے بچا لیا ورنہ وہ منحوس بیل مجھے چیر دیتا۔" اس نے پاس کے کھیت میں اس بیل کی جانب اشارہ کیا جو ایک گائے کا پیچھا کر رہا تھا۔

لوگوں کو پتہ چلا کہ اردلی کھیت میں حوائج ضروری سے فارغ ہونے گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے اس بیل کو جب سفید گائے کی جانب مستی سے دوڑتے دیکھا تو اس نے اونچی آواز میں مداخلت کی جو بیل کو پسند نہیں آئی اور وہ اردلی کی جانب غصے سے لپکا جو پتلون گرائے اپنے کام میں مصروف ہونے والا تھا۔ سارے مرد ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"دیکھو...... یہ عورتیں ہمارے ساتھ پنجنی تک جا رہی ہیں۔ گر ہمیں فوجی پولس روکے تو تم اسے بتانا کہ یہ عورت تمہاری بیوی ہے اور یہ لڑکی تم دونوں کی بیٹی۔ فوجی گاڑیوں میں فوجیوں کی بیویاں اور بچے سفر کر سکتے ہیں...... سمجھے...... باقی کام مجھ پر چھوڑ دینا۔" اردلی سے ڈاکٹر تحکمانہ لہجہ میں بولا۔

نوراں کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ آ گئی۔ شاداں کو بات بری لگی اور وہ منہ پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اردلی نے منہ بنایا جیسے یہ بات اسے بھی بری لگی تھی پھر وہ ہنس پڑا۔ اس کے منہ سے اس کے پیلے دانت جھانکنے لگے۔

نائک چستی سے اچھل کر ٹرک پر چڑھا اور شاداں اور نوراں کو اوپر آنے میں مدد کی۔

"ادھر بیٹھو۔" نائک نے لکڑی کی بنچ کی جانب اشارہ کیا۔ ماں اور بیٹی مشکور ہو کر بیٹھ گئیں۔ نائک بھی اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے اور نوراں کے درمیان اس کا ڈوری سے بندھا بسترا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نوراں...... اور یہ میری بیٹی شاداں ہے۔" نوراں نے نائک کو جواب دیا۔

"دیکھو...... کوئی دواؤں کے بکسے پر نہیں بیٹھے گا۔" سامنے کی سیٹ سے ڈاکٹر نے تنبیہ کی۔

"ٹھیک ہے سر۔" نائک نے مستعدی سے جواب دیا۔

ایمبولنس میں آمنے سامنے بنچ کے درمیان سیاہ لکڑی کا بنا دواؤں کا بکس رکھا تھا جو کسی کے بیٹھنے سے ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو اپنی افسری جتانی تھی سو اس نے جتا دی۔

تندر گاؤں کے قریب وادی میں جو بٹالین تھی اسی میں ڈاکٹر میڈیکل افسر تھا۔ اس بٹالین کی ایک کمپنی کالا دیو پہاڑ پر بھی تھی۔ اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں ڈاکٹر کو وہاں بھی ہفتے میں ایک بار

ضرور جانا پڑتا تھا۔ ڈیوٹیاں کب کرنی ہیں اور کس طرح کرنی ہیں ان سب کا اختیار ڈاکٹر ہی کو تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بجائے تندر میں اترنے کے وہ سیدھا پنجنی جا سکتا ہے اور وہاں سے کالا دیو جا کر کمپنی کے سپاہیوں کا معائنہ کرنے کے بعد بٹالین ہیڈ کوآرٹر میں واپس آ سکتا ہے۔

کچی سڑک پر ایمبولنس چل پڑی۔ اس کے پہیوں کے نیچے سے ڈھیر سی دھول اڑی۔ غبار سے بچنے کے لئے راہگیروں نے اپنے چہروں کو پگڑی کے شملے سے ڈھک لیا۔

''کیا تم دونوں پنجنی میں رہتی ہو؟'' نائک نے آنکھوں کے گوشے سے نوراں کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ ہم کوٹ فتح خاں کے پاس ایک بستی سے آ رہے ہیں۔'' نوراں نے نائک کی جانب بغیر دیکھے ہوئے جواب دیا۔ اس کا ایک بازو شاداں کے گرد تھا۔ جو ماں کے شانے سے سر ٹکائے تھکان کی وجہ سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔

''کوٹ فتح خاں؟ یارا یہ کدھر ہے؟'' سامنے کی بنچ سے اردلی نے استفسار کیا۔

نائک نے شانے اچکا کر ناواقفیت کا اظہار کیا۔ اس نے سگریٹ کی ڈبیہ جیب سے نکالی، سامنے جھک کر ایک سگریٹ اردلی کو دی اور دوسری کو سلگا کر سگریٹ پینے لگا۔ اس نے ماچس اردلی کی جانب اچھال دی جسے ایمبولنس کے ہچکولے کی وجہ سے اردلی نہیں پکڑ سکا اور وہ فرش پر گر گئی۔ اردلی نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ دونوں مزے سے سگریٹ پینے لگے۔ نوراں کی نگاہیں پہاڑوں کی ڈھلان پر پھسل رہی تھی۔ جہاں بادلوں کے سائے درختوں کے اوپر آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔ نیچے وادی میں بھی درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ آدم زاد کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

ایک عجیب سی ویرانی تھی جس میں بھاگتی ایمبولنس کے انجن کا شور اسے ڈراؤنا محسوس ہوا۔ امام واجد مل گیا تو سب کچھ ٹھیک ہے اور اگر نہ ملا تو ابھی اس کے پاس اتنی رقم تھی جو اسے واپس پہنچا سکتی تھی۔ نوراں نے خود کو سمجھایا۔ اسے نائک کا ہاتھ اپنی پشت اور کولھے پر پھسلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اس کی ممنون تھی اور وہ دیکھنے میں جوان گبرو تھا۔ اگر اس کے ساتھ تنہا ہوتی تو کچھ رقم کے عوض اس کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کر لینے میں کوئی برائی نہیں محسوس کرتی۔ اس نے اردلی کو خود سے مخاطب ہوتے سنا۔

''کیا پنجنی میں تمہارے رشتہ دار ہیں؟'' اردلی نے اپنا سوال چیخ کر دہرایا۔

''ہاں پنجنی کے پیر ہمارے رشتہ دار ہیں۔'' نوراں نے پُر اعتماد جواب دیا۔

''کیا؟ چپ شاہ تمہارے رشتہ دار ہیں؟'' نائک نے ڈر کر پوچھا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا۔

اس کے بٹالین کے کمانڈر نہ صرف مذہبی تھے بلکہ چپ شاہ سے انھیں عقیدت بھی تھی۔ اگر اس عورت نے چپ شاہ کو بتا دیا کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اور انھوں نے کرنل صاحب سے میری شکایت کر دی تو مجھ پر بڑی مصیبت آ جائے گی۔ ہو سکتا ہے میں نائک کے عہدے سے ہٹا دیا جاؤں۔ نائک نے دل ہی دل میں سوچا اور سہم کر نوراں سے کچھ دور سرک گیا۔

''ہاں۔ پنجنی کے امام ہمارے رشتے کے بھائی ہیں۔ لوگ انھیں چپ شاہ کیوں کہتے ہیں؟'' اپنے سابق عاشق کو بھائی کہنے کی وجہ سے کوفت ہوئی۔ لیکن اپنی خلش پر اس نے جلد ہی قابو پا لیا۔ خالہ اور پھوپی کے بیٹوں سے شادی تو ہوتی ہی ہے اور کبھی یاری بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے کیا برا کہا۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کی نگاہیں جھکی تھیں۔ ماں کی بات سن کر شاداں بھی چونکی۔ اس رشتہ داری کا اس کی ماں نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کے خیالات سے بے نیاز اردلی بول رہا تھا۔

''لوگ انھیں چپ شاہ کیوں کہتے ہیں تمھیں پتہ ہونا چاہئے۔ پیر صاحب زیادہ باتیں نہیں کرتے، چپ سے رہتے ہیں، اپنے آپ میں گم۔ اللہ والے ہیں اُسی سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

نوراں واجد کے تصور میں گم تھی۔ اللہ والے تو وہ پہلے بھی تھے۔ لیکن وہ بولتے تو تھے۔ واجد کی بہت ساری باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ اس کی نگاہیں فرش کو تک رہی تھیں اور سوچ کی وجہ سے اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

''اور پیر کی بیوی؟ وہ تو ٹھیک طرح ہے نا؟'' نوراں کے منہ سے اچانک نکلا۔

''اس کی بیوی؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس کی کوئی بیوی تیوی نہیں ہے۔ اس نے تو شاید شادی ہی نہیں کی۔'' اردلی چونک کر بولا۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

''کیا تم دونوں سچ مچ پیر صاحب کی رشتہ دار ہو؟'' نائک نے سخت لہجے میں پرسش کی۔ وہ مشکوک نگاہوں سے نوراں کو گھور رہا تھا۔

خوف سے نوراں پیلی پڑ گئی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے

دھڑک رہا تھا۔ امام واجد اب تک کنوارا ہو گا، یہ خیال اسے کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اب پکڑی گئی۔ اس نے کانپ کر سوچا۔ لیکن اس نے حوصلہ کیا۔ جلد گھبرائی ہوئی نظر اس نے اردلی اور نائک پر ڈالی اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ہاں...... وہ میرا بھائی ہے۔ اس کی ناک پر لال رنگ کا ننھا سا تل ہے۔ جب سے بھائی نے فقیری لی اور دور دیس آبسا تب سے کچھ اتا پتہ نہیں۔ مہینہ پہلے کسی نے بتایا کہ وہ پنجنی میں ہے۔'' نوراں نے باور کرانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک بالکل ٹھیک۔'' اردلی ترنگ میں آگیا تھا۔ اس نے جوش میں ہلکی سی تالی بجائی اور اپنی ٹوپی کو سر پر پیچھے سرکایا۔ اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ''ہاں ہاں۔ پیر کی ناک پر لال رنگ کا مسّہ ہے جو ہیرے کی طرح دمکتا ہے۔ ارے دوست۔ پیروں کو بیویوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہماری طرح کے آدمی نہیں ہوتے جنھیں عورتوں کی سنگت چاہئے۔'' اردلی کا چہرہ اب سنجیدہ تھا اور وہ کسی فلسفی کی طرح بڑے وثوق سے اپنا سر ہلا رہا تھا۔

نائک نے بھی اپنا سر ہلا کر ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ منھ اور آنکھیں سکیڑے اپنے سیاہ بوٹ کو تک رہا تھا۔ اس نے جو دست درازی نوراں کے ساتھ کی تھی اس سے اب بھی خوفزدہ تھا۔

نوراں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اس کے دل پر سے اٹھ گیا اور چہرے کی رنگت بحال ہو گئی۔ اس نے شاداں کی جانب دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔

''تو ٹھیک تو ہے؟'' نوراں نے شاداں سے پوچھا جو ماں کے جھوٹ سچ سے بیگانہ چپکی بیٹھی تھی۔

''ہاں ماں...... میں ٹھیک ہوں۔'' بیٹی نے سرگوشیوں میں جواب دیا۔ اس کے گرد نوراں کے بازو کا حلقہ اور مضبوط ہو گیا اور اس نے بیٹی کے سر کو چوم لیا۔

ایمبولنس میں اب خاموشی تھی۔ نوراں واجد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگا اور اس کے دل میں اب بھی میرے لئے محبت ہوگی؟ اسے دیکھ کر کیا میری چاہت پھر سے جاگ پڑے گی؟ نہیں۔ اب یہ ممکن نہیں۔ میں اتنی مصیبتوں میں گھری رہی اور وہ شہرت اور عزت حاصل کرتا رہا۔ میں ذلیل ہوتی رہی اور وہ بزرگ اور اللہ والا بن گیا۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کے بدلے میں اس سے مدد طلب کروں گی۔ اپنے لئے نہیں۔ اپنی معصوم بچی کے لئے۔ وہ پیر ہے اتنے سارے لوگوں کی مدد کرتا ہے اسے مجھے بھی

ضرور سہارا دینا چاہیے۔

"تم پیر سے آخری بار کب ملی تھیں؟" اردلی نے نوراں سے سوال کیا۔

"چودہ سال پہلے۔ شاید وہ مجھے پہچانے بھی نہیں۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ رنگ روپ ویسا نہیں رہتا۔" سوچ میں ڈوبی نوراں نے جواب دیا۔

"سچ...... بالکل سچ...... ہم جب میر پور سے چلے تھے تو اس وقت کڑی دھوپ تھی اور اب آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔" اردلی نے کسی قدر گھبراہٹ سے رائے زنی کی۔ اسے پتہ تھا کہ جب بارش ہوتی تھی تو کچی سڑکوں پر اتنی پھسلن ہو جاتی تھی کہ کبھی کبھی گاڑیاں پھسل کر کھڈ میں جا گرتی تھیں۔

ایمبولنس اچانک رک گئی۔ وہ اس کچی سڑک پر رینگتی رہی تھی جو پہاڑ کے ڈھلان پر بنی تھی۔ نیچے وادی تھی اور اس کے بعد بھی پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ ہوا تھم گئی تھی اور سامنے جنگلوں سے ڈھکے بلند پہاڑ تھے جہاں بادل دھوئیں کی طرح درختوں کے اوپر اور ان کے درمیان ان سے ماورائی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیچے وادی میں ننھی بستیوں کے قریب مرد و عورت کھیتوں میں مصروف تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے ماں اور بیٹی نے صرف تربوز کھایا تھا۔ نوراں کو بھوک لگ رہی تھی۔

"ویرا! ہم دونوں بھوکے ہیں اور پیاس بھی ستا رہی ہے۔" نوراں نے اردلی سے التجا کی۔ اس کے سادہ چہرے اور گفتگو سے نوراں کو ہمدردی کا احساس ہوا تھا۔

"لگتا ہے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔" اردلی نے کہا اور ٹرک کے باہر اتر گیا۔

اس کا شبہ درست نکلا۔ ڈرائیور انجن میں خرابی تلاش کر رہا تھا۔ اردلی اپنے افسر کے پاس گیا اور اسے سیلوٹ کرنے کے بعد اس سے بولا۔

"سر...... یہ دونوں عورتیں اپنے چپ شاہ کی رشتہ دار ہیں اور کچھ کھانا پینا چاہتی ہیں۔"

"تھیلے میں بسکٹ ہیں۔ وہ انھیں دے دو۔ سامنے چشمہ ہے۔ ان سے کہو وہاں جا کر پانی پی لیں۔" ڈاکٹر نے اس چشمہ کی جانب اشارہ کیا جو سڑک کے ذرا نیچے چٹانوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔

نوراں اور شاداں نے بسکٹ کا پیکٹ فوراً خالی کر دیا۔ پھر سنبھلتی ہوئی پگڈنڈی سے چشمے پر گئیں۔ دونوں نے اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر پیالہ سا بنایا اور اوک میں پانی بھر کر پینے لگیں۔ وہ

چشمے پر جھکی تھیں اور پانی سے ان کے چہرے تر ہو رہے تھے۔ جھکنے کی وجہ سے ان کے کولھے کی گولائیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ ٹرک میں بیٹھا نائک دزدیدہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ٹرک کے ڈرائیور کا ڈھیلا ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا اور اس کی نگاہیں پہاڑ پر گھرے بادلوں پر جمی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر بارش ہوئی تو راستہ خطرناک ہو جائے گا اور سامنے وہ نالہ جس سے سڑک گزرتی تھی وہاں سیلاب آسکتا تھا۔ انجن میں جو معمولی خرابی تھی اسے اس نے دور کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو جیسے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔ اس کے سر کی گرانی دور ہو چکی تھی اور وہ اپنے اردلی سے ان عورتوں کی بابت پوچھ رہا تھا جو ساتھ جا رہی تھیں۔ اردلی نے اسے بتا دیا کہ دونوں چیپ شاہ کی قریبی رشتہ دار ہیں۔ جب نوراں اور شاداں ایمبولنس میں واپس آ کر ٹرک میں بیٹھ گئیں تو وہ چل پڑا۔ اچانک دور بجلی کڑکی۔

''یا ربا بارش نہ ہو۔ نہیں تو اس سڑک پر بڑی پھسلن ہو جائے گی۔'' نائک نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

ایک موڑ پر ٹرک پھسلا۔ ڈرائیور نے زور سے اسٹیئرنگ گھمائی۔ ٹرک پھسل کر سڑک کے کنارے آ گیا۔

''ڈرائیور...... ہشیاری سے گاڑی چلاؤ۔'' سامنے کی سیٹ سے ڈاکٹر کی تحکمانہ آواز آئی۔

''اللہ حفاظت کرے گا...... مولا مدد۔'' اردلی سرگوشیوں میں گڑگڑایا۔

ٹرک کے پھسلنے کی وجہ سے نائک کی آنکھوں کے سامنے ہولناک موت گھوم گئی تھی۔ سڑک پہاڑ کی ڈھلان کے بالکل قریب تھی۔ دوسری جانب گہری کھڈ دور تک چلی گئی تھی۔ ایسی سڑکوں پر گاڑیوں کے حادثے اکثر ہوتے تھے۔ لمحے بھر کے لئے اس کی نگاہیں نوراں پر گئیں اور پھر واپس آ گئیں۔ اس کے ساتھ جو جسمانی چھیڑ خانی اس نے کی تھی اس کی وجہ سے نائک کو پچھتاوہ ہو رہا تھا۔ خدا کو اس کی حرکت بری لگی تھی اسی لئے ٹرک پھسل رہا تھا اور موت سامنے گردش کر رہی تھی۔ ٹرک ایک تنگ موڑ پر مڑا۔ پہاڑ، وادیاں، نشیب میں کھیت۔ سبھی شاداں کی نگاہوں کے سامنے چکرانے لگے۔ خوف سے ایک سسکی اس کے منہ سے نکل گئی۔

''اللہ نگہبان ہے۔ چیپ شاہ کی بہن اور بھانجی ساتھ ہے۔ سب ٹھیک ہو گا۔'' اردلی بڑے اعتماد سے بولا۔ نائک نے سر ہلا کر تائید کی۔ اچانک بادل گرجا۔ کفن جیسی سفیدی لمحے بھر کے لئے پھیل گئی اور ساتھ ہی بجلی کے زور سے کڑکنے کی آواز آئی۔ نائک نے گھبرائی ہوئی

نگاہوں سے اردلی کی جانب دیکھا۔ اس طرح جیسے سپاہی اپنے ساتھی سے میدان جنگ میں حوصلہ حاصل کرنے کے لئے دیکھتے ہیں۔ خوف سے نوراں اور شاداں بھی کانپ گئی تھیں۔

اردلی سنجیدہ تھا۔ اس نے اپنے خوف پر قابو پالیا تھا۔ وہ عمر میں ان تینوں سے بڑا تھا۔ اس نے دنیا زیادہ دیکھی تھی۔ اس لئے موت اور زندگی کے کھیلوں سے وہ زیادہ واقف تھا۔ خوف کی فضا کو دور کرنے کے لئے اس نے بات شروع کی۔

''نائک...... کبھی یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ میری بٹالین کا ہیڈکوآرٹر یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔ میں اس وقت نیا نیا رنگروٹ تھا۔ ہر دن یہ پہاڑ گولہ باری اور رائفل کی گولیوں کی سنسناہٹ سے گونجتے رہتے تھے۔ ہمارے پاس زیادہ ہتھیار نہیں تھے۔ جنگ ننگے ہاتھوں سے نہیں لڑی جاتی۔ اگر چپ شاہ کی دعائیں ہمارے ساتھ نہیں ہوتیں تو ہمارا صفایا ہو گیا ہوتا۔ جنگ پنجنی سے دو میل دور رک گئی اور جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ جب عمر آ چکی ہو، بیوی بچے ہوں اور جنگ میں اپنے دوستوں کے چیتھڑے اڑتے دیکھے ہوں، پھر زندگی بڑی نعمت لگتی ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ اب یہاں امن ہے۔''

''یارا۔ کہاں امن ہے۔ جنگ بندی کا اعلان تقریباً ہر روز توڑا جاتا ہے۔ راتوں میں درخت بھی دشمن دکھائی دیتے ہیں اور ہم ان پر گولی چلا دیتے ہیں۔'' نائک نے رائے زنی کی۔

شاداں سبھوں سے بے خبر تھی۔ ایک سنسناہٹ اس کے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ جو کچھ اس نے کھایا تھا، اسے وہ نکال پھینکنا چاہتی تھی۔ لیکن سبھوں کے سامنے قے کرنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے ماں کے شانے سے سر ٹکائے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اچانک وہ بے بس ہو گئی۔ اس کے منہ سے 'او، او' کی آواز نکلی اور اس نے جو کچھ کھایا تھا وہ اس کے منہ سے نکل پڑا۔ ندامت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ بیٹی کی اذیت دیکھ کر نوراں تڑپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اپنے دوپٹے سے اس نے شاداں کا منہ صاف کیا۔

''میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... یہ بیمار ہے۔ مولا...... مدد کر۔'' نوراں گڑگڑائی۔

اردلی اور نائک کے چہروں پر گھناؤنے پن کے احساس سے شکنیں پڑ گئیں۔ ٹرک کے اندر قے کی بدبو تھوڑی دیر تک اڑتی رہی پھر ہوا اسے اڑا لے گئی۔ سب چپ تھے سوائے شاداں کے جس کی دھیمی دھیمی سسکیاں اٹھ رہی تھیں۔ چڑھائی کی وجہ سے ٹرک رینگتا ہوا آگے بڑھتا

گیا۔ بادل گرجتے رہے اور بجلیاں بھی چمکتی رہیں، لیکن بارش نہیں ہوئی۔ ٹرک ایک پہاڑی کے نیچے جا کر رک گیا۔ سب کے سب اتر گئے۔ پہاڑی پر ایک ننھی سبز جھنڈی لہرا رہی تھی۔

"وہاں چپ شاہ کی خانقاہ ہے۔ کھڑی چڑھائی پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہاں پہنچنا اتنا مشکل نہیں۔" اردلی نے جھنڈی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوراں نے ڈاکٹر کے پاس جا کر اسے دل سے دعائیں دیں اور شاداں کی قے نے جو گندگی پھیلائی تھی اس کے لئے معافی طلب کی۔ ڈاکٹر نے اپنے خربوزے نما سر کو ہلایا اور ہونٹ مچکا کر دونوں عورتوں کو آگے جانے کا اشارا کیا۔ جو نیکی اس نے کی تھی اس کا اچھا اجر اسے نہیں ملا تھا۔ اسے خیال آیا۔ ٹرک کے اندر جو گندگی ہوگئی تھی اسے ایمبولنس ڈرائیور کو صاف کرنا تھا اور غیر فوجی صحتمند انسانوں کو ڈھونا بھی اس کا فرض نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے وہ غصے سے اپنے افسر ڈاکٹر کو تک رہا تھا۔

۱۰

خانقاہ کی بڑی کوٹھری کا دروازہ بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگی تھی۔ چھت کے قریب دیوار میں دو جانب بڑے بڑے سوراخ تھے جن سے بدلیوں سے مرجھائے دن کی روشنی آرہی تھی۔ پھر بھی کوٹھری میں ہلکی سی تاریکی تھی۔ ایسی تاریکی جس میں واجد کا دل روشن ہو جاتا تھا اور ذہن کے دریچے کھل جاتے تھے۔ وہ ایک دری پر بیٹھا وجد میں اپنے سر کو آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ طوفان میں ہلتے برگد کی طرح اس کا جسم بھی ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر اس کی زلفیں پھسل آئی تھی۔ اس کے منہ سے بار بار اللہ ہو...... اللہ ہو...... کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ جو دنیا اس کے ارد گرد تھی وہ اس سے بے خبر تھا۔ اس کے دل میں نہ کسی کا خوف تھا اور نہ ہی حرص و ہوس اور نہ ہی اپنے جیسے کسی انسان سے ملنے کی خواہش۔ وہ معبود حقیقی کے اسرار میں گم تھا۔ اس کی رحمت و برکت میں ڈوبا اس کے فیض و کرم سے اس وقت مسحور تھا۔ اس کے جسم سے اس کی روح نکل کر نقرئی کہر میں تحلیل ہو رہی تھی۔ سونے کی دمک تھی جو اسے اندھا کیئے دے رہی تھی۔ اس اندھے پن میں سرشاری تھی۔ اس پر ایک ایسی بیخودی طاری تھی جس نے واجد کو اس عالم میں پہنچا دیا تھا جہاں خدا اس کے سامنے تھا جس کی نہ کوئی شکل تھی اور نہ کوئی رنگت۔ بس طاقت کا ایک سرچشمہ تھا جس سے اس کے وجود میں جان تھی اور حرکت۔ معرفت کی یہ منزل اسے برسوں کی ریاضت کے بعد ملی تھی۔

''اُف اللہ! مجھ ذلیل بندے پر تیری ایسی مہربانی؟'' بے اختیار واجد کے منہ سے نکلا اور اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل کر اس کی داڑھی پر بہہ آیا۔ وہ دری پر گر گیا اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی سانس کی آمد و رفت تیز تھی اور جسم گرم پسینے

سے نم۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے آپ کا احساس ہوا۔ اس روشنی کا احساس ہوا جو کھڑکیوں سے نکل کر کوٹھری میں چھا گئی تھی۔ ایک جانب دیوار پر چونے کی سفیدی سے خدا اور محمد لکھا ہوا بھی اسے نظر آیا۔ دوسری جانب دیوار سے دو کڑیاں نکلی ہوئی تھیں جن پر ایک تختہ تھا جس پر لکڑی کی وہ کنگھی تھی جس میں اس کے سر اور داڑھی کے بال پھنسے تھے۔ اسی تختے پر واجد کے داتون بھی تھے اور ان کے قریب وہ بوسیدہ کاغذات کچھ بے ترتیبی سے پڑے تھے جن پر وہ تعویذیں لکھ کر ضرورتمندوں کو دیا کرتا تھا۔ دیوار میں ٹھونکی دو میخوں سے اس کے پیوند لگے کرتے اور شلواریں لٹک رہی تھیں۔ کوٹھری میں ایک جانب وہ چارپائی تھی جس پر پرانے لحاف، تکیہ اور توشک پڑے تھے بس یہ تھا اس کا اثاثہ۔ ان سے زیادہ کی اس نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ پنجنی سے پرے شہر تھے، گاڑیوں سے بھری سڑکیں تھیں۔ پٹریوں پر دوڑتی ریل گاڑیاں اور آسمان پر اڑتے ہوائی جہاز تھے۔ لیکن ان سب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

واجد کی نگاہ قرآن شریف پر جم گئی جو سرخی مائل جزدان میں لپٹا دیوار پر ٹنگا تھا۔ اسی میں سب کچھ تھا۔ دنیا کا سارا علم۔ سوچ کا سرچشمہ۔ اس کو حفظ کرنے اور آیتوں کے معنی پر غور کرنے کے بعد واجد اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ پیر و مرشد اپنے حجرے میں بند رہتے ہیں۔ جنھیں ان سے ملنا ہوتا ہے وہ خود ہی آتے ہیں۔ لیکن اپنی خانقاہ سے نکل کر ادھر ادھر جانے میں اس نے اپنی بزرگی کی سبکی نہیں محسوس کی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے جو لوگ تھے ان ہی کے جیسا وہ ایک فرد تھا، غریب اور مجبور فرد۔ واجد سمجھتا تھا کہ اس طرح اس کی پیری مریدی میں ایک انوکھا پن ہے جس نے اسے اور بھی مقبول بنا دیا ہے۔

حجرے کا دروازہ کھڑکھڑاتا ہوا آہستہ سے کھلا۔ نوراں دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ دری پر پڑے ڈراؤنے انسان نے اس کے قدم روک دیئے تھے۔ چند ہی لمحوں میں اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ سامنے واجد ہی ہے۔ نوراں کی ساری تھکان دور ہو گئی۔ وہ اندیشے رخصت ہو گئے جن میں وہ گھری رہی تھی اور جنھوں نے اسے ہلکان کر رکھا تھا۔

''شاہ جی۔'' نوراں کی دھیمی آواز میں پرانی آشنائی کا اپنا پن تھا۔

واجد عرش سے فرش پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اکثر سراب پھرتے رہتے تھے۔ اس نے سمجھا کہ ویسا ہی کوئی سراب ہے۔ واجد نے اپنی آنکھوں کو کئی بار جھپکا۔ سامنے نوراں ہی تھی۔ سر پر گھنگریالے بال۔ گرم آنکھیں اور چہرے کی رنگت پکے ہوئے گیہوں کی طرح۔

دروازے سے آتی روشنی میں سب کچھ صاف تھا۔ ناممکن بھی ممکن ہو سکتا ہے واجد پر اچانک منکشف ہوا۔ اس کا وجود پگھلنے لگا۔ کہیں سے کوئی ندی بہتی ہوئی آئی جس کی موجوں پر نوراں کی آواز، اس کے لمس کا جادو، کشتیوں کی طرح رواں تھے اور وہ کشتیاں واجد کی روح کے ویران کنارے پر آکر رُک گئیں۔ اس نے غور سے نوراں کو تکا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وقت اور زمانے کے ہر وار کو نوراں کے جسم کی لچک سہہ گئی تھی۔ زندہ رہنے کی آرزو نے، اپنے لیے نہیں تو شاداں کے لئے سہی، نوراں کو مرجھانے نہیں دیا تھا۔ وہ دروازے کی پٹ کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ تنی ہوئی اور نڈر۔ واجد نے کہنا چاہا۔

''چلی جا۔'' لیکن وہ نہیں کہہ سکا۔ اس کے برخلاف واجد کے منہ سے مسرور اور متحیر آواز نکلی۔

''نوراں!''

بزرگی اور پارسائی کی جس دیوار کی اوٹ میں واجد زندگی گزار رہا تھا وہ ٹوٹ گئی۔ قوت ارادی سے جو تبدیلی وہ اپنے آپ میں لایا تھا وہ اچانک ختم ہوگئی۔ کسی انجان طاقت نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

''بیٹھ جا نوراں...... بیٹھ جا۔'' واجد کی آواز میں نرمی تھی۔

نوراں اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے پیروں کے نیچے کھردری زمین ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی اور اس کی پشت سے لگا دروازے کا پٹ اسے گڑ رہا تھا۔ ''اگر یہ آدمی سچ مچ خوش ہوا ہے، پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اسے اب بھی مجھ سے محبت ہے؟ یہ محبت میرے لیے بے معنی ہے۔'' نوراں نے سوچا۔ اچانک تیز بارش شروع ہوگئی۔ نوراں نے باہر نگاہ ڈالی۔ شاداں برآمدے کے ستون سے لگی اداس کھڑی تھی۔ نوراں نے اسے اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ نوراں نے لمبی سانس لی۔ گزشتہ زندگی کے آلام اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ وہ دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ نوراں چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''شاہ جی۔ تم نے تو مجھے بھلا دیا۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی اور غصے کی دھیمی آنچ۔

''میں نے چاہا تھا ایسا ہی ہو۔ پر ایسا نہیں ہوا۔'' واجد نے حقیقت کا اقرار کیا۔

''کیوں شاہ جی؟''

''نہیں معلوم نوراں۔ سچ ہے نہیں معلوم۔'' ہارے ہوئے انسان کی طرح واجد کا سر جھکا تھا۔

''تم مجھے لے جانے نہیں آئے۔ میں نے کس طرح تڑپ تڑپ کر تمہارا انتظار کیا تم

نہیں جان سکتے۔"

واجد جواب نہیں دے سکا۔ لمحے بھر کے لیے اس کی نگاہیں نوراں پر پڑیں پھر جھک گئیں۔ واجد کو پتہ تھا کہ اس کی مردانگی مات کھا گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"ایسا کرنا آسان نہیں تھا نوراں۔ تو بیاہتا تھی۔ مجھ سے پہلی بار غلطی ہو گئی...... دوبارہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا...... بلکہ دل پر قابو رکھنا چاہئے تھا...... جو اس وقت ممکن نہیں ہو سکا۔"

نوراں نے کچھ کہنا چاہا لیکن واجد نے اچانک پوچھا۔

"تجھے کیسے پتہ چلا میں پنجنی میں ہوں؟"

"تم بڑے مشہور ہو۔ کوٹ فتح خان کے امام کے نام سے نہیں۔ بہت بڑے بزرگ کی طرح تمہاری شہرت ہے۔ لوگ تمہارا بڑا احترام کرتے ہیں۔ تمہیں چپ شاہ کہتے ہیں۔"

نوراں مسکرا رہی تھی۔ اس کے شاہ جی کا چپ شاہ کے نام سے مشہور ہو جانا اسے کسی حد تک مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ واجد کی ناک پر جو سرخ مسّہ تھا اسے تک رہی تھی۔ اس نشان کی اطلاع ڈاکوؤں سے گر نہیں ملتی تو شاید اسے خیال بھی نہیں آتا کہ پنجنی کا پیر اس کا پرانا محبوب ہے۔

"تو یہاں کیوں آئی ہے نوراں؟"

"میں بھاگی ہوئی ہوں۔"

"بھاگی ہوئی کیوں؟" واجد کی نگاہیں نوراں پر گڑی تھیں۔

"میرا خاوند بڑا ظالم ہے۔"

"وہ تو ہمیشہ سے تھا۔"

"میری بیٹی پر اس کی بری نگاہ تھی۔"

"کیا؟ اپنی بیٹی پر؟"

"میرا پہلا خاوند جب چھوڑ کر گیا پھر واپس نہیں آیا۔ کہیں مر کھپ گیا شاید۔ پھر میں نے دوسری شادی کر لی۔ میرا دوسرا خاوند ذلیل اور کمینہ ہے۔"

"لیکن...... یہاں آنے کی بجائے تو کسی اور گاؤں میں جا کر رہ سکتی تھی یا اپنے کسی رشتہ دار کے پاس چلی جاتی۔"

"میں ایسی قسمت والی نہیں۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں۔ سبھی غیر اور میرے دشمن ہیں۔ اسی لئے تمہارے پاس آ گئی۔ مجھ پر مہربان بنو شاہ

جی۔'' نوراں نے التجا کی۔

''لیکن......'' واجد کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ وہ اس کی کس طرح مدد کر سکتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نوراں کو واجد کی الجھن پر غصہ آیا۔

''تم ڈر رہے ہو شاہ جی؟ کس سے؟ میرے خاوند کو نہیں معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں۔ ظہیر علی اور مجید مر چکے ہیں۔''

''ان دونوں کا نام میرے سامنے مت لے نوراں۔ مجھے موقعہ ملتا تو میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دیتا۔'' واجد غصّے میں بولا۔ اس کے دانت بھنچ گئے تھے اور اس کی مٹھیاں کس گئی تھیں۔

''کیا پیر و مرشد بھی کسی کو جان سے مار سکتے ہیں؟'' نوراں نے سوچا۔ وہ واجد کی جانب حیرت سے دیکھ رہی تھی جو اسے غصّے سے تک رہا تھا۔ چونکہ نوراں نے اسے اس ذلت کی یاد دلا دی تھی جسے وہ بھلا دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''تو مجھ سے کیا چاہتی ہے نوراں؟'' واجد نے جھنجلاہٹ سے پوچھا۔

''ہمیں تھوڑے دنوں کے لیے پناہ دو۔ ہماری مشکل دور ہو جائے گی۔ خدا میری مدد کرے گا۔''

واجد شش و پنج میں پڑ گیا۔ گو خانقاہ میں دو اور کوٹھریاں تھیں لیکن کوئی عورت خانقاہ میں کبھی رات کے وقت نہیں رکی تھی۔ صرف ٹیڑھی آنکھوں والی فضلاں راتوں میں یہاں کھانا پکا کر واپس گاؤں میں چلی جایا کرتی تھی۔ دوسری عورتیں دن میں آتی تھیں۔ لیکن صرف دعاؤں یا تعویذوں کے لیے۔ مرید اور گاؤں والے جب عورتوں کو خانقاہ میں رہتے دیکھیں گے تو نہ جانے کیا سوچنے لگ جائیں۔ اس کی جھجک کو نوراں بھانپ گئی تھی۔ وہ بھی مجبور تھی۔ اتنی دور سے وہ اس کی مدد کے بھروسے پر ہی آئی تھی۔

''تم سے مدد مانگنے کا مجھے حق ہے۔''

واجد نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔ مدت ہوئی جب اس کی اور نوراں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی تو اس نے نوراں کو اپنی بیوی تسلیم کر لیا تھا، اور اب بیوی اپنے شوہر سے مدد طلب کر رہی تھی۔ روپے پیسے یا کپڑے لتوں کے لیے نہیں، صرف پناہ کے لیے اور وہ بھی محض چند دنوں کے لیے۔ ہو سکتا ہے اس مدت میں وادی میں مقیم بٹالین کے کسی ایسے فوجی افسر یا سپاہی کو نوراں تلاش کر لے جسے وہ جانتی ہو۔ ان دنوں فوجیوں کی حکومت تھی اور فوجی افسر کسی نہ

کسی بہانے اپنے علاقے میں رہنے والوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ واجد نے سوچا۔

''تیری بیٹی کدھر ہے نوراں؟''

''باہر کھڑی ہے۔ شاداں...... شاداں۔'' نوراں پکاری۔

موسلا دھار بارش کی تیز آواز میں نوراں کی آواز شاداں نہیں سن سکی۔ وہ مگن شاہ کو برستے پانی میں اچھلتے کودتے دیکھ رہی تھی۔ شاداں کو دیکھ کر مگن شاہ میں جولانی آ گئی تھی۔ کبھی وہ ہاتھوں کو ہوا میں بلند کر کے تھرکاتا اور کبھی انھیں وہ اپنے رانوں پر مارتا۔ اس کی ننھی آنکھیں بند تھیں اور اس کا نیم وا منھ آسمان کی جانب تھا جس میں جب بارش کے قطرے گرتے تو ان کی خنکی سے خوش ہو کر وہ قہقہہ لگاتا اور ساتھ ہی اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتا۔ شاداں کو محسوس ہوا کہ ازل سے اس عجیب سے انسان سے اس کا رشتہ ہے۔ وہ اس کا بھائی ہے اور محبوب بھی۔ وہ خدا کا پہلا بندہ تھا جو قدرت کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بے اختیار ہو اٹھا۔ آسمان پر سیاہ بادل تھے جو درخت کی شاخوں میں بھی دھیمے دھیمے سرک رہے تھے۔ سرکش ہوا کی سرسراہٹ ان شاخوں سے آ رہی تھی۔ شاداں کے سامنے ایک عجیب سی حقیقت تھی جس کی سمجھ اسے نہیں تھی۔ لیکن اسے خوف نہیں آیا۔ اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر مگن شاہ کے پاس جائے اور اس والہانہ پن میں شریک ہو جائے۔ اسی کی طرح اچھلے اور قہقہے لگائے۔ نوراں حجرے سے باہر آئی۔ وہ غصے میں تھی۔

''شاداں! میں تجھے پکار رہی ہوں۔ تو نے سنا نہیں؟''

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شاداں اپنی ماں کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہوئی اور اپنی ماں سے لگ کر ڈری ہوئی کھڑی ہو گئی۔ سامنے دری پر بیٹھے واجد کے لمبے لمبے بال اور لمبی داڑھی کو دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ واجد کی آنکھوں کی سفیدی نیم تاریک کوٹھری میں پھیل رہی ہے اور جلد ہی اسے اپنے حلقے میں لے لے گی۔ شاداں کو واجد غور سے تک رہا تھا اور ماں بیٹی کی غیر معمولی مشابہت پر حیران تھا۔ اسے نوراں سے پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ شاداں اسی طرح کھڑی تھی۔ سیدھی اور سر کو ذرا جھکائے ہوئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس دن کی طرح آج بھی اندھیرا سا تھا۔ واجد کو اپنے دل میں شاداں کے لیے ایک عجیب سی نرمی کا احساس ہوا۔ جس کی وجہ سے اسے ذرا گھبراہٹ سی ہوئی۔

''لیکن نوراں...... آخر بتا تو سہی تجھے کس نے بتایا کہ میں دور دراز یہاں پہاڑ

پر پہنچی میں ہوں۔"

نوراں نے شاداں کو حجرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ کچھ ڈری ہوئی اور حیرت زدہ چلی گئی۔ یہ عجیب و غریب شخص اور ماں کے درمیاں کیسی رشتہ داری تھی اور کب سے دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے؟ شاداں کے دل میں سوالات اٹھ رہے تھے۔ اس کے جانے کے بعد واجد سے نوراں مخاطب ہوئی۔

"میں نے تو تمھیں بتا دیا شاہ جی کہ تم بہت مشہور ہو اور لوگ تمہارے بارے میں بڑی عزت سے باتیں کرتے ہیں۔"

"لیکن تجھے کس نے اطلاع دی؟ سپاہیوں نے؟"

"نہیں۔" نوراں مسکرائی پھر بولی۔ "ڈاکوؤں نے۔"

"ڈاکوؤں نے؟" واجد خوف سے سفید ہو گیا۔

"ہاں۔ میرا خاوند بہت بڑا چور ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ وہ تمہاری خانقاہ میں آ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کا پیر بہت بڑا بزرگ ہے۔ وہ جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو چرند پرند سکتے میں آ جاتے ہیں اور اس پیر کی ناک پر سرخ مسّہ ہے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ پیر تم ہی ہو۔ میں نے سوچا تمہاری کھوج میں نکلتے ہیں۔ خدا نے مدد کی اور تم مل گئے۔"

واجد گھبرا گیا۔ جو کشش وہ نوراں کے لیے محسوس کر رہا تھا وہ گھبراہٹ کی وجہ سے غائب ہو گئی۔ اس کے سامنے اس کی نوراں نہیں بلکہ ایک چور کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ چور جو ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھا۔ اور وہ ڈاکو اس کی خانقاہ میں آتے رہے تھے۔ ممکن ہے ان میں اس کے مرید بھی ہوں اور قتل و غارت گری کے لیے اس کی دعائیں بھی حاصل کی ہوں۔ گویا اس نے چوری اور ڈکیتی اور لوگوں کی جان لینے کے لیے دعائیں دی تھیں۔ وہ دنیا سے الگ رہ کر بھی دنیا میں جو ستم روا تھا اس کا آلہ کار تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نوراں اگر یہاں رہ گئی تو اس کا شوہر اسے تلاش کرتا ہوا ادھر آ نکلے یا کوئی ڈاکو یہاں اگر آتا ہے تو وہ نوراں کو پہچان لے۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ ساری باتیں سوچ کر واجد کانپ گیا۔ نوراں کو یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ آج ہی۔ لیکن ایسا کہنا ممکن نہیں تھا۔ اس عورت کے اعتماد کو وہ ایک بار ختم کر چکا تھا۔ دوبارہ ایسا کرنا مشکل تھا۔ نوراں ایک طویل سفر کے بعد اس کے پاس پہنچی تھی۔ محض اس کی مدد حاصل کرنے کے لیے راستے کی بے شمار مشقتیں اس نے برداشت کی تھیں۔ اس پر بھروسہ تھا جبھی تو وہ اس

کے پاس آئی تھی۔ تو کیا اس کے بھروسے کو وہ دوبارہ ٹھکرا دے؟ وہ بھی اس وقت جبکہ وہ ماضی کے مقابلے میں دانا اور توانا تھا۔ اس کی دعائیں آئے دن قبول ہوتی تھیں۔ ایک بار فرار ہو کر اس نے نوراں کو بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔ اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کا دن آج آپہنچا تھا۔ اچانک فیصلہ کر لینا واجد کے لیے ممکن نہیں تھا۔ خیالات اس کے ذہن میں زلزلے کی زد میں آئے ہوئے خرگوشوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ ''خدایا۔ مدد کر۔'' سرگوشیوں میں واجد کے منھ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا سر دیوار سے ٹک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سننے کے لیے خاموش تھا۔ باہر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ ضرورتمند بارش میں بھیگتے ہوئے خانقاہ میں آپہنچے تھے۔ واجد نے آنکھیں کھول دیں اور تحکمانہ بولا۔

''نوراں...... باہر جا اور کسی سے بات مت کر۔'' نوراں چلی گئی۔

''اس کی مدد کرنا گناہ نہیں ہوگا۔'' واجد نے خود کو کہتے سنا۔

بارش رک گئی تھی۔ صاف نیلے شیشے جیسے آسمان پر سفید بادل اڑ رہے تھے۔ برستے پانی سے دھلا آفتاب منور تھا اور اس کی گرم کرنیں ہر سو بکھری تھیں۔ سامنے کچھ فاصلے پر پہاڑی اور اس سے پرے کالا دیو کی چوٹی دھلی دھلائی نظر آرہی تھی۔ مگن شاہ سرگوشیوں میں خود کلامی کرتا ہوا کبھی کبھی ہنس پڑتا۔ اس کی نگاہیں بار بار شاداں اور نوراں پر پڑتیں جو برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ مگن شاہ اپنے گیلے کپڑوں کی نمی سے بے نیاز تھا۔ درمیانہ عمر کے تین مرد واجد کے انتظار میں کھڑے مگن شاہ کو مسکراتے ہوئے تک رہے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے بولا۔

''عجیب انسان ہے۔''

''عجیب نہیں۔ بھولا بھالا غریب آدمی ہے۔ ہم سب جیسا۔ ملک میں ایسے ہی لوگ زیادہ ہیں۔ بس کچھ کو سب آرام ملتا ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

نوراں برآمدے میں بیٹھی خالی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے امید بندھ گئی تھی۔ واجد نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کی بات چیت میں نرمی تھی اور اپنا پن بھی۔ پھر بھی نوراں نے اس کے لئے اپنے دل میں نرمی اور درد نہیں محسوس کیا۔ اس کے ساتھ تنہا وقت گزارنے کی اسے خواہش نہیں ہوئی۔ نوراں کو بس اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ شاداں کی شادی واجد کسی کے ساتھ کرا دے، یہی سوچ کر اس نے اتنی دور کا سفر کیا تھا۔ لیکن یہ رشتہ کس طرح ممکن ہوگا

اس کی سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا۔ ایک خوف سا اس کے دل میں آیا اور اس نے سہم کر اس دنیا کو سمجھنا چاہا جو اس کے سامنے تھی۔ خانقاہ کے سامنے وسیع آنگن کے کنارے اخروٹ کے درخت پر سبز جھنڈی سرنگوں تھی۔ درخت کی شاخیں بارش سے نم جھکی تھیں۔ ان خادماؤں کی طرح جنھیں اپنے آقاؤں کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آنگن سے پرے دھان کے کھیت اور چیڑھ کے درختوں کا جنگل اور ان کے بعد ایک دوسرے سے گتھی پہاڑیاں تھیں۔ اور بھی بہت کچھ تھا جو نوراں کو نظر نہیں آیا۔ ایک نرالی اور ڈراؤنی دنیا کالا دیو کی ترائی میں بسی تھی۔ جو خاکی وردی میں ملبوس اور رائفل بردار سپاہیوں سے آباد تھی۔ وہ 'سی' کمپنی کے سپاہی تھے جو تندر کے پاس مقیم بٹالین کی پانچ کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ اس کمپنی کے پر وقار اور خاموش سپاہی کبھی کبھی پنجنی کی طرف آنکلتے تھے۔ لیکن گاؤں والوں سے سلام علیکم اور وعلیکم السلام سے زیادہ ان کی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کالا دیو کی جانب سے گولیوں کے چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ لیکن اس وقت ادھر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ دنیا خانقاہ کے ہنگاموں سے بے خبر تھی اور خانقاہ اس کے ارادوں سے ناواقف۔

نوراں کی نگاہ ان دو کوٹھریوں پر گئی جو تاریک اور ویران تھیں۔ واجد اب تک اپنے حجرے میں تھا اور کچھ فاصلے پر پنجنی کا خاموش گاؤں تھا جس کے سامنے بکریاں چر رہی تھیں۔ گاؤں سے گھوڑے پر سوار کوئی نکلا اور اسے ہنکاتا ہوا دور نکل گیا۔ نوراں کے پاس شاداں بیٹھی تھی اور آس پاس تین ضرور تمند آدمیوں کے علاوہ مگن شاہ تھا۔ ان سب کے علاوہ دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ شاداں کی شادی شاہ جی کس سے کرائیں گے؟ نوراں نے مضطرب ہو کر سوچا۔ اس کی نگاہ شاداں پر گئی جو مگن شاہ کی جولانیوں سے خوش نظر آرہی تھی۔

دس بارہ سال کے دو چھوکرے پنجنی کی جانب سے آئے اور مگن شاہ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ انھیں ہنستے دیکھ کر مگن شاہ بھی ہنس پڑا۔ ایک لڑکے نے زمین پر سے دو تنکوں کو اٹھایا اور مگن شاہ کے سر کے بالوں میں کھونس دیا۔

"مگن شاہ...... تو بکرا لگ رہا ہے۔ بزززز......"

"بززز......" مگن شاہ نے نقل اتاری اور قہقہہ لگانے لگا۔ ہنستے وقت اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کا گول مٹول جسم زور زور سے ہلنے لگا۔

دوسرا لڑکا جس کی ناک چپٹی تھی اور ننھی آنکھیں مندی سی تھیں اس نے اپنا کان مگن شاہ

کی توند ۔ ۔لگا دیا جہاں خالی آنتیں زور زور سے گڑگڑا رہی تھیں۔

''مگن شاہ۔ تیرے پیٹ میں کتے بھاگ رہے ہیں۔ بھاگ۔ جلدی۔''

''چھوکرے بھاگو یہاں سے۔ تمہیں اس معصوم کی ہنسی نہیں اڑانی چاہیے۔'' جو تین ضرورت مند آئے تھے ان میں سے ایک نے لڑکوں کو ڈانٹا۔

''سچ مچ مگن شاہ ہم سب جیسا بھولا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو جاتا ہے۔'' اس کے ساتھی نے رائے زنی کی۔

لڑکے بھاگے اور ان کے پیچھے پیچھے مگن شاہ بھی بززز...... بززز...... کرتا ہوا دوڑا۔

خانقاہ میں کچھ اور معتقدین بھی آ گئے۔ سبھوں کے ہاتھوں میں پیر کے لیے نذرانہ تھا۔ کوئی انڈے لے کر آیا تھا تو کسی کے ہاتھوں میں دہی کی ہانڈی تھی اور کوئی پنیر یا جو کا آٹا ساتھ لایا تھا۔ واجد اپنے حجرے سے باہر آ کر خاموش اور پُر وقار کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں تسبیح پھر رہی تھی۔ اس نے کسی کو تعویذ دی اور کسی کو دعا۔ سوائے دعاؤں کے چند الفاظ کے اس کے منھ سے کوئی اور آواز نہیں نکلی۔ لوگ اس کی جانب تیزی سے بڑھتے لیکن ہاتھ ہلا کر وہ انھیں پرے کر دیتا۔ کسی ضرورتمند نے اس کے کرتے کے دامن کو پکڑ لیا۔ واجد نے آنکھیں نکال کر اسے اس طرح گھورا کہ وہ ڈر کر دور ہٹ گیا۔ برآمدے میں کھانے پینے کی اشیا کا ڈھیر لگ گیا تھا لیکن واجد نے ان پر نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ اچانک وہ کڑک کر بولا۔

''اب تم لوگ جاؤ۔'' جیسے کسی بادشاہ کا حکم تھا۔ وہ ضرورتمند جن میں واجد کے مرید بھی تھے وہ سب چلے گئے۔ اس نے نوراں اور شاداں کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے حجرے کے اندر گیا اور دروازے کو بند کر لیا۔ نوراں نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ واجد کی بزرگی کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہ واقعی اللہ والا بن چکا تھا۔ شاداں پر واجد کا خوف بدستور تھا۔ لیکن اس نے جو بھی دیکھا وہ اسے دلچسپ محسوس ہوا۔

کچھ دیر بعد مگن شاہ واپس آیا۔ وہ اپنے گیلے کپڑوں سے بے نیاز تھا۔ اس نے برآمدے میں رکھی کھانے پینے کی اشیا کو اٹھا کر خالی کوٹھری میں رکھ دیا اور اس کے بعد برآمدے میں جھاڑو دینے لگا۔ وہ کچھ بدبدا رہا تھا جسے نوراں نہیں سمجھ سکی۔ کبھی کبھی دبی آواز میں وہ شاداں سے اس کا حال پوچھ لیتی۔ جواب خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ مگن شاہ جب جھاڑو دے چکا تو برآمدے میں پڑے دو مٹکوں کو اٹھا کر ڈھلان پر جو چشمہ تھا تو وہاں سے ان میں پانی بھر کر لے

آیا۔ دونوں مٹکے وزنی تھے لیکن مگن شاہ کے چلنے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

ظہر کی نماز کے وقت گاؤں کا مکھیا حسن داد آیا جس کے ساتھ اس کا چچا زاد بہنوئی شریف بھی تھا۔ پنچنی کے چند بزرگ بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ کوٹھری سے پھٹی پرانی دریاں نکال کر مگن شاہ نے برآمدے میں بچھا دیں۔ اذان دینے کے فرائض حسن داد ادا کیا کرتا تھا۔ جب وہ اذان دینے لگا تو اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آسمان کی جانب اٹھے چہرے پر جذب و رقت کی وجہ سے تناؤ آ گیا۔ اس کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور نوزائیدہ بچے کی بند مٹھی کی طرح نمایاں کنٹھا گردن پر بار بار اوپر نیچے جا رہا تھا۔ واجد حجرے سے باہر آیا۔ آنکھوں کے اشارے سے اس نے نوراں اور شاداں کو نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ دونوں نے مٹکے سے پانی نکال کر وضو کیا اور ساتھ کی کوٹھری میں نماز کی ادائیگی کے لئے چلی گئیں۔ سبھی خشوع و خضوع کے ساتھ واجد کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ صف میں مگن شاہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ نمازیوں کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے نوراں نے نماز کے ارکان ادا کیے اور شاداں نے بھی وہی کیا۔ نماز کے بعد واجد پر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اور اس کی گھورتی آنکھوں سے اس کا تکبر صاف عیاں تھا۔ وہ سبھوں سے بے نیاز حجرے کے اندر چلا گیا۔ نوراں اور شاداں کو دیکھ کر گاؤں والوں کو حیرت ضرور ہوئی۔ لیکن انھوں نے سمجھا کہ دونوں ضرورت مند ہیں جو کہیں دور سے آ کر خانقاہ میں رک گئی ہیں۔ وہ چپ چاپ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

خانقاہ پر خاموشی چھا گئی۔ ایک مکمل سکوت۔ خانقاہ کی دو خالی کوٹھریوں سے جھانکتی نیم تاریکی۔ تیسری کوٹھری کا دروازہ بند اور وہاں پُر ہیبت پیر۔ پہاڑ پر بنی خانقاہ کی بلندی کی وجہ سے اس کے آنگن میں بادل کا آ کر رک جانا۔ جس کی دھند میں بدبداتا اور مسکراتا ہوا موٹا مگن شاہ جو ہاتھوں اور سر کو بے مقصد ہلا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر مٹی کے گھروں کی بستی اور وہاں جاتی پگڈنڈی جو گھنے درختوں کے درمیان گزرتی تھی، اور خانقاہ کے پاس اخروٹ کے درخت پر پھڑ پھڑاتی سبز جھنڈی۔ اس عجیب سی جگہ میں ایک عجیب سا اسرار تھا۔ شاداں کو محسوس ہوا ساتھ ہی اسے خوف آیا۔ اپنی ماں کے قریب ہو کر اس نے سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

عصر کی نماز کے بعد اور اندھیرا ہونے سے پہلے ٹیڑھی آنکھوں والی فضلاں آ گئی اور وہ چولھا جو برآمدے میں تھا اس میں آگ جلا کر روٹیاں پکانے لگی گئی۔ دو عورتوں کو دیکھ کر اسے جستجو

ہوئی۔ نوراں نے چند الفاظ میں بتا دیا کہ وہ چپ شاہ کی رشتہ دار ہیں اور پھر وہ فضلاں کو نظر انداز کر کے شاداں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئی۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے اگر زیادہ باتیں کیں تو کہیں اس کے آنے کا راز نہ کھل جائے۔ جب روٹیاں پک گئیں تو فضلاں ایک کوٹھری سے وہ ہانڈی لے آئی جس میں مکھن تھا۔ مگن شاہ چند روٹیاں اور مکھن حجرے کے اندر لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو مکھن سے تر ایک روٹی اس کے ہاتھوں میں تھی جسے وہ تیزی سے چبا رہا تھا۔ نوراں نے فضلاں کو بتایا کہ وہ اور شاداں بھوکی ہیں۔ فضلاں کے چہرے پر ناراضگی آ گئی۔ اس نے مگن شاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے کھالو۔ ورنہ ایک دن وہ ہم سب کو کھالے گا۔"

نوراں نے چپکے سے اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ رکھ دیا۔ فضلاں خوش ہو گئی۔ اس نے ماں اور بیٹی کے لیے جلدی سے روٹیاں بنا دیں۔

شام کے وقت نوراں نے کھانا پکانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ فضلاں کو اطمینان ہو گیا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو نوراں نے شاداں کو کہا کہ واجد کا کھانا حجرے میں لے جائے۔ شاداں ڈری ہوئی حجرے میں گئی اور واجد کے سامنے روٹیاں، دہی اور ساگ لگا دیا۔ لالٹین کی روشنی میں واجد کی نگاہیں شاداں کے چہرے پر پڑیں پھر اس کے بڑے بڑے پستانوں اور رانوں پر پھسلیں۔ اللہ توبہ دل ہی دل میں کہہ کر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ شاداں کو محسوس ہوا کہ اس کے سامنے پیر نہیں بلکہ ببول کا درخت تھا جس کی خاردار ٹہنیاں اس تک آئیں اور اپنے کانٹوں سے اس کے لباس کو نہ صرف تار تار کیا بلکہ اسے زخمی بھی کر دیا۔ شاداں تیزی سے حجرے سے باہر نکلنے لگی۔ گھبراہٹ میں دہلیز سے اسے ٹھوکر لگی۔ ایک سسکی اس کے منہ سے نکل گئی۔ واجد کو محسوس ہوا کہ اس نے ابھی نوراں کو دیکھا تھا اور سسکی اسی نے لی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کی آغوش میں وہ لیا کرتی تھی۔ واجد کو اپنا جسم گرم ہوتا محسوس ہوا۔ کنپٹیوں میں کوئے پھڑ پھڑانے لگے اور وہ ان کی کائیں کائیں سننے لگا۔ واجد کو لقمہ نگلنا مشکل محسوس ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔

شاداں گھبرائی ہوئی حجرے کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نوراں ابھی تک چولھے کے پاس مصروف تھی۔ اس کے گرد مکئی کی روٹیوں کی گرم خوشبو لہرا رہی تھی۔ اس کے قریب بیٹھی فضلاں جمائیاں لے رہی تھی۔ ان سے ذرا دور مگن شاہ دونوں ہاتھوں سے کھانے میں مشغول

تھا۔ کسی وجہ سے وہ چولھے سے دور تھا جس میں آگ بھڑک رہی تھی۔ جب کبھی چولھے میں جلتی لکڑی چٹختی تو مگن شاہ کانپ جاتا اور اس کے منھ سے ڈری ہوئی آواز منمناتی ہوئی نکلتی۔ لیکن کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں دی۔ وہ ایک بے معنی وجود تھا۔ ایک کبوتر جس کے پر نچے تھے اور جو اڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ خانقاہ کے باہر دور دور تک تاریکی تھی اور اس تاریکی سے مدھم اور ناآشنا آوازیں آرہی تھیں۔ یہ آوازیں درخت کی شاخوں سے آرہی تھیں جس پر پرندے آرام کرنے کے لیے بسیرا کر رہے تھے اور آسمان پر بے شمار منور کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے تارے جھانک رہے تھے۔ اس دنیا کو دیکھنے جو انہیں ہر رات اجنبی اور عجوبہ نظر آتی تھی۔

عشا کی نماز بھی با جماعت ہوئی۔ نماز کے بعد فضلاں چلی گئی۔ خانقاہ میں چار افراد سونے کی کوشش کرنے لگے۔ واجد کی نیند غائب تھی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ شاید نوراں چپکے سے اس کے پاس آجائے۔ حجرے کے باہر مگن شاہ خراٹیں لے رہا تھا۔ اس کی گہری نیند ایسی نشہ تھی جس سے اس کا جاگنا محال ہوتا تھا۔ اگر نوراں اس کے پاس آتی تو مگن شاہ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ماضی میں کبھی کبھی واجد کو خیال آتا کہ کالا دیو پر سچ مچ کوئی پراسرار کالا دیو ہے جو اسے زیر کرنے چلا آتا ہے اور اسے گناہ کی ترغیب دیتا ہے۔ اس سے لڑ کر اور اسے شکست دینے کے بعد اسے ابدی سکون محسوس ہوتا تھا۔ لیکن آج اسے شکست دینا مشکل محسوس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ آج جب نوراں اس سے ملی تھی تو اس کی آنکھوں میں حیا نہیں تھی اور وہ ٹانگوں کو پھیلائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ حالاں کہ ماضی میں وہ ہمیشہ اس کے سامنے سمٹی سمٹائی آنکھیں جھکائے اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ واجد کے ہاتھ اور پیروں میں سنسناہٹ ہوئی، اس کی شریانوں میں گرم خون کا شور اسے بے چین کرنے لگا۔ دل کی تیز بہت تیز دھڑکنوں نے اسے اٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے کروٹیں بدلیں۔ خدا کو یاد کیا۔ دعائیں مانگیں۔ لیکن سب بے سود۔ وہ اٹھ کر حجرے کے باہر گیا۔ جس کوٹھری میں نوراں اور شاداں سو رہی تھیں، اس کے بند دروازے کے باہر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے ایک ہاتھ دروازے پر رکھا اور دھیمے سے پکارا۔

"نوراں۔ نوراں۔"

"شاہ جی جاؤ۔ اللہ اللہ کرو۔" کوٹھری سے نوراں کی آواز آئی۔

واجد دم بہ خود ہو گیا۔ اس کی پاکدامنی تار تار ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی ایک کمزور انسان تھا

جسے بھٹکنے میں دیر نہیں لگی۔ لیکن نوراں بہتر انسان ثابت ہوئی۔ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد بھی بہت کم جانتا تھا۔ ندامت کی وجہ سے اس کا جسم پسینہ سے تر ہوگیا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنے حجرے میں آکر بستر پر پڑ گیا۔ دوسرے دن اسے نوراں سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ اس طرح پیش آتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ چند روز گزر گئے۔ نوراں خانقاہ کے شب و روز کی عادی ہوگئی۔ اسے اور شاداں کو گاؤں میں جانے سے واجد نے پہلے دن ہی سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے ادھر دونوں نہیں گئیں اور نہ ہی نوراں نے کوئی ایسی ضرورت محسوس کی۔ دونوں کے لیے فضلاں غنیمت جان تھی جس سے دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر لیتی تھیں۔

ایک دن گاؤں کا مکھیا حسن داد خوش خوش خانقاہ آیا۔ جہاں سے ضرورتمند جا چکے تھے۔ نوراں اور شاداں چشمے پر نہانے گئی ہوئی تھیں اور مگن شاہ بھی وہاں نہیں تھا۔ حسن داد نے اپنی پگڑی کسی اور اپنی گول داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا حجرے کے اندر چلا گیا۔ اسے دیکھ کر واجد خوش ہوگیا۔ حسن داد وہ خوش نصیب تھا جس سے واجد کچھ باتیں کر لیا کرتا تھا۔ خانقاہ کی مرمت، میرپور سے واجد کے لیے ماچس، کراسن کا تیل اور تعویذ لکھنے کے لیے کاغذات لے آنا، وہ خدمات تھیں جنھیں وہ واجد کے لیے انجام دے دیتا تھا۔ حسن داد کے انکار کے باوجود واجد ساری چیزوں کی قیمتیں ضرور ادا کر دیتا تھا۔

حسن داد نے جھک کر واجد کو سلام کیا۔ واجد نے سلام کا جواب دیا اور مشفقانہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ حسن داد خاموشی سے واجد کے پاؤں دبانے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے بولا۔

''شاہ جی...... ہم لوگ بہت خوش ہیں۔ اب آپ کی گدی کبھی خالی نہیں ہوگی۔'' وہ اس جائے نماز کی جانب اشارہ کر رہا تھا جس پر واجد بیٹھا ہوا تسبیح گردان رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' واجد نے حیرت سے پوچھا۔ تسبیح پر اس کی انگلیاں رُک گئی تھیں اور وہ حسن داد کو گھور رہا تھا۔

''اس لڑکی پر خدا کی رحمت ہو جسے تمہاری خالہ نوراں اپنے ساتھ تمہارے لیے لائی ہے۔''

''میرے لیے؟ نوراں میری خالہ ہے؟'' واجد حیرت اور غصے سے بولا۔ شادی نہ کرنے کی وجہ سے وہ عرفان کی ایسی منزل پر تھا جو بڑے بڑے بزرگوں کو میسر آتی ہے۔ لیکن اس کے

دل میں نوراں کی طلب ہوئی، اس کا رات کے وقت نوراں کو اپنے پاس بلانے کے لیے جانا۔ ان سب اَن ہونی نے اسے ایک معمولی انسان بنا دیا تھا اور نوراں نے سب کچھ جان لیا تھا، اور اس کے سامنے اب وہ بے بس تھا۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتی تھی، واجد اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

"تو کیا کہہ رہا ہے؟"

حسن داد پر واجد کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے بولنے لگا۔

"پیروں کے پیر۔ تمہاری خالہ کی بیٹی شاداں کو تمہاری بیوی بننی چاہئے۔ وہ کمسن ضرور ہے۔ لیکن وہ مضبوط ہے۔ تمہاری خدمت کرنے میں اس کے ہاتھ پیر کبھی ڈھیلے نہیں ہوں گے۔"

واجد ایک گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ چودہ سال کے عرصے میں نوراں ایک دلیر اور اپنے ارادوں کو خفیہ رکھنے میں ماہر بن چکی تھی۔ بغیر کسی مددگار کے ایک طویل سفر طے کر کے انجانی منزل تک پہنچ جانا کسی ادنیٰ عورت کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتی تو اس کی پیری بزرگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ وہ کبھی اس کی محبوبہ رہ چکی تھی اور اس کے جسم کے ساتھ واجد جیسے مرشد انسان نے عیش کیا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ واجد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ زندگی کی بہتی ندی کہاں رکتی ہے، کدھر جاتی ہے۔ اس پر واجد نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ جس مقدس کتاب کو اس نے حفظ کیا تھا اس کی بابت اسے یہی بتایا گیا تھا کہ دنیا کا سارا علم اسی میں ہے۔ اسے جان لو پھر کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس نے خدا کے قریب ہونے کی کوشش کی اور اسے پا لیا۔ مال و دولت کی اسے خواہش نہیں ہوئی۔ اس دور دراز جگہ میں وہ جو نیکیاں کر رہا تھا اس سے ہمیشہ اسے دلی سکون ملا۔ عورت کی قربت کی اسے خواہش ہوئی تو ہمیشہ نوراں اس کے سامنے آ گئی۔ اسی چاہت سے مجبور ہو کر وہ اس رات اس کی کوٹھری کی جانب گیا تھا۔ لیکن نوراں نے اسے گناہ کرنے سے روک دیا اور اس کے زہد و تقویٰ پر آنچ نہیں آنے دی۔ اس رات کے بعد وہ اپنی نظر سے گر گیا تھا۔ اس نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی تھی۔ نوراں کی طلب نہ ہو۔ اس کی جانب گناہ کے لئے قدم نہیں بڑھے۔ گو اس کے جسم کو حاصل کرنے کی کوشش اس نے پھر نہیں کی لیکن اسے اردگرد دیکھنے اور اس کی آواز سننے کی خواہش سے وہ نجات نہیں پا سکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شاداں کی جو مشابہت اپنی ماں سے تھی اس لئے اسے دیکھ کر اس کے دل میں نرمی آ جاتی تھی۔ اس کا آنکھوں کے سامنے ہونا اسے بھلا

لگتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ایسے احساسات سے دور رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا، اور آج یہ سن کر کہ نوراں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتی ہے وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شاداں سے اس کی شادی کی بابت نوراں سوچ سکتی ہے۔

''لیکن......'' بہ مشکل واجد کی زبان سے نکلا۔

''پیروں کے پیر۔ تمہاری زبان تالو سے چپکی ہے۔ ایسی باتوں میں ہاں کہہ دینا آسان نہیں ہوتا۔ چپ رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میرے لیے جب لڑکی چنی گئی اور مجھے اس کا علم ہوا تو میں جان کر بھی چپ رہتا تھا۔ میری بیوی اس وقت دس سال کی ہرن تھی۔ آج کی طرح موٹی بھینس نہیں اور میں اس وقت بارہ سال کا چیتا تھا۔ مٹی سے بھری بوری نہیں۔ جیسا کہ میری بیوی کہتی ہے۔'' حسن داد کا سر جھکا تھا اور اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔

''حسن داد کیا تو باؤلا ہو گیا ہے؟ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟''

''پیر بادشاہ۔ بیشک گالیاں دو۔ بلکہ مارو بھی۔ تمہارا جوتا سر پر رکھ کر اللہ کے پاس جائیں گے۔ ٹیڑھی آنکھوں والی فضلاں کا بھیجا نرم ضرور ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ شاداں جب ماں کے پیٹ میں تھی تو تمہارے جنتی ماں باپ نے یہ کہہ کر شادی طے کر دی تھی کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو ہماری بہو بنے گی۔ لیکن تم اللہ کی تلاش میں نکل گئے اور اپنی خالہ کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔ جب اسے تمہارا پتہ مل گیا تو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ اب وہ مبارک دن آ گیا ہے۔ تمہارے بزرگوں کا چاہا اب پورا ہونے والا ہے۔ خدا نے اس نیکی کے لیے ہمارے گاؤں کو چنا ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد تمہارا بیٹا اس گدی پر بیٹھے گا۔ اس کے پاس بھی مریدوں کی بھیڑ ہو گی۔ وہ ہمارے گاؤں سے ضرورت کی چیزیں خریدیں گے۔ پنجنی والوں پر اللہ کی برکت رہے گی۔'' حسن داد ہاتھوں کو اٹھا کر خدا کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

ایک مدت سے واجد کا تعلق گاؤں والوں سے تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ کبھی کبھی بے تکی باتیں کرتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا جب ایک فوجی افسر وردی میں ملبوس کسی وجہ سے سر پر بڑی سی پٹی باندھے ادھر سے گزرا تو پنجنی میں مشہور ہو گیا کہ پاک فوج میں سکھ بھرتی ہو گئے ہیں۔ لیکن آج حسن داد کی بے تکی باتوں کا تعلق واجد کی ذات سے تھا۔ وہ جھنجلایا ہوا حسن داد کو تک رہا تھا۔

''حسن داد تو یہاں سے جا۔ تیری باتیں مجھے بری لگی ہیں۔ میری عبادت کا وقت ہو رہا ہے۔'' واجد خشک لہجے میں بولا۔

حسن داد بغیر واجد کی جانب پشت کیے اس کی خفگی سے سہما ہوا حجرے سے نکل گیا۔ پیر سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئے تھیں۔ شادی کے بعد بیوی کے ساتھ بستر ے میں بری حرکت تو کرنی پڑتی ہے۔ پیر بادشاہ اسی لیے ناراض ہو گیا۔ حسن داد سوچ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد واجد تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نوراں کو ایسی مہمل بات گڑھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ اس الجھن کو نوراں ہی سلجھا سکتی تھی۔ وہ اور شاداں واپس آ گئی تھیں۔ ان کی گفتگو کو وہ سن سکتا تھا۔

''نوراں۔'' وہ کرخت آواز میں پکارا۔

نوراں حجرے میں داخل ہوئی۔ بارش سے دھلی پکی گندم کی طرح اس کی رنگت حجرے میں دمکی۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی تھی۔ کبڈی کے اس کھلاڑی کی طرح جو مخالف کھلاڑیوں کے نرغے سے فتح یاب نکل آتا ہے۔

''نوراں۔ فضلاں کیا فضول باتیں میری شادی کی بابت بولتی پھرتی ہے۔''

''میں نے اسے بتایا ہے۔'' نوراں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''کہ تو میری خالہ ہے؟''

''تو کیا لوگوں کو سچ بتاتی کہ ہم دونوں ننگے ہو کر ساتھ سو چکے ہیں۔''

''لے...... لیکن تیری بیٹی سے میری شادی......؟''

''تم میری بیٹی سے شادی کر لو۔'' نوراں نے جواب دیا اور واجد سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ملتجی نگاہیں واجد پر گڑی تھیں۔

''کیا اسی وجہ سے تو پہنچی آئی ہے؟''

''میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا شاہ جی۔ تم مجھے جب چھوڑ کر آ گئے تو مجھے گاؤں سے نکال دیا گیا۔ مجھے نیچ لوگوں کی بستی میں رہنا پڑا۔ میں بھی ان کی طرح نیچ بن گئی۔ چور اور ڈاکوؤں کی پناہ مجھے لینی پڑی۔ پھر میری بیٹی پر میرے کمینے شوہر کی بری نگاہ پڑنے لگی۔ شاداں کو میں کس سے بیاہتی۔ میں نے سوچا کہ تمہارے کسی مرید سے اس کی شادی کرا دوں گی۔ لیکن تمہیں اجاڑ دیکھ کر میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے تم نے اب تک اپنا گھر کیوں نہیں بسایا ہے۔ شاداں بالکل میری طرح ہے۔ میری طرح باتیں کرتی ہے اور چلتی پھرتی ہے۔ وہ میری جوانی ہے۔ تم اس سے بیاہ کر لو۔'' نوراں کے دونوں ہاتھ واجد کی جانب

پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اس سے بھیک مانگ رہی ہو۔

واجد کا سر جھکا تھا۔ نوراں سچ بولی تھی۔ جیسے اسے پتہ تھا کہ واجد سے اس کی پہلی محبت آخری ثابت ہوئی۔ آگ لگی۔ خوب بھڑکی، اور کبھی نہیں بجھی۔ اس کی چنگاریوں کو وہ ہمیشہ محسوس کرتا رہا تھا۔ شب و روز کی عبادتوں سے اگر اسے آسودگی ملی تھی تو بہت ساری راتیں اسی کی یاد میں کنکریوں پر کروٹیں لیتے واجد نے گزاری تھیں۔ اس کی زندگی میں ایک جانب اس کے کشف و کرامات اور معبود حقیقی سے قربتوں کا باغ تھا تو دوسری جانب اپنی محبوبہ کے بغیر اس کی زندگی ریت کا سمندر تھی۔ نوراں اس اسیے کو اس رات جان گئی تھی جب وہ اس کی کوٹھری کے دروازے کے پاس کھڑا اسے پکار رہا تھا۔

''میں شاداں کی طرح جوان نہیں۔'' واجد دبی زبان میں بولا۔

''مرد کبھی نہیں سوکھتا شاہ جی۔''

''مجھے کسی دوسری عورت کی ضرورت نہیں نوراں۔''

''ضرور ہے شاہ جی۔ میں تمہاری نہیں بن سکتی۔ نوراں وہ نہیں رہی۔ گزرے ہوئے چودہ برسوں نے جو چھین لیا وہ مجھے کبھی نہیں مل سکتا۔ اپنی زندگی کو اجاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہیں نوراں ہی دے رہی ہوں۔''

سامنے واجد کو اداس بیٹھا دیکھ کر نوراں کو اس پر ترس آ رہا تھا۔ واجد کے چہرے پر وہ لکیریں تھیں جنھیں عمر رفتہ نے اپنے تیز ناخنوں سے کھرچ کر گہرا کیا تھا۔ اس چہرے کی ویرانی کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ واجد نے سر اٹھایا اور پوچھا۔

''نوراں۔ تو نے اپنے خاوند کی بابت فضلاں کو کیا بتایا؟''

''میں نے کہہ دیا ہے کہ اس کے چہرے کے پاس کسی نے مذاق میں پھلجڑی چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے چنگاریاں اس کی آنکھوں میں چلی گئیں اور وہ اندھا ہو گیا اور اس وقت اپنی ماں کے پاس ہے۔ اسی لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا۔''

''جھوٹ بولنے میں تو بڑی طاق ہو گئی ہے۔''

''مجبور کے لیے جھوٹ سچ ایک ہیں شاہ جی۔''

''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

''پھر میں اور شاداں اسی خانقاہ میں بھیک مانگ کر گزارہ کریں گے۔'' نوراں کے لہجے

میں دھمکی تھی۔ جو عورت اتنی دور سے بغیر کسی یار و مددگار کے یہاں تک آ گئی تھی وہ مزید خطرہ مول لے سکتی تھی۔ واجد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''نوراں جا، جب میں بلاؤں پھر آنا۔ میری عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔''

نوراں باہر چلی گئی۔ اس کے ست چہرے کو دیکھ کر شاداں کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حجرے کے اندر نیچی آواز میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ماں اور اس عجیب و غریب پیر کے درمیان جو رشتہ تھا اس کی نوعیت وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اتنے سارے لوگ خانقاہ میں آتے تھے لیکن ان سے پیر و مرشد کی بات چیت برائے نام ہوتی تھی۔ لیکن اس کی ماں بغیر کسی جھجک کے حجرے میں چلی جاتی تھی اور دیر تک پیر سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد واجد دیر تک سوچتا رہا۔ اسے عورت کی طلب رہی تھی۔ لیکن خواہشوں کی رنگ برنگی تتلیوں کو اس نے زہد و تقویٰ کے جال میں بند کر دیا تھا۔ نوراں نے اس جال کو توڑ دیا تھا اور وہ تتلیاں اس کے گرد اڑ رہی تھیں۔ شاداں سے شادی کے بعد اس کے سراپا میں اسے نوراں ہی نظر آئے گی۔ اس سوچ کے ساتھ اس کے دل میں شاداں کے لیے وہی نرمی آ گئی جو اسے اکثر محسوس ہوتی تھی۔ اگر نوراں نہ ہوتی اور اسے شاداں ملتی تو کیا وہ اس کی جانب ملتفت نہیں ہوتا۔ اس کے دل نے اس کا جواب ہاں سے دیا۔

شام کی نماز کے بعد خانقاہ پر پاس کے پہاڑوں اور جنگلوں پر بسنے والی خاموشی چھا گئی اور آسمان سے وہ تاریکی اتر آئی جو انسان کے گناہ اور ثواب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ چولھے میں آگ روشن تھی۔ پاس بیٹھی نوراں اور شاداں کے سر سے دوپٹہ سرک آیا تھا اور ان کے سیاہی مائل کرتے کی آستینیں چڑھی تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور آگ کی گرمی سے ان کے چہرے پر تمتماہٹ تھی۔ دور سے برآمدے میں جلتے چولھے کی روشنی میں نوراں اور شاداں کسی ماورائی وجود کی طرح متحرک نظر آ رہی تھیں اور مگن شاہ اخروٹ کے درخت کے نیچے کھڑا اوپر شاخوں پر بیٹھی چڑیوں سے بے معنی باتیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہنسنے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگانے کی آواز آ جاتی۔

''ماں...... مگن شاہ کیا بول رہا ہے؟''

''پگلا ہے۔ دیوانے طوطے کو کچھ کہہ رہا ہو گا۔'' نوراں نے بغیر بیٹی کی جانب دیکھے ہنس کر جواب دیا۔

جب کھانا پک گیا تو نوراں روٹی اور دال لے کر حجرے میں گئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے واجد چونکا نہیں۔ اس نے قدموں کی آواز سے نوراں کا اندر آنا جان لیا تھا۔ وہ لالٹین جلانے میں مصروف تھا۔ جس کی روشنی اس کی الجھی زلفوں اور داڑھی کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں نے لمحے بھر کے لیے نوراں کا جائزہ لیا اور پھر لالٹین پر مرکوز ہو گئیں۔ واجد کا مہیب سایہ حجرے کی کھردری دیوار پر پھیلا تھا۔ نوراں نے اس کے قریب دری پر کھانا لگا دیا۔ دونوں کو کوٹ فتح خان میں اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔

"آج تو نے جو کہا ہے میں اس پر سوچتا رہا ہوں۔" آہستہ آہستہ روٹی توڑتا ہوا اور سر کو جھکائے ہوئے واجد بولا۔ نوراں کے انگ انگ میں جیسے کان اُگ آئے۔ واجد جو کہنا چاہتا تھا اسے سننے کے لیے وہ بے چین ہو گئی۔

"شاداں جس کوکھ سے پیدا ہوئی ہے اس میں میرے تخم بھی گرے تھے۔ اس سے میری شادی جائز نہیں۔" واجد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ وہ روٹی کے ٹکڑے کو منہ تک لے جانا بھول گیا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے فرش پر تھیں۔

"نادار کی مدد ضرور جائز ہے۔ خدا سے پوچھ لو۔ جہاں تمہارا بیج گرا وہاں کوئی فصل نہیں اُگی۔ اجاڑ کوکھ کے آنسوؤں میں وہ بیج بہہ گئے۔ ایسی سوچ بیکار ہے شاہ جی۔" نوراں کے سادہ فلسفے کے سامنے واجد کا سارا علم، اس کی ساری عبادتیں بے بس ہو گئیں۔ اس کے وجود میں وہ قدیم انسان جاگ اٹھا جو زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں کو نہیں سمجھتا، جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے جو کچھ بھی سامنے ہو اسے جھپٹ کر لے لیتا ہے۔

"میں نے ایک بار تجھے مجبور چھوڑ دیا تھا جس کا پچھتاوہ مجھے ہمیشہ رہا۔ تیرے دکھ کو اپنانا میرا فرض ہے۔ میں شاداں سے بیاہ کر لوں گا۔"

"اللہ کی برکت تم پر ہو۔" آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر نوراں بولی۔ اس کی قسمت اس طرح اچانک بدل جائے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شاخ سے ٹوٹا پتا ایک بار پھر اس سے جڑ جائے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے ہونے والے داماد کو گلے سے لگا لے لیکن وہ رک گئی۔

"میری شادی کے بعد کیا تو یہیں رہے گی؟" واجد نے نوراں کو غور سے تکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں شاہ جی۔ میں اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی۔ اسے کہہ دوں گی کہ شاداں

اغوا ہوگئی ہے۔"

واجد نے اطمینان کا سانس لیا۔ نوراں کی موجودگی میں کہیں اس سے کوئی خطا نہیں ہو جائے۔ واجد کو اس کا ڈر تھا۔ نوراں مسکراتی ہوئی حجرے سے باہر نکلی اور برآمدے میں بیٹھی شاداں کو گلے سے لگا کر بولی۔

"تو پیر جی کی دلہن بننے والی ہے۔ وہ بزرگ ہے۔ تیری حفاظت کرے گا اور تیرے گناہ کو معاف کر دے گا۔ اللہ اسی لئے اچھے لوگوں کو دیندار بناتا ہے۔"

چند لمحوں کے لیے شاداں ہکا بکا ہوگئی۔ پھر شرما کر اس نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔ کیا یہ سچ مچ ممکن ہوسکتا ہے؟ ایسا متبرک انسان کیا میری جیسی ایک عورت سے شادی کرے گا؟ اسے اپنی کوکھ میں کوئی شے لرزتی محسوس ہوئی۔ اس نے ڈری ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا جس کی بانہیں اب بھی شاداں کے گرد تھیں۔ نوراں نے شاداں کی آنکھوں میں خوف کی تحریر کو پڑھ لیا۔

"ماں، مجھے شاہ جی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"بزرگوں سے خوف آنا چاہئے۔ بغیر اس ڈر کے انسان نیک نہیں بن سکتا شاداں۔"

"لیکن ماں؟" شاداں کا ہاتھ اس کے پیٹ پر تھا۔

"تو اگر اپنے حواس درست رکھے گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچوں کی صورت اپنے ماں باپ سے اکثر ملتی جلتی نہیں ہوتی۔ تو معصوم ہے۔ معصوموں کا اللہ نگہبان ہوتا ہے۔" نوراں بڑے یقین سے بولی اور اس نے شاداں کو اور بھی مضبوطی سے اپنے سینے لگا لیا۔

"ماں۔ تو نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ تیرا کوئی رشتہ دار اتنا بڑا بزرگ ہے؟"

"جب لوگ دور جا بسے ہوں۔ ملنا جلنا نہ ہو۔ اچھے برے کی خبر نہیں آتی ہو۔ پھر کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔"

ماں کی باتوں سے شاداں کو بڑی تقویت ہوئی۔ وہ المیہ جس نے اسے خود کو ذلیل وخوار سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اس کے حسین خوابوں کو گندے پانی میں ڈبو دیا تھا۔ وہ المیہ مٹ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے ہونے والے شوہر کا پُر وقار چہرا آ گیا۔ حجرے سے بلند ہوتی اس کی شیریں تلاوتیں شاداں کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس کے مریدوں کا سہمے ہوئے اس کے حجرے میں جانا۔ فوجیوں کا اس کے سامنے مؤدبانہ کھڑے ہونا۔ سب کچھ شاداں کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اسے واجد کے لیے ایک عجیب سے اپنے پن کا احساس

ہوا۔ وہ اپنے خاوند کی ہر طرح خدمت کرے گی۔ اسے ہمیشہ خوش رکھے گی۔ نمازیں پڑھے گی اور روزے بھی رکھے گی۔ شاداں نے تہیہ کرلیا۔

ماں اور بیٹی دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں۔ نوراں سرگوشیوں میں کچھ بولتی اور شاداں ایک دو الفاظ میں سر جھکائے جواب دے دیتی۔ بیٹی کو ماں بتاتی رہی کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ زندگی کی تلخیوں نے جو چالا کیاں نوراں کو سکھائی تھیں انھیں وہ شاداں کو بتا رہی تھی۔ معصومیت اور سادگی کے ساتھ ہشیاری اور خاموشی بھی زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔

۱۱

کرنل حنیف کی ابروئیں آپس میں گتھ گئیں اور وہ کرسی پر سے اٹھ کر کچھ سوچتا ہوا ٹہلنے لگا۔ آفیسر میس میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بٹالین کے افسر جا چکے تھے۔ کرنل حنیف کو دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ عموماً میس کے باہر آنگن میں چنار کے درختوں کے سائے میں بیت کی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر زندگی اور فوج کے مسائل پر سوچا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔ اور دنوں کی طرح آج بھی سامنے گرمی کی شدت سے کمھلائے درختوں سے ڈھکا پہاڑ اور میس کے پیچھے مٹی سے بنے وہ بنکر جس میں افسر رہتے تھے اور ان بنکروں کے قریب تندر گاؤں، انھیں دیکھ کر ایک عجیب سی یکسانیت اور اکتاہٹ کا احساس ہوا۔ ایسی بیزاری اسے اکثر ہوتی جس سے نجات عبادت اور قرآن کی تلاوت کے دوران اسے ملتی تھی۔ چند سال پہلے اس کی چہیتی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کی سختی سے پابند بیوی نے مرنے سے پہلے کرنل حنیف سے وعدہ لیا تھا کہ وہ بھی اپنی زندگی کو خدا اور رسول کے احکامات کا پابند بنائے گا۔ کرنل حنیف نے یہی کیا اور اس میں جو سکون اسے ملا اس کی وجہ سے اپنے ماتحتوں کو بھی ان فرائض کو پورا کرنے کی ہدایتیں دینے لگا۔ آج کرسی پر بیٹھے ہوئے بیزاری کی حالت میں اسے اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ کوٹلی میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو کسی طرح آمادہ کیا جائے کہ اس علاقے میں تندر گاؤں کے آس پاس چھوٹے پیمانے پر مصنوعی جنگ لڑی جائے۔ فوج کو چاق چوبند رکھنے کے لئے اکثر ایسے کارنامے کئے جاتے تھے۔ اسی سوچ نے اسے ٹہلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وقت سارے افسر اپنے بنکر میں سو رہے ہوں گے۔ کاش ان ست افسروں کو میری طرح صرف چار گھنٹے سونے کی عادت ہوتی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اس وقت میرے پاس بیٹھے

خدا رسول اور فقہ پر باتیں کر رہے ہوتے۔ کرنل حنیف کو خیال آیا۔ نمی سے بوجھل دن ارد گرد کی پہاڑیوں اور قریب کے تندر گاؤں پر آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ سامنے جو سڑک نیچے وادی میں بٹالین ہیڈ کوآرٹر کو جاتی تھی وہ اس وقت ویران تھی۔ گاؤں کے سامنے کھیتوں سے کوئی پکار رہا تھا۔ ''فقیرا۔ فقیرا۔''

کرنل حنیف دوبارہ بید کی کرسی پر آکر پسر گیا اور اپنی خاکی قمیص کے بٹن اس نے کھول دیئے۔ ساتھ کی تپائی پر لسی کا جو خالی گلاس رکھا تھا اس پر منڈلاتی مکھیاں اس کی گھنی مونچھ اور گال پر آکر بیٹھنے لگیں۔ کرنل حنیف نے ایک موٹی سی گالی دے کر انھیں چہرے پر سے اڑا دیا۔ اب اسے اس جنگ کا خیال آنے لگا جو اس کے تخیل میں اکثر ہوا کرتی تھی اور جس میں اس کی سی کمپنی جو جنگ بندی لائن پر تھی اس کی چھوٹی توپ کے گولوں سے وادی میں مقیم دشمن کمپنی کا صفایا ہو جاتا تھا۔ اور اس کی ڈی کمپنی جو کالا دیو کی ڈھلان پر تھی وہ گولہ باری سے دشمن کو نیچے وادی میں کوٹلی کی جانب جانے سے روک دیتی تھی۔

اگر دشمن کا پلہ بھاری ہو گیا تو؟ ہو سکتا ہے سامنے پہاڑ کی ڈھلان پر اس کی فوج نیچے اترتی نظر آئے۔ کرنل حنیف کو خیال آیا۔ اس نے اپنے چوڑے سینے کو تھپتھپایا اور اپنی گھنی مونچھوں پر اس نے ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے کھردرے چہرے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ اس کے بازو کے پٹھے اکڑ گئے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے فوجی دستے کو ساتھ لے کر جوابی حملہ کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دشمن کا کمانڈنگ افسر کرنل تیواری ہو جس کی تلوار کٹ مونچھیں تھیں اور جس کے ساتھ حنیف نے ملٹری اکیڈمی، پونا سے کامیابی حاصل کی تھی اور بعد میں دونوں ہی سات کمائیوں رائفلس میں افسر کی حیثیت سے سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر گئے تھے۔ وہ بھی اب کرنل ہی ہوگا۔ حنیف نے سوچا۔ نہ چاہنے کے باوجود بہت سارے خیالات کرنل حنیف کے ذہن میں آگئے۔ انھیں ۱۹۴۳ء کی وہ رات یاد آگئی جب سات کمائیوں رائفلس کلکتے میں برما کے محاذ پر بھیجے جانے کے لیے کیمپ میں حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ انھیں چھٹی ملی ہوئی تھی اور دونوں شہر کے نفیس ہوٹل میں دیر تک مشن ہسپتال کی دو جوان نرسوں کے ساتھ شراب پیتے رہے تھے۔ جب رات ڈھل گئی تو دونوں نرسوں کو اس کمرے میں لے آئے جسے ایک رات کے لئے انھوں نے لے رکھا تھا۔ کرنل حنیف کو جو نرس پسند آئی وہ جب ڈیوٹی پر نہیں ہوتی تھی تو ناک میں ننھا سا نتھ ڈال لیتی تھی۔ اس نے انھیں اشاروں سے بتایا کہ اگر وہ ان پر کارروائی کے

دوران سوار ہوئی تو انھیں زیادہ لطف آئے گا۔ لیکن ان کا لطف خاک میں مل گیا۔ جب وصل کی لذت سے بے قابو ہو کر لیفٹیننٹ حنیف نے دانت پیس لیے تھے اور ان کے جبڑے کے پٹھے کھنچ کر ان کے منھ کو ہیبت ناک بنا چکے تھے۔ وہ آہ آہ کرنے لگے اور نرس قہقہہ مار کر ہنسنے لگی اور ساتھ ہی اس کی ناک کی ننھی بالی زور زور سے ہلنے لگی۔ انھیں غصہ تو بہت آیا لیکن خاموشی سے انھوں نے اجرت دے کر اس مسخری کو روانہ کر دیا تھا۔ اس رات کیپٹن تیواری، جن کی تلوار کٹ مونچھ تھی اور جو اس وقت دھان پان تھے ان کا تجربہ اور بھی انوکھا ہوا تھا۔ ان کی معشوقہ نے بتایا کہ وہ گانے کی بہت شوقین ہے اور فلم میں جانا چاہتی ہے۔ وہ ذرا پہلوان قسم کی تھی۔ جب کیپٹن تیواری مصروف ہوئے تو اس نے گنگنانا شروع کر دیا۔

''انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا۔'' جب وہ 'چلے نہیں جانا گاتی' تو ساتھ ہی نیچے سے دھکا مارتی۔ جب تیواری اس کے جسم میں اپنا آتشیں سیال داخل کرنے کے بعد تھکے ہوئے اس پر ڈھیلے پڑے تھے تو اس دیوانی مغنیہ نے، چلے نہیں جانا، گا کر اس زور سے دھکہ مارا کہ کیپٹن تیواری دھڑام سے تنگ پلنگ کے نیچے گر پڑے۔ کیپٹن تیواری نے غصہ میں اسے پیٹنا چاہا۔ اس عورت نے بھی مکہ تان لیا، ساتھ ہی دھمکی دی کہ وہ ان کے انگریز کمانڈنگ افسر سے شکایت کر دے گی۔ جس کے ساتھ وہ شب بسری کر چکی تھی۔ مجبوراً لیفٹیننٹ تیواری کو اسے خاموشی سے رخصت کرنا پڑا۔

ان واقعات کو یاد کر کے کرنل حنیف زور سے ہنس پڑے۔ ٹھیک اسی وقت ان کے ایڈجوٹنٹ نے سامنے آ کر سیلوٹ کیا۔ اس نے کرنل حنیف کو قہقہہ مارتے دیکھ لیا تھا۔ جب سے ان پر مذہب کا بھوت سوار ہوا تھا۔ اسمارٹ ایڈجوٹنٹ کو اپنے کرنل کے دماغ کے پلپلے ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا۔ اور اب اکیلے بیٹھے ہوئے کرنل حنیف کو قہقہہ مارتے دیکھ کر اس کا شبہ یقین میں تبدیل ہونے لگا، ایڈجوٹنٹ کا نوجوان چہرہ پسینے سے نم تھا۔ چھوٹی آنکھوں سے خود اعتمادی ٹپکتی تھی۔ جنگ بندی لائن کے قریب بٹالین کی جو کمپنیاں تھیں، ان کا معائنہ کر کے وہ آ رہا تھا۔

''حولدار!'' کرنل حنیف کڑکتی ہوئی آواز میں پکارا۔

''یس سر۔'' حولدار نے کچن سے جواب دیا اور تیز تیز چلتا ہوا آیا۔ اس نے کرنل حنیف کو سیلوٹ کیا۔

''ایڈجوٹنٹ صاحب کے لیے کرسی لاؤ'' حولدار بھاگتا ہوا گیا اور کرسی لے آیا۔ کرنل

حنیف نے ایڈ جوٹنٹ کو بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور بیلٹ کھول کر کمر سے نکالا اور حولدار کو نیبو کا شربت لانے کے لیے کہا۔

''آگے کی کمپنیوں کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے سر۔ دشمن کی نئی بٹالین آگئی ہے۔ میں نے کمپنی کمانڈروں کو کہہ دیا ہے کہ زیادہ محتاط ہو جائیں اور فائٹنگ پٹرول کی گشتی کو زیادہ کر دیں۔''

''گڈ۔ شاباش۔ نئی بٹالین اپنی اہمیت جتانے کے لیے کسی بہانے فائرنگ شروع کر سکتی ہے اور جاسوسی کارروائیاں بھی کچھ زیادہ کر سکتی ہے۔'' کرنل حنیف نے سنجیدگی اور ہاتھ کے اشارے سے خبر دار کیا۔ حولدار شربت لے آیا تھا۔ ایڈ جوٹنٹ اس کی چسکیاں لینے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گلاس کو پکڑا ہوا تھا۔

''کیپٹن عظمت۔ گلاس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑنا شرعاً منع ہے۔'' کرنل حنیف نے تنبیہ کی۔

''سر سوری۔ میں ایک ہاتھ ہی کا استعمال کیا کرتا تھا۔ لیکن میجر طارق نے کہا کہ تمہاری بری عادتوں کا یہ نتیجہ ہے۔''

''ناٹی میجر طارق۔ اسے اب پانچ وقت کی نماز پڑھنا پڑ رہا ہے، جلد اس کے دماغ کا فتور نکل جائے گا۔'' کرنل حنیف نے ذرا مسکرا کر اور سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''سر میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے کہوں کہ آگے جو کمپنیاں ہیں ان کے جوانوں کو فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ دے۔''

''اچھا خیال ہے۔ اسے ٹریننگ یہاں ہیڈ کوارٹر میں بھی دینی چاہیے۔'' کرنل حنیف کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ اسے اپنی فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ یاد آرہی تھی جسے اس نے جونیئر کمیشنڈ افسر کی حیثیت سے حاصل کیا تھا۔

''سر۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ سی اور ڈی کمپنی کے کچھ سپاہیوں کو چھوٹے ہتھیار کے استعمال میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر ٹریننگ کے لیے بھیجنا ہوگا۔''

''مجھے یہی خیال اکثر آیا ہے۔ جنگل میں جنگ کی مہارت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ پہلے ان سپاہیوں کو بھیجو جو ابھی نئے نئے ریجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے آئے ہیں۔'' کرنل حنیف کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ غور سے اپنے ایڈ جوٹنٹ کو تک رہا تھا جو شربت کی ٹھنڈک میں اپنی تکان کو جذب کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ان کے سروں کے اوپر سے دو چیل تیزی سے اڑتے ہوئے گزر گئے۔ شمال کی طرف جو پہاڑ تھا اس پر مردوں اور عورتوں کا ننھا سا قافلہ آہستہ آہستہ بلندی پر ننھے گاؤں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کرنل حنیف کی نگاہ ادھر بھٹکی۔ وہ سوچنے لگا جب جنگ ہوگی تو یہ سارے گاؤں جو جنگ بندی لائن کے قریب ہیں وہ سب کے سب ویران ہو جائیں گے۔ لیکن لوگوں کے اجڑنے کے خیال سے اسے اداسی نہیں ہوئی۔ اس کے ذہن میں سارا نقشہ تھا۔ جنگ اور امن میں اسے کیا فیصلے کرنے ہیں اسے پتہ تھا۔ ایڈ جوٹنٹ کا اگر تبادلہ ہو جاتا ہے تو وہ بٹالین کے کس افسر کو ایڈ جوٹنٹ بنائے گا۔ سپلائی کور کا نیا کمیشنڈ افسر جو بٹالین میں ٹریننگ کے لیے آیا ہے اس کی انگریزی بہت کمزور ہے۔ اس کی اصلاح کس طرح کرنی ہے۔ پاس کی پہاڑی کے نیچے جو غار ہیں۔ جنگ کے دوران ان میں کسے ہیڈ کوارٹر کے لیے انتخاب کرنا پڑے گا اور کس میں میڈیکل ایڈ پوسٹ ہوگا۔ کسی نئے خیال سے کرنل حنیف کا چہرہ چمک اٹھا۔ جس انقلاب کو اس نے اپنی بٹالین میں برپا کیا تھا اس کے تصور سے اس کی روح جگمگانے لگی تھی۔ اس نے اچانک کیپٹن عظمت سے سوال کیا۔

''اور کیا خبریں ہیں؟'' عظمت سمجھ گیا کہ اس کا کرنل کیا سننا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر کیوں معنی خیزی آگئی ہے۔ اس کے سخت ہاتھ کیوں بار بار کرسی کے ہتھے کو تھپتھپا رہے ہیں۔ عظمت نے شربت کا لمبا گھونٹ لیا۔ وہ میلوں چل کر آیا تھا۔ تھکان اس کے جسم میں گرم سیسے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ شربت کی شیریں ٹھنڈک جو اس کے جسم میں سرایت کر رہی ہے وہ ختم نہ ہو۔ اس کی پیاس نہیں بجھے اور نہ ہی وہ گلاس کو اپنے منہ سے ہٹائے۔ جس موضوع پر اب باتیں ہونے والی تھیں، ان میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ ہر دن اس کے ذکر سے اسے اکتاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ لیکن افسرِ اعلیٰ کو خوش رکھنا اس کی اطاعت گزاری میں اپنی زندگی قربان کر دینا اس کا فرض تھا۔ عظمت کے وجیہہ کھلنڈرے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔ وہ بولا۔

''اس کمپنی میں بھی جوانوں کو ہدایتیں دی جا رہی ہیں کہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھیں اور کمپنی کمانڈر میجر طارق نے کچھ زیادہ ہی داڑھی بڑھالی ہے۔ اور......'' کیپٹن عظمت زور سے ہنسا۔

''اور؟''

''ان کی بیوی نے اپنی تصویر بھیجی ہے جس میں وہ نہ صرف برقعہ میں ہیں بلکہ اس کا نقاب بھی چہرہ پر ہے اور برقعہ کے باہر ان کا مکھڑا تنا ہوا ہے۔''

"وہ کیوں؟" کرنل حنیف نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"سر! آپ کو پتہ ہے میجر طارق دل پھینک قسم کے آدمی تھے۔ جب ہماری بٹالین کی ملتان میں پوسٹنگ تھی تو میجر طارق ایک رات رنگ رلیاں منا کر جب گھر پہنچے تو ان کی والدہ اور بیگم نے ان کی پٹائی کر دی تھی۔" کرنل قہقہہ مار کر دیر تک ہنستا رہا پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو کر بولا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ پنج وقتی نماز کے لئے آرڈر جاری کر دوں۔"

"سر۔ یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ بٹالین کے امام کی روزانہ مذہبی پند و نصیحتوں سے ہمارے افسر بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگے ہیں۔" کیپٹن عظمت نے احتجاج کیا۔ اسے پتہ تھا کہ عقل کی آگ جہالت کی منجمد برف کو جلد نہیں پگھلا سکتی۔

"پند و نصیحتوں کے بغیر وہ سچے مسلمان کس طرح بن سکتے ہیں؟ مذہب زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" کیپٹن عظمت نے بے دلی سے کرنل کی رائے سے اتفاق کیا۔

"میں پنجنی کے پیر چپ شاہ کو بٹالین میں آنے کے لیے کہتا۔ سپاہی ان کی قرآن خوانی سن کر جھوم جاتے۔ لیکن چپ شاہ اپنی خانقاہ سے صرف جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے۔" کرنل حنیف نے اپنی ایک ٹانگ کے اوپر دوسری ٹانگ چڑھائی تھی۔

"آپ حکم دیں۔ میں انھیں پکڑ کر یہاں لے آتا ہوں۔"

"نادان۔ تم جیسوں کی بدتمیزی نے اسلام کو غارت کیا ہے۔" کرنل حنیف نے شفقت سے ڈانٹا۔

"سر۔ وہ مجھے پہنچے ہوئے بزرگ نہیں لگتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے کسی بڑے شہر میں ہونا چاہئے۔"

"عظمت...... انھیں دنیا سے واسطہ نہیں۔ جبھی اتنی دور آ بسے ہیں۔ وہ حافظ قرآن ہیں ہر سورۃ کے معنی جانتے ہیں۔ جب سن سینتالیس میں یہاں جنگ ہو رہی تھی تو جو فوجی افسر یہاں تھے وہ اس کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اپنی خانقاہ میں وہ مجھے اپنی شیریں قرائت سے نواز چکے ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔" کرنل حنیف ہر لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔ بولتے وقت اس کے ہاتھ کبھی آسمان کی جانب بلند ہو جاتے اور کبھی نیم دائرہ سا بناتے۔ اس کے لہجے میں

اعتماد تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا اس پر اسے یقین تھا۔ کسی خوشگوار یاد سے کیپٹن عظمت کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے رومال سے اپنے لب اور مونچھ کو خشک کیا۔

"سر۔ کیا آپ کو علم ہے کہ چپ شاہ شادی کر رہے ہیں؟"

"واقعی؟" مارے حیرت کے حنیف کا منہ کھل گیا۔ پیر کی بابت وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ اب تک کنوارا کیوں ہے؟

"لڑکی چند دن پہلے اپنی ماں کے ساتھ چپ شاہ کی خانقاہ میں پہنچی ہے۔"

"اور اس کا باپ؟"

"وہ اندھا ہے اور اس وجہ سے سفر نہیں کر سکتا۔" کیپٹن عظمت اب بھی مسکرا رہا تھا۔ کرنل حنیف کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ بولا۔

"میں ہمیشہ تم لوگوں کو کہتا رہا ہوں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ لیکن یہ لڑکی کون ہے؟"

"سر۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن پیر کے والدین نے لڑکی پیدا ہونے سے پہلے ہی اس رشتے کو طے کر دیا تھا۔"

کیپٹن عظمت نے شربت کے خالی گلاس کو زمین پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"معجزہ! اب پیر کو ایک عورت کی قربت بھی میسر ہوگی۔ معجزہ!" کرنل حنیف کے لہجے میں تلذذ تھا۔

"اور......"

"اور......" کرنل حنیف نے عظمت کا لفظ دہرایا۔

"سپاہی کہہ رہے تھے کہ وہ پکے ہوئے سیب کی طرح حسین ہے، اور اس کی ماں بھی اسی کی طرح خوبصورت ہے۔"

"خوش قسمت پیر......لیکن دیکھو......"

"یس سر......"

"سپاہیوں کو حکم دو کہ جب رات کے وقت گشت کرتے ہوئے ادھر نکلیں تو اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ حسین چہروں کو دیکھ کر دل پر کیا گزرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔ لیکن؟"

"لیکن کیا؟"

"اگر مرد کی نگاہ ہر روز عورتوں پر پڑتی ہے یا وہ ان کے درمیان کام کرتا رہتا ہے پھر اس کی جنسی خواہشات اتنی نہیں بھڑکتی۔"

"یہ نامردی کی نشانی ہے۔"

"سر میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ میرا بھائی جرمنی میں جس فرم میں کام کرتا ہے وہاں اس کے گرد لڑکیاں ہوتی ہیں میں اسی کے خیالات کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"وہ سینکڑوں میں ایک ہوگا۔ چونکہ وہ سچا مسلمان ہے اس لیے اس کے جذبات نہیں بھڑکتے۔ کبھی تم نے سوچا ہے کہ عورتوں کو برقعہ پہننے کا کیوں شرعاً حکم ہے؟" کرنل حنیف کی گفتگو میں گرمی اور تیزی آ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں عظمت پر گڑی تھیں۔

"سر! یہ عورتوں پر ظلم ہے۔ وہ چلتی پھرتی خیمہ لگتی ہیں۔"

"مہمل...... بالکل مہمل...... برقعہ پوش عورتوں کو دیکھ کر یہ جاننا ناممکن ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی ہیں یا جوان، حسین ہیں یا بدصورت۔ اس لیے انھیں دیکھ کر مردوں کے جذبات نہیں بھڑک اٹھتے۔" کرنل حنیف کا سینہ تنا تھا اور سر بلند۔ جیسے اس کے سامنے صرف عظمت نہیں بلکہ ایک بڑا مجمع اس کی تقریر سن رہا تھا۔

"لیکن سر! برقعہ پوش عورتوں کی آنکھیں تو نظر آتی ہیں اور وہ ان کے خیالات کا بڑی بیباکی سے اظہار کرتی ہیں، اور اگر وہ چادر کا استعمال کرتی ہیں یا حجاب باندھتی ہیں تو چہرہ نہیں چھپتا۔ حسین چہرے کو دیکھ کر کس کا دل نہیں مچلتا۔" کیپٹن عظمت اپنے جواب سے مطمئن کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

"حیرت ہے آج تم میرے دلائل کو نہیں تسلیم کر رہے ہو۔"

عظمت کس طرح کہتا کہ اس وقت ایسے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی جس پر سچا مسلمان اظہار رائے سے جھجکتا ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ ایسا مسلمان نہ اپنی نم خوابیوں کا ذکر کرتا ہے اور نہ ہی اپنی جنسی کارروائیوں پر کچھ بولتا ہے۔

"سر...... میں مختلف لوگوں کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔"

"تمھیں اس اسلامی مرکز میں جانا چاہئے جسے سابق اعلیٰ افسر کفیل الزماں نے قائم کیا ہے۔ تم نے ان کا نام سنا ہے؟"

"ہاں سر سنا ہے وہ اسلام پھیلانے لندن اور پیرس جیسے شہروں میں جاتے ہیں۔ حیرت

ہے وہ افریقہ کے ان ملکوں میں نہیں جاتے جہاں قبل تاریخ کے مذہب ابھی تک مقبول ہیں اور جہاں عورتوں کا ختنہ ہوتا ہے۔ سوڈان بلکہ مصر میں بھی یہ خباثت رائج ہے۔''

''کیپٹن عظمت۔ وہ دونوں اسلامی مما لک ہیں، وہاں کے لوگوں کو عقل آ ہی جائے گی۔ کفیل الزماں افریقہ جا کر کیا کریں گے۔ ورلڈ بینک اور آئی۔ ایم۔ ایف کیا افریقہ میں ہیں؟ پہلے انھیں اسلام کا مطیع کرو۔ پھر ساری دنیا میں اسلام پھیل جائے گا۔''

''سر میرا ایک واقف کفیل الزماں کو ان دنوں سے جانتا ہے جب وہ اعلیٰ افسر نہیں تھے۔ وہ لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے......''

''تو کیا ہوا؟'' کرنل حنیف کا منھ ناسمجھی کی وجہ سے کھل گیا تھا۔

''سر وہ دونوں لڑکیاں نو بالغ تھیں۔ ان میں سے ایک کا کفیل الزماں پستان ملتا ہوا پایا گیا تھا۔'' کیپٹن عظمت کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔

گفتگو یہ رُخ لے گی، کرنل حنیف کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ عظمت بہترین افسر تھا۔ شرارتاً بھی وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ کرنل حنیف نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے جذبات انگیختہ ہو گئے تھے۔

''واقعی؟'' اس نے ہیجانی لہجے میں عظمت سے پوچھا۔

''جی ہاں سر۔ بالکل سچ ہے۔ لیکن کفیل الزماں نے دوسری لڑکی سے شادی کر لی۔''

کرنل حنیف چپ رہا۔ وہ اپنے بوٹ کی ایڑی سے زمین کو آہستہ آہستہ رگڑ رہا تھا۔ وہ نگاہ نیچے کیے ہوئے بولا۔

''کفیل الزماں کو دونوں لڑکیوں سے شادی کر لینا چاہئے تھا۔'' کیپٹن عظمت خوش تھا۔ اس نے ایک بے معنی اور بے مصرف گفتگو کے بدلے ایک دلچسپ موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔

''ہاں سر۔ پھر اسے ہمیشہ آرام رہتا۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ انٹیلی جنس کور کا ایک نائک ہماری بٹالین میں پوسٹ ہوا ہے۔ میس میں آنے سے پہلے میں دفتر گیا تھا، وہیں مجھے بریگیڈ کا سگنل ملا۔''

''اچھا ہے۔ ہم اپنی بٹالین کی عمدہ ٹریننگ سے اسے آگاہ کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر۔ میں چلتا ہوں۔'' کیپٹن عظمت کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں بوٹ کو زور سے ایک دوسرے کے ساتھ مارا اور اپنی ٹوپی اور بیلٹ اٹھا کر میس سے چلا گیا۔

۱۲

پنجنی پر سورج کا سونا برس رہا تھا۔ وہ راستے جو چیڑ کے درختوں اور چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس گاؤں تک آتے تھے، جن پر ہمیشہ گھنے درختوں کا سایہ رہتا تھا، ان راستوں پر آج کچھ زیادہ ہی مسافر نظر آرہے تھے۔ پیر واجد کی شادی کی خبر ان چند ننھے گاؤں میں پھیل گئی تھی جو وادی میں جنگ بندی لائن کے اس جانب تھے جدھر پاکستانی فوج تھی۔ ان گاؤں سے پیر کے مرید نہ صرف اس کی بیوی کو دیکھنے بلکہ اچھے کھانے کی امید میں بھی خانقاہ کی جانب آرہے تھے۔ انھیں بلاوہ نہیں گیا تھا۔ لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پیر کی خوشی میں شریک ہونے کا حق اس کے مریدوں کو تھا اور وہ نذرانے میں گھی، دہی، انڈے کے ساتھ ادھر جارہے تھے۔

وہ ہنستی اور مسکراتی عورتیں جو خانقاہ کے برآمدے میں شاداں کے گرد تھیں، ان سب کی نگاہ شاداں پر جمی تھی۔ جو سرخ دوپٹہ اور اسی رنگ کی شلوار اور جمپر میں سر جھکائے اور شرمائی سی خاموش بیٹھی تھی۔ یہ ملبوس پنجنی کے مکھیا حسن داد کی بیوی نے اسے دیا تھا اور شاداں کی کلائی میں چاندی کی جو چوڑیاں تھیں وہ اس کی ماں نے اسے پہنائی تھیں۔ گاؤں کی عورتوں کو حیرت ضرور ہوئی کہ نوراں بیٹی کی شادی کرنے آئی لیکن ساتھ دو نئے جوڑے بھی نہیں لائی۔ لیکن نوراں نے اطمینان سے جواب دے دیا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد کسے امید تھی کہ پیر اب تک کنوارا ہی ہوگا۔ وہ تو خواب میں اسے پیر کے ماں باپ نظر آگئے تھے جنھوں نے اس کا پتہ بتایا اور اس کے پاس جانے کا حکم دیا ورنہ وہ انتظار ہی کرتی رہ جاتی۔ ماں کے حکم سے شاداں نے سر جھکائے رکھا تھا اور اب اس کی گردن بھی دکھ رہی تھی۔ کبھی اس کی نگاہ اپنی ہتھیلیوں پر جاتی جو

حنا سے سرخ تھیں اور کبھی کلائی کی چوڑیوں پر۔ اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہونے لگتا۔ اگر نگاہ پیٹ کی جانب بھٹکتی تو وہ اچانک کانپ جاتی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے۔ لیکن ماں پاس تھی، چٹان کی طرح ایک سہارا اور اس خیال سے اسے تقویت محسوس ہونے لگتی۔

اچانک وہ عورتیں جو شاداں کے گرد بیٹھی تھیں ان کے منھ سے مترنم آبشار کی طرح گیت پھوٹ پڑا۔ گانے والیاں دلھن کے حسن کی تعریف کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوشی کی تمتماہٹ تھی اور ان کی گردن کی رگیں نمایاں ہو گئی تھیں۔ جو جوان نہیں تھیں انھیں بھی اپنی جوانی، خواہشات، محبت اور امیدیں یاد آ رہی تھیں۔ ان کی شادی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی جب ان کے ہاتھ مہندی سے سرخ تھے اور ان کی زلفوں میں چنبیلی کے تیل کی خوشبو تھی۔

مگن شاہ کچھ فاصلے سے سب کچھ بڑی مسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب سا منظر تھا اس کے سامنے۔ اس کی نگاہیں بار بار شاداں پر جاتیں۔ اس کا سرخ لباس اور اس کا اس طرح سر جھکائے خاموش بیٹھے ہونا۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ کیوں نہیں گا رہی تھی؟ گانے کا رسیلہ پن اس کی روح میں بھی شادمانی بکھیر رہا تھا۔ اس کے سر پر فوجیوں والی ٹوپی تھی اور کسی فوجی کی دی ہوئی پھٹی خاکی قمیص اور اسی رنگ کی بوسیدہ پتلون۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ جوش اور ولولہ جو عورتوں میں تھا، امنگ بن کر اس پر بھی چھا گیا۔ ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بے اختیار اس کے منھ سے بلند ہوا۔ گاؤں کے مکھیا حسن داد نے اثبات میں سر ہلایا اور گاؤں کے دو تین چھوکرے جو پاس ہی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، انھوں نے بھی نعرہ دہرا دیا۔

''سچا ہے تو مگن شاہ...... اس بیلا اللہ کی بڑائی ضرور یاد آتی ہے۔'' گاؤں کا مکھیا دھیمی آواز میں بولا۔

مگن شاہ مسکرانے لگا۔ جو خوشی اسے تھی اس کا اظہار اس نے کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد گاؤں کا چوکیدار رحمو ایک لنگڑی بکری کے ساتھ پہنچا۔ بکری کے گلے میں ڈور بندھی تھی اور وہ اپنی سیاہ معصوم آنکھوں سے سبھوں کو تک رہی تھی۔ رحمو نے ڈور کو برآمدے کے ستون سے باندھ دیا۔

حسن داد کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔

''ارے...... اسے کس کے ریوڑ سے اٹھا لائے۔''

رحمو کے چڑیا جیسے چہرے سے عیاری ٹپکتی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنی گدلی داڑھی کو مٹھی میں دبایا جیسے اس پر اپنا غصہ نکال رہا ہو اور تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

"حسن داد تیرے بھیجے میں پانی بھر گیا ہے۔ میں چور نہیں۔ گاؤں اور وہاں رہنے والوں کے جان و مال کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

"ارے ویرا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تو جانتا ہے ساری برادری میں تو ہی میرا لاڈلا ہے۔ میری بیوی کے تایا کا بیٹا جو ہوا۔ تجھے چھیڑنے کا مجھے حق ہے۔" رحمو ہنس دیا۔ بکری پر ایک نگاہ ڈال کر کہنے لگا۔

"سمانی کے قصاب نے دیا ہے۔ ہمارے پیر نے اس کی بیٹی کو جب تعویذ دی تو اسے اولاد ہوئی۔ وہ ممنون ہے۔" رحمو ذرا دیر کے لیے چپ ہوا اور چمکتی ہوئی نگاہوں سے تکتے ہوئے نیچی آواز میں حسن داد سے اس نے کہا۔

"قصائی نے کہا ہے کہ میں اس کی گھوڑی کو اپنے شاندار گھوڑے سے جفت کراؤں۔"

"تیرا مقدر اچھا ہے۔ ایسا گھوڑا ملا کہ فجر ہونے سے پہلے تجھے پیٹھ پر بٹھا کر تیر کی طرح نکلتا ہے اور شام سے پہلے جہلم جا پہنچتا ہے۔ اچھے پیسے ملیں گے تجھے۔" حسن داد کچھ رشک سے بولا۔

"یہ سب ہمارے پیر کی دعائیں ہیں۔ ورنہ فقیروں کو کون پوچھتا تھا۔ اللہ اس کی شادی کو برکت دے۔"

"لیکن...... لیکن رحمو! اس مبارک دن میں لنگڑی بکری کو ذبح کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ کے سامنے سب برابر ہیں۔ کیا میری اور تیری دعا قبول نہیں ہوتی؟ اور یہ مجذوب مگن شاہ۔ کیا بزرگ نہیں ہے؟" رحمو مگن شاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ جو آہستہ آہستہ اپنا سر مستی میں ہلا رہا تھا، اور جس کی نگاہیں بار بار شاداں پر جا رہی تھیں۔

"مگن شاہ بزرگ نہیں ہے۔ وہ ہم جیسے سادہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہے جو کچھ سمجھتا ہے اور کچھ نہیں۔" حسن داد کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔ اسے اپنی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ خدا کے راز کو کون سمجھ سکتا ہے۔ شاید مگن شاہ بزرگ ہی ہو۔ یہ خیال بھی اسے کبھی کبھی آیا تھا۔

رحمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد وہ حجرے کے اندر چلا گیا۔ جہاں سے کچھ دیر بعد واجد ایک تیز چھری لیے ہوئے رحمو کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر آیا۔ سبھی سمجھ گئے کہ کیا ہونے والا ہے۔ عورتوں نے گانا بند کر دیا اور اپنے سروں پر آنچلوں کو کھینچ لیا۔ حسن داد نے بکری کی گردن سے ڈور کھولی اور اسے زمین پر پٹخ کر اپنے ٹخنوں سے دبایا اور

اس کے جبڑے اور پیروں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ بکری زور سے منمنائی اور خود کو آزاد کرنے کی ناکام جد و جہد کرنے لگی۔ واجد جھکا، اس نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا اور بکری کی گردن پر چھری چلانے لگا، ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سی سختی آ گئی اور اس کے دانت بھنچ گئے۔ گرم خون کا تیز دھارا غل غل کرتا بکری کی گردن سے نکلا اور واجد کے ہاتھ کو سرخ کر کے زمین پر بہہ نکلا۔ شاداں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں اور مگن شاہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ جب نصف گردن کٹ گئی تو چھری کو پھینک کر واجد نے ہاتھ دھویا اور واپس حجرے کے اندر چلا گیا۔ بکری کی ٹانگیں کچھ دیر کے لیے تڑپیں پھر وہ ساکت ہو گئیں۔ عورتوں نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔ جیسے کوئی المیہ ہو گیا تھا جسے وہ گانے کے شور اور ترنم میں گم کر دینا چاہتی تھیں۔ بچے ہنستے اور شور مچاتے ایک بار پھر ادھر ادھر بھاگنے لگے اور رحمو بکری کی کھال کو اس کے مردہ جسم سے الگ کرنے لگا۔

''کسی نے چاول کی بوری کو اب تک کیوں نہیں کھولا ہے؟ ترشے ہوئے پیاز اور گھی کدھر ہے؟ کرنل صاحب اور رجمنٹ کے امام جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔'' گاؤں کا مکھیا حسن داد جھنجلایا ہوا بولا۔ اسے گمان ہو رہا تھا کہ وہ چپکے سے گوشت کا ٹکڑا نہیں لے جا سکے گا چونکہ رحمو چوکنا ہو کر اپنا کام انجام دے رہا تھا۔ وہ گوشت کاٹ کر احتیاط سے اپنے پاس رکھ رہا تھا۔ کسی کو پاس پھٹکنے کی ہمت نہیں تھی۔

واجد نے اپنے حجرہ کے دروازے کو نیم وا رکھ چھوڑا تھا۔ حسن داد نے جو کچھ کہا اس نے سن لیا تھا۔ یہ جان کر کہ کرنل صاحب شادی میں شریک ہوں گے اور رجمنٹ کا امام اس کا نکاح پڑھائے گا، اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس نے ارد گرد کوٹھری میں نگاہ دوڑائی۔ نگاہ دیوار میں بنے دو بڑے سوراخوں پر رک گئی۔ یہی وہ کھڑکیاں تھیں جن سے روشنی آتی تھی۔ دھوپ سے منور دن اور رات کو تاروں سے بھرا آسمان نظر آتا تھا۔ جہاں سے خدا کی خدائی نرم کرنیں بن کر اس پر برستی اور اسے خوش کر دیتی تھیں۔ اس مسرت میں اس کے پہلو میں بیٹھی اب شاداں بھی شریک ہوگی۔ وہ اسے شادی کی ذمہ داریوں کو سمجھائیگا اور نماز اور قرآن پڑھنے کی تربیت دیگا۔ اپنے نئے مشاغل کے تصور سے ایک عجیب سی وجدانی کیفیت اس پر چھا گئی۔ اس وجد میں وہ گرم احساس بھی شامل تھا جو شاداں سے جسمانی رشتے کا خیال اس کے دل میں لے آیا تھا۔ نوراں کے جانے سے پہلے میں اس کے جسم سے وہی خوشی کیوں نہ حاصل کر لوں جو

مجھے ماضی میں ملی تھی؟ گناہ کے اس تصور سے اس کا جسم تھرا گیا۔ نیم وا دروازے سے جو ہلکی سی دن کی روشنی آ رہی تھی اس میں اسے حجرے کی دیوار پر اللہ اور محمد لکھا نظر آیا۔ واجد نے ندامت سے اپنا سر ہلایا اور اپنی سوچ پر خود کو ملامت کیا۔ لکڑی کی وہ کنگھی جو دیوار پر جھکے تختے پر رکھی تھی اور جس میں اس کے ٹوٹے ہوئے بال الجھے تھے، اسے واجد نے اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ اپنی زلفوں کو کنگھی کرنے لگا۔ پھر نرمی سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر واجد نے اسے نوکیلی بنایا۔ مونچھ کے جو بال بالائی لب پر جھکے تھے انھیں اس نے انگلی سے اوپر کیا اور دبا دیا۔ اس نے وہ کپڑے پہنے جسے نوراں نے بڑی محنت سے دھو کر صاف کیا تھا۔ کپڑوں میں دھلنے کی وجہ سے نرمی اور تازگی تھی۔ واجد نے سر پر سبز پگڑی باندھی۔ اب وہ یقیناً بانکا دولھا لگ رہا ہے۔ واجد نے سوچا اور خود پسندی کے احساس سے مسکرا دیا۔ باہر سے چاول کو پیاز کے ساتھ گھی میں بھنے جانے کی خوشبو آئی۔ اللہ...... تیرا شکر ہے۔ ہر حال میں تیرا شکر ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور وہ آہستہ سے کھلا۔ واجد کو وہاں کرنل حنیف وردی میں ملبوس، مکھیا حسن داد اور رجمنٹ کے امام کھڑے نظر آئے۔ امام رجمنٹ میں ایجوکیشن افسر تھا۔ اس لیے وہ بھی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سبھوں نے سلام علیکم کہا۔

''پیر صاحب...... آج کا دن مبارک ہے۔ باہر تشریف لائیے۔''

واجد آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر وقار تھا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ کھوئی ہوئی نگاہیں کچھ تلاش میں تھیں۔ کوئی ایسی ماورائی طاقت جو اس کے سامنے آ جائے اور کہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اس عمر میں بھی شادی کرنا درست ہے۔ اس مجمع میں جو لوگ ہیں وہ تم پر ہنس نہیں رہے ہیں۔ جائز کام پر خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ اپنے تخم سے انسان پیدا کرنا تمہارا بھی فرض ہے۔ وہ اس چارپائی پر بیٹھ گیا جو خانقاہ کے آنگن میں رکھی گئی تھی اور جس پر دری اور ایک بوسیدہ لیکن صاف اور منقش چادر بچھا دی گئی تھی۔ اس کے پاس کرنل حنیف اور رجمنٹ کے امام بھی بیٹھ گئے۔ واجد کی نگاہیں برآمدے میں بیٹھی عورتوں پر پھسلی۔ شاداں سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ سرخ دوپٹہ سے چھپا تھا اور نوراں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ دور افق میں سورج پہاڑوں کے پیچھے جا چکا تھا اور اس کی چوٹی پر سارے درخت افق کی سرخی میں ڈوب کر سرخ ہو چکے تھے۔

کرنل حنیف سرگوشیوں میں رجمنٹ کے امام کے کان میں کچھ بولے۔ امام نے سنجیدگی

سے سر ہلایا۔ اس نے واجد سے کہا۔

''شاہوں کے پیر۔ جلد شام کی تاریکی چھا جائے گی۔ مناسب ہوگا اگر نکاح پڑھا دیا جائے۔''

''بہتر۔'' واجد نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ رجمنٹ کے امام نے اپنی ٹوپی کو ذرا ترچھا کیا۔ جو بچے بھاگ دوڑ رہے تھے انھیں ڈانٹ کر چپ کیا اور علی اور رحمو کو بہ طور گواہ لے کر شاداں کے پاس تیز چلتا ہوا گیا۔ شاداں کے گرد بیٹھی عورتیں سمٹ گئیں۔ رجمنٹ کا امام محترم آواز میں شاداں سے بولا کہ اس کا نکاح پیر سید واجد شاہ سے ان دو گواہوں کی موجودگی میں پڑھایا جا رہا ہے، کیا اسے قبول ہے؟ شاداں نے نیچی آواز میں ہاں کہہ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ امام نے تین بار اپنی بات کو دہرایا اور تینوں بار شاداں نے وہی کیا۔ اسے کیوں عذر ہوتا۔ وہ جس منجدھار میں بہہ رہی تھی اس میں اس کی ہاں اور نہ کی اہمیت ہی کیا تھی۔ اس کے علاوہ دنیا میں اسی طرح ہوتا آیا تھا اور اب وہی ہو رہا تھا۔ شاداں کی ہاں سننے کے بعد رجمنٹ کا امام واجد کے پاس وقار سے چلتا ہوا آیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور متبرک آواز میں قرآن کی آیت پڑھی اور واجد سے سوال کیا کہ شاداں اسے بطور بیوی قبول ہے۔ واجد نے امام سے بغیر آنکھیں ملائے ہاں کہہ دیا۔ اس عمل کو تین بار اس کے سامنے بھی دہرایا گیا اور تینوں بار واجد نے وہی جواب دیا۔ سبھوں کی نگاہیں واجد پر تھیں خاص کر عورتیں دزدیدہ نگاہوں سے اس خوبرو پیر کو دیکھ رہی تھیں جو بہت سنجیدہ تھا اور جس کی نگاہیں زمین پر گڑی تھیں۔ مگن شاہ اس ساری کاروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ دلھن جو اپنے سرخ جوڑے میں بڑی حسین لگ رہی تھی اور اس کا آقا جو سر جھکائے خاموشی سے احکامات سنتا رہا تھا اور پھر اتنے سارے لوگوں کا جمع ہونا۔ مگن شاہ مسکراتا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ خانقاہ میں آئے ہوئے مریدوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ نعرے سے فضا تھرا گئی۔ درختوں پر بیٹھی چڑیائیں اڑ گئیں۔ دوڑتے بھاگتے لڑکے بھی سہم کر رک گئے۔ پھر سبھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر پیر واجد اور اس کی دلھن کی مسرتوں کے لیے دعائیں مانگیں۔

مارے خوشی کے نوراں کے چہرے پر آنسو بہہ آئے تھے۔ اسے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خوشی کے لمحات نے ماضی کی اذیتوں کو اس وقت گم کر دیا تھا۔ وہ اپنے داماد کو دل ہی دل میں دعائیں دے رہی تھی جس نے اس کی آبرو رکھ لی تھی۔ اس نے شاداں کے ماتھے کو چوما اور اسے سینے سے لگا لیا۔ اسے نوراں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ احتیاط سے کام لے گی اور

خاوند کی خدمت گزار ہوگی تو اس پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

مرید باری باری آئے اور جھک کر واجد کو سلام کیا اور مبارکباد دی۔

"شادی مبارک ہو۔"

"تمہاری بیوی کو ہمیشہ خوشی ملے۔"

"تمہاری نسل کا ہر مرد بزرگ ہو۔"

واجد خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی نگاہیں زمین کی جانب جھکی رہیں۔ ماضی میں جو کچھ اس نے کیا تھا اسے خدا معاف کر چکا تھا اور اب وہ جو کر رہا تھا اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ کرنل حنیف بھی خوش تھے۔ اس شام وہ اپنی اس کمپنی کے معائنے کے لیے جا رہے تھے جو پہاڑی کے دوسری جانب تھی۔ راستہ خانقاہ کے پاس سے بھی جاتا تھا اس لیے وہ شادی میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنے ساتھ قوالوں کی اس ٹولی کو بھی لے آئے تھے جسے ان کی رجمنٹ کی تفریح کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جو عقیدت انھیں پیر واجد سے تھی اس کی بنا پر وہ اس کی شادی کو ہر طرح سے لطف انگیز بنانا چاہتے تھے۔

"پیر صاحب دلی مبارکباد۔ دیر آئد درست آئد۔" یہ کہتے ہوئے کرنل حنیف نے گرم جوشی سے واجد کے ساتھ مصافحہ کیا۔

رجمنٹ کے امام نے بھی اپنے کرنل کی طرح مسرت کا اظہار کیا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ تاریکی کی دھول ہر سو اڑ رہی تھی۔ نماز کے لیے چٹائیاں بچھا دی گئیں۔ رجمنٹ کا امام چونکہ واجد کا مہمان تھا اس لیے واجد نے اسے امامت کے لیے کہا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور کرنل حنیف سے درخواست کی کہ وہ اس فرض کو انجام دیں۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ مرید بھی تیمم کر کے صف میں شامل ہو گئے اور عورتیں خانقاہ کی کوٹھری میں نماز کے لیے چلی گئیں۔ نگن شاہ کی نگاہیں بجی سجائی شاداں پر جمی تھیں۔ وہ اس کی موجودگی سے بھی بے خبر تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ سارے واقعات عجیب و غریب تھے۔ نماز کے بعد سبھوں کی دعوت ہوئی۔ گاؤں کے سادہ لوگ جنھیں دو وقت کی روٹیاں بھی بہ مشکل نصیب ہوتی تھیں ان کے لیے پلاؤ اور قورمہ نعمت تھی۔ سبھوں نے دل کھول کر کھایا۔ لیکن کرنل حنیف نے دو تین لقمے کھا کر ہاتھ روک لیا۔

"بس...... خانقاہ میں پیٹ کی دوزخ بجھانے میں نہیں آتا ہوں۔ یہاں تو پیر صاحب

کے ذریعے اللہ کی رحمت مل جاتی ہے۔ اسی خیال سے میں یہاں آجاتا ہوں۔" کرنل حنیف نے بڑی سنجیدگی سے آسمان کی جانب تکتے ہوئے کہا۔

"بالکل درست کرنل صاحب۔" رجمنٹ کا امام شوربے سے شرابور انگلیوں کو چاٹتے ہوئے خوشامد سے بولا۔

واجد کے چہرے پر ایک دھیمی مسکراہٹ آگئی۔ کرنل حنیف واجد کے ہاتھ کو پکڑ کر بولا۔

"چپ شاہ۔ اس ویران جگہ میں آپ کی موجودگی ایک معجزہ ہے۔ یہ آپ کی برکتیں ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کو اس وقت پلاؤ اور قورمہ کھانے کو ملا ہے۔" جذبات کی شدت سے کرنل حنیف کا گلا رندھ گیا تھا۔

"کرنل صاحب۔ آپ کی شخصیت بھی بڑی اہم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ دونوں ایک ہیں۔ پیر صاحب کی کھوج ہوگی تو آپ مل جائیں گے اور آپ کی تلاش ہوگی تو پیر صاحب نظر آئیں گے۔" بٹالین کا امام جوش سے بولا۔

"بیشک۔ بیشک۔" وہ تین سپاہی جو کرنل حنیف کے ساتھ آئے تھے ایک زبان ہوکر بولے۔

کرنل حنیف کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ لوگ ان کی اہمیت کو سمجھ گئے تھے۔ فوجی افسروں کی بڑائی کا لوگوں کو یقین تھا۔ ورنہ ایسی بات سننے میں کیوں آتی۔

"ارے قوال کدھر ہیں۔ ان سے کہو گانا شروع کریں۔" کرنل حنیف نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

قوال ہارمونیم اور ڈھولک کے ساتھ سامنے آکر اس دری پر بیٹھ گئے جو ان کے لیے بچھائی گئی تھی۔ ہارمونیم پر سے مخملی غلاف اتارا گیا اور ڈھولک کی رسیوں کو ایک نے کسا۔ چند افراد موٹی موٹی خشک شاخیں لے آئے اور انھیں جلا کر آگ بڑھکا دی گئی۔ شعلے لپکتے ہوئے اٹھے جیسے تاریکی سے ہم آغوش ہونا چاہتے ہوں۔ تاریکی لرزتی ہوئی دور ہوگئی۔ اردگرد جو بھی تھے ان کے چہروں پر اندھیرے اور اجالے کا رقص ہونے لگا۔ عورتیں مشتاقانہ قوالوں کو تکنے لگیں۔ ایسی رونق ان کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ شاداں جو اب تک سر جھکائے بیٹھی تھی وہ بھی اس آگ کو تکنے لگی جس میں خشک لکڑیاں سسک رہی تھیں۔ لیکن اس آگ کے شعلوں کو دیکھ کر مگن شاہ جو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا وہ ڈراؤنی چیخ مارتا ہوا وہاں سے بھاگا اور دُور جا کر ہی اس نے دم لیا۔ کرنل حنیف کو بڑی حیرت ہوئی۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کرنل صاحب۔ ملن شاہ کو آگ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اللہ کا بھید اللہ ہی جانے۔ ہم سب کو شبہ ہے کہ یہ بھی ایک پیر و مرشد ہے اور ہم سب کو ہمارے گناہوں کی وجہ سے دوزخ کی آگ میں جلتا دیکھتا ہے۔" مکھیا حسن داد اپنے نیم گنجے سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے موٹے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی اور اپنی سمجھ کے اظہار سے طمانیت بھی تھی۔

"غضب خدا کا۔ کیسے احمق اور جاہل لوگ دنیا میں ہیں۔ یہ خبطی چھوکرا پیر و مرشد کے مقام کو پہنچا دیا گیا۔ اگر ہمارے چپ شاہ یہاں نہیں ہوتے تو یہ سارے وحشیوں کی طرح اعضائے تناسل کی پرستش کرتے ہوتے۔" کرنل حنیف کو غصہ آ گیا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونے کے باوجود انھیں بھی ان گناہگاروں میں شامل کر لیا جائے گا جو جہنم کی آگ میں جلیں گے، ایسی بات تھی جسے برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ غصے سے ان کے بھینچے ہوئے لب اور ابروؤں کو دیکھ کر حسن داد ڈر کر سمٹ گیا اور ندامت کی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی۔

"بالکل درست کرنل صاحب۔ میں نے پاکستان بننے سے پہلے نیپال کی پہاڑیوں پر رہنے والے ایک سادھو کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ اپنے اعضائے تناسل سے ایک بڑے سے پتھر کو باندھے کھڑا تھا اور عقیدتمند اس کے پاس احترام سے کھڑے تھے۔" رجمنٹ کے امام نے بڑی سنجیدگی سے کرنل حنیف کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"سالے اس پتھر پر اپنا سر مارنے گئے ہوں گے۔ اسی لیے تو ہم نے پاکستان بنا لیا ورنہ یہ اُلو کے پٹھے بھی اس پتھر کو آج بوسہ دیتے ہوتے۔ بھلا بتائیے صوبیدار صاحب۔ کیا پیر و مرشد بننا آسان ہے؟ دن رات خدا کی پرستش کرنی ہوتی ہے۔ نماز روزے اور تہجد کی پابندیاں الگ۔ پھر کرامات دکھانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں فضیلت ملتی ہے اور پیر و مرشد کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔" کرنل حنیف کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"کرنل صاحب آپ نے درست کہا۔ ارے بھائی تم لوگ چپ کیوں ہو؟ قوالی شروع کرو۔" رجمنٹ کے امام نے قوالوں کو حکم دیا۔

جوں ہی گانا شروع ہوا کرنل حنیف کا غصہ کم ہونے لگا اور اس میں اتنی کمی آ گئی کہ وہ آنکھیں بند کر کے قوالوں کی حمد و ثنا سننے لگے۔ جب ایک قوالی ختم ہوئی تو کرنل حنیف نے ایک لمبی سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔

''کیا کیف و جذب چھا جاتا ہے۔ ایک ایسا نشہ آ جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔''

''بالکل درست کرنل صاحب۔ ہمارا سچا مذہب ایسا نشہ دیتا ہے کہ نہ کوئی تکلیف اور نہ کوئی رنجش اور نہ ہی کسی دکھ درد کی پرواہ ہوتی ہے۔ بس سامنے خدا ہوتا ہے اور اس کے سامنے مجبور انسان۔''

''صوبیدار صاحب۔ آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ خیر مجھے کمپنی کے ہیڈ کوارٹر اب جانا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے کرنل حنیف اٹھے اور واجد سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے تینوں سپاہیوں اور رجمنٹ کے امام کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ان کے قدموں کی آواز آئی اور پھر گم ہو گئی۔

قوالوں نے پھر گانا شروع کر دیا۔ عشا کی نماز کے وقت قوالی رکی۔ اس کے بعد پھر شروع ہو گئی۔ قوال بڑے جوش و خروش سے گا رہے تھے۔ خانقاہ میں گانا اور وہ بھی اتنی عورتوں کی موجودگی میں۔ ان کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ سارے قوال نوجوان تھے۔ ان کی آواز بلند سے بلند تر ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ چیختے محسوس ہوتے۔ خاص کر جب خدا اور رسول کا نام ان کی زبان پر آتا۔ ان کی گردن کی نسیں اُبھر آتی تھیں، اور ان کی آنکھوں کی سفیدی نمایاں ہو کر ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ جب کسی لفظ پر زور دیتے تو ساتھ ہی وہ اپنے سر کو جھٹکتے، اور ڈھولچی اتنے زور سے ڈھولک پر ہاتھ مارتا جیسے وہ اس کا بدترین دشمن ہو۔ قوالی دیر تک ہوتی رہی۔ وہ گاؤں والے جو دور سے آئے تھے وہ جا چکے تھے۔ اب صرف پنجنی کے رہنے والے رہ گئے تھے۔ جن کے لیے معرفت کے ایسے نغمے سننا ان کے پیر کی کرامتوں میں سے ایک تھا۔

رات خنک ہو گئی تھی۔ پہاڑی سے پرے کالا دیو پہاڑ ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ اس کی چوٹی کے اوپر آسمان میں چاند زرد پتے کی طرح ٹنگا تھا۔ خشک پتے خاموش درختوں سے آہستہ آہستہ جھڑ رہے تھے۔ قوالیاں ختم ہو چکی تھیں اور قوالوں نے تھک کر اپنے پیروں کو پھیلا دیا تھا۔ الاؤ کی آگ بھی بجھ چکی تھی۔ کبھی کبھی مرد اور عورتوں کے ہجوم سے کسی کے کھانسنے یا کسی کے کچھ بولنے کی آواز آ جاتی۔ اچانک دور سے گولیوں کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ آواز میں شدت تھی اور ایسا تسلسل جو باضابطہ جنگ کی ابتدا بھی ہو سکتا تھا۔ خانقاہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ قوال اپنے ساز کو چھوڑ کر پنجنی کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ واجد اس قسم کی واردات کا عادی تھا۔ خانقاہ

سے جنگ بندی کی لائن قریب تھی اور وہاں پر سے اکثر گولیوں کے چلنے کی آوازیں آتی تھیں۔ پھر بھی اسے فکر ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ گولہ باری بھی شروع ہو جاتی۔

''کوٹھری کے اندر جاؤ۔'' اس نے نوراں اور شاداں کو حکم دیا۔ ماں بیٹی برآمدے میں ایک دوسرے سے چمٹی مارے خوف کے گڑگڑا رہی تھیں۔

''مگن شاہ...... مگن شاہ۔'' واجد نے زور سے آواز دی اور اپنے ہجرے کی جانب دوڑا۔ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ جوتا پہننا بھول گیا۔ اس کا پیر بجھے ہوئے الاؤ پر پڑا۔ جہاں راکھ کے نیچے اب بھی آگ سلگ رہی تھی۔ درد بھری چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اپنے داہنے پیر کو پکڑ کر وہ زور زور سے کراہنے لگا۔ گولیوں کا چلنا اسی طرح اچانک بند ہو گیا جس طرح اچانک ان کی ابتدا ہوئی تھی۔ نوراں اور شاداں، واجد کا کراہنا سن کر کوٹھری سے باہر نکل آئیں۔ دونوں ابھی تک سہمی ہوئی تھیں۔ واجد کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے خوف میں اضافہ ہو گیا۔

''کیا ہوا شاہ جی؟'' نوراں نے قریب آکر واجد سے پوچھا۔

''میرا پیر جل گیا ہے۔ میرا ایک پیر پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا ہے۔ اللہ تو نے مجھے کیوں سزا دی ہے؟'' اس کی آواز میں اذیت تھی۔

''شاداں...... تو شاہ جی کا دوسرا بازو پکڑ۔'' نوراں، واجد کا ایک بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

''میں ایک پیر پر نہیں چل سکتا۔ مجھے اٹھا کر لے جانا ہوگا۔ اوہ خدایا...... خدایا...... مگن شاہ کو بلاؤ۔'' درد کی شدت سے بھنچے ہوئے دانتوں کے درمیان سے واجد کی آواز نکلی۔

''مگن شاہ...... مگن شاہ۔'' نوراں تاریکی میں اسے تلاش کرتی ہوئی پکاری۔ مگن شاہ اندھیرے میں کسی جانب سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگیا۔

''بیوقوف جانور...... اس طرح کیوں کھڑا ہے۔ اپنے مالک کو اٹھا کر ہجرے میں لے چل۔'' نوراں نے غصے سے حکم دیا۔

''اس پر غصہ مت کرو۔ وہ ناسمجھ ہے۔ اللہ مدد کر۔'' واجد کے منہ سے سسکیاں نکل گئیں۔ اس نے انگلیوں سے اپنے سینے کو ٹھوکا دیا اور پھر مگن شاہ کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔ مگن شاہ واجد کا عندیہ سمجھ گیا۔ اس نے واجد کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور اسے حجرے میں لا کر اس کے بستر پر لٹا دیا۔ نوراں لالٹین لے آئی اور اس کی روشنی میں واجد کے جلے ہوئے پیر کو دیکھ کر نوراں کے منہ

سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ واجد کا تلوہ کچے گوشت کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور اس پر پھپولے اٹھ آئے تھے۔ شاداں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

''ٹھنڈے پانی کو میرے پیر پر ڈالو۔ یہ دوزخ کی آگ کی طرح جل رہا ہے۔'' درد کی وجہ سے اپنے سر کو ہلاتا ہوا واجد بولا۔

شاداں پھرتی سے ایک بڑے سے برتن میں ٹھنڈا پانی لے آئی اور واجد نے اس میں اپنا پیر ڈال دیا۔ پانی کی خنکی سے اسے کچھ آرام ہوا۔ پیر کی جلن بدستور تھی لیکن ایک ٹھنڈی سی لہر وہاں اٹھنے لگی تھی۔ واجد نے اپنے پیر کو پانی میں آہستہ آہستہ ہلایا۔ ذرا سا آرام جو ملا اس کی وجہ سے اسے کچھ ہوش آیا۔

''ذرا آرام آ گیا ہے۔'' وہ سرگوشیوں میں بولا۔ ایک مدت سے نہ وہ بیمار ہوا تھا اور نہ ہی کسی حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اس لیے تکلیف کیسی ہوتی ہے وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن ایک مبارک دن میں ایسی اذیت کا اسے ہونا ایک عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والا واقعہ تھا۔ بے یقینی میں اس کا سر آہستہ سے ہلا۔

''شاہ جی...... میں تمہارے پیر پر پسی ہوئی مہندی لگا دیتی ہوں۔ اس کی ٹھنڈک سے تمہیں ضرور آرام ملے گا۔'' نوراں نے رائے دی۔

''جو بھی مناسب ہو کرو۔'' واجد نے التجا کی۔

نوراں وہ مہندی لے آئی جو شاداں کے ہاتھ اور پیروں پر لگانے کے بعد بچ رہی تھی۔ اسے وہ واجد کے پیر پر آہستہ آہستہ لگانے لگی۔ اس کی انگلیاں نرمی سے سرک رہی تھیں۔ ان پیروں کو کبھی اس نے چوما تھا۔ سینے سے لگایا تھا۔ ان کی گرمی اور سختی سے وہ واقف تھی۔ وہ دن اسے یاد آ گئے اور ایک ہوک اس کے دل میں اٹھی۔ لیکن اس نے ضبط کر لیا۔ اپنے خاوند کو اس حال میں دیکھ کر شاداں کی شرم و حیا غائب ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس کے سر پر سے دوپٹہ سرک کر اس کے شانے پر آ گیا ہے اور مگن شاہ بڑی محویت سے نوراں کی سبک انگلیوں کو اپنے آقا کے پیر پر سرکتے دیکھ رہا تھا۔

''خدایا مدد کر...... مجھے ہمت دے۔'' واجد زیر لب گڑگڑایا۔

''ہم اپنی بری قسمت لے کر آئے...... اور اس کا سایہ تم پر بھی پڑ گیا شاہ جی۔'' نوراں زیر لب غمگین آواز میں رک رک کر بولی۔

"کون جانتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ لیکن مجھے اکثر خیال آتا تھا کہ شاید میں تجھ سے کبھی ضرور ملوں گا۔" واجد نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

نوراں نے دزدیدہ نگاہوں سے پلٹ کر شاداں کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ اپنے خاوند کی حالت زار سے اتنی خوفزدہ اور فکر مند ہو گئی تھی کہ وہ واجد کے الفاظ کی اہمیت نہیں سمجھ پائی۔ واجد نے اسے تکا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ شاداں نے اپنے آنچل سے اپنے نصف چہرے کو چھپالیا۔

"دیکھ ٹبر...... اس شادی کی ساعت کیسی نامبارک ثابت ہوئی۔ اب تجھے اپنے شوہر کو ڈھو کر ادھر ادھر لے جانا پڑے گا۔" واجد کے لہجے میں ذرا تمسخر تھا۔

واجد کی بات سن کر ماں اور بیٹی کا جی ذرا ہلکا ہوا۔ ان کی ہمت بندھی۔

"شاہ جی گولیوں کے چلنے کی آواز بند ہو گئی ہے۔ کیا اب بھی جنگ کا خطرہ ہے؟" نوراں نے پوچھا۔

"نہیں...... ہندوستانی اور پاکستانی فوجوں کے درمیان اکثر ایسی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ کسی کی جان نہیں جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی زخمی بھی نہیں ہوتا۔" واجد نے اطمینان دلایا۔

"اللہ سب کا رکھوالا ہے۔" نوراں بولی اور مگن شاہ کو ہلکا سا دھکا دے کر باہر جانے کے لیے کہا، پھر خود بھی اس کے پیچھے حجرے کے دروازے کو بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

لالٹین کی پھیکی روشنی میں شاداں کچھ گھبرائی ہوئی کھڑی رہی۔ اس نے مارے شرم کے اپنے چہرے کو دوسری جانب کر لیا تھا۔ واجد کو اس کے لیے اپنے دل میں گداز سا محسوس ہوا اور اس خیال سے بھی مسرت ہوئی کہ کوئی فرد اب ایسا ہے جسے اپنا کہنے میں اسے جھجک نہیں ہو گی۔

"بیٹھ جا شاداں۔" واجد کی بھاری آواز گونجی۔

وہ جھجکتی ہوئی واجد کی پائتی میں چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"قریب آ۔"

شاداں اس کے پاس سرک گئی۔

"کیا تو نے پہلے کبھی میرے بارے میں کچھ سنا تھا؟" واجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا جو مارے خوف کے سرد ہو رہا تھا۔

شاداں نے اثبات میں سر ہلایا۔ واجد کے ہاتھ کے کھردرے پن پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔

''کیا سنا تھا تو نے؟''

''یاد نہیں۔'' شاداں دھیمے سے بولی۔ اس کا سر جھکا تھا اور اس کی پشت واجد کی جانب تھی۔

''یاد کر۔'' واجد نے مسکراتے ہوئے حکم دیا۔

''تم بڑے پیر ہو۔''

''کیا سچ مچ۔''

شاداں نے اپنے سر کو دوبارہ اثبات میں ہلایا اور سر کو ذرا سا موڑ کر اپنے خاوند کو دیکھنے کی کوشش کی۔ دوپٹہ اب تک اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے خاوند کو ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکی۔

''پیر کیا کرتے ہیں؟''

''اچھا کام کرتے ہیں۔''

''اور کیا کرتے ہیں؟'' شاداں کو چھیڑنے میں واجد کو مزہ آ رہا تھا۔ وہ سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اسے شاداں کے جسم کی گرمی محسوس ہوئی۔ واجد نے اس کے ہاتھ کو دبا کر اپنے سوال کو دہرایا۔

شاداں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ مارے خوف کے وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ اتنے سارے لوگ کیوں اس شخص کے پاس آتے ہیں جواب اس کا شوہر تھا۔ انھیں اس کے پاس سے کیا ملتا ہے۔ لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں اور اسی طرح چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کا بار بار آنا کیوں ہوتا ہے؟ شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ واجد کی آواز پھر اُبھری۔

''پیر کی دعائیں خدا سنتا ہے۔ جن کے لئے دعا مانگی جاتی ہے انھیں آرام مل جاتا ہے۔ خدا کی مہربانی ان پر ہونے لگتی ہے اور اس کے بعد وہ اچھے انسان بھی بن جاتے ہیں۔ تو نمازیں پڑھا کرے گی نا؟''

''ہاں۔'' شاداں نے دھیمے لہجے میں یقین کے ساتھ کہا۔

واجد کو یاد آیا کہ یہی نصیحت اس نے نوراں کو اس وقت دی تھی جب وہ اس کی محبوبہ تھی اور اس نے بھی اسی طرح جواب دیا تھا۔ نوراں کے تصور سے شاداں کے لئے اس کے گرم جذبات سرد ہونے لگے۔ ماضی کا گناہ اسے یاد آیا اور واجد کو بے چینی سی ہوئی۔ جسے مٹانے کے لیے اس نے شاداں کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ شاداں کو واجد کے دل کی دھڑکن طوفانی ہوا کے تھپیڑوں کی

طرح سینے سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ واجد کی گرم سانس اس کے چہرے کو جلانے لگی۔

"تیری ماں اچھی عورت ہے۔ تو بھی اسی کی طرح اچھی ہوگی۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو شاداں کو اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی۔ لیکن اس وقت جو ہونے جا رہا تھا اس کے خوف سے وہ لرز رہی تھی۔ خاوند کا مضبوط جسم اسے پیتا محسوس ہوا۔ واجد نے شاداں کی پیشانی چومی اور پھر اس کے خشک لبوں کو۔ جہاں اس وقت کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ گرمی جو دہکتے جذبات کو جذب کرنے کا احساس دیتی ہے، وہ وہاں نہیں تھی۔ شاداں نے اپنے خوابوں میں اکثر ان جوان مردوں کو دیکھا تھا جن کے چکنے چہرے اسے حاصل کرنے کی خواہش سے سرخ ہوتے تھے۔ جن کے لبوں پر پیار کے الفاظ پھول کی طرح کھلے ہوتے تھے۔ جو اس کے جسم کو نرمی سے ٹٹولتے تھے۔ لیکن اس وقت اپنے خاوند کے بازوؤں میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی داڑھی کے سخت بال اس کے چہرے کو چھیل رہے تھے اور اس کے سر کے لمبے بال اس طرح اس کے چہرے کے گرد لٹک آئے تھے کہ وہ کوئی بھیانک اور خونخوار فرد لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پستان، ران اور کولھے کو سختی سے مسل رہا تھا۔ مارے ڈر کے شاداں کا جسم جکڑ گیا۔ واجد نے اس کی شلوار کا ازار بند کھولا اور شلوار کو کھینچ کر اس کے جسم سے الگ کر کے شاداں کی ٹانگوں کو پھیلانے کی کوشش کرنے لگا۔

باہر سے ایک چیخ آئی۔ ایک ایسی چیخ جو مرد کے منہ سے عورت کے جسم سے لذت حاصل کرتے وقت کبھی کبھی نکلتی ہے۔ یہ آواز ملنگ شاہ کی تھی۔ واجد کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے سینے پر لات ماردی ہے۔ یقیناً ملنگ شاہ اور نوراں ہم بستری کر رہے ہیں۔ واجد نے سوچا اور ساتھ ہی حسد کے شعلے اس کی روح میں لپکے۔ اس کے بازو شاداں کے گرد ڈھیلے پڑ گئے۔ بیوی کے جسم کی کشش باقی نہیں رہی۔ کوئی اور ہی آگ اسے جلانے لگی۔ واجد چارپائی پر سے اترا اور لنگڑاتا ہوا حجرے کے دروازے کو تڑاخ سے کھولتا ہوا باہر نکلا۔ اندھیرے میں ملنگ شاہ اپنی چارپائی پر سکڑا نیند سے بے سدھ پڑا تھا۔ بکریوں کے بال سے بنا کمبل اس کے جسم سے سرک آیا تھا۔ ملنگ شاہ کراہا اور پھر اس نے کروٹ لی۔ اس سے کچھ فاصلے پر نوراں اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آیا، اس نے مڑ کر واجد کو دیکھا اور تمسخرانہ بولی۔

"وہ نیند میں کچھ دیکھ رہا ہے شاہ جی۔" ساتھ ہی وہ ہنسی۔

واجد کا بدبودار حسد ننگا ہو کر سامنے آگیا تھا۔ مارے شرم کے اس کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہہ

آیا۔ اسے بلا کی کمزوری محسوس ہوئی اور وہ پیر جو جلا تھا اور جسے واجد گھسیٹتا ہوا آیا تھا، اس میں شدید جلن محسوس ہوئی۔ وہ لنگڑاتا ہوا واپس حجرے کے اندر آیا...... اور قبل اس کے کہ شاداں اس سے کسی کے چیخنے کی وجہ پوچھتی واجد نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے جسم سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے اندر کا مرد ٹھٹھر گیا تھا۔ نوراں کی تمسخر بھری آواز اور اس کی ہنسی واجد کی پاکدامنی کو چاک کر چکی تھی۔ وہ اب بھی ایک ادنیٰ انسان تھا۔ بدکاری اب بھی اس کی فطرت میں تھی۔ ان خیالات سے اس کے اندر کا مرد ٹھٹھر گیا تھا۔ وہاں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ اس نے شاداں کو چوما اس کے جسم کے مختلف حصوں کو مسلا، لیکن سب کچھ بے سود رہا۔

''اس کو ہاتھ میں لے۔ سہلا اسے۔'' شاداں کے ہاتھ کو زیر ناف لے جاتے ہوئے وہ بے بسی سے بولا۔

تنفر کے احساس سے شاداں نے دانت بھینچ لیے۔ جو اسے حکم ملا وہ اس نے کیا۔ جہاں پسینے سے پسیجتا اس کا ہاتھ گیا وہ گیلے آٹے کی لوئی تھا۔

''دور ہٹ...... تجھ میں وہ خوبی ہی نہیں ہے...... اُف میرا پیر...... کیسی جلن ہو رہی ہے۔ میرا خدا غصے میں ہے۔'' واجد نے بڑبڑاتے ہوئے شاداں کو دھکا دے کر خود سے جدا کر دیا۔

دوسرے دن واجد شدید بخار کی حالت میں تھا۔ وہ ساری آئتیں جو اسے یاد تھیں ان کا اس نے ورد کیا، لیکن نہ اس کا بخار کم ہوا اور نہ ہی پیر کے درد اور جلن میں کمی ہوئی۔ دونوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ نوراں بار بار حجرے کے اندر واجد کو دلاسہ دینے کے لیے آئی۔ شاداں نے واجد کو ہاتھ منہ دھونے میں مدد کی، اس کے لیے ناشتہ بنا کر لائی۔ ہر لمحہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے خاوند کو جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار وہ ہے۔ اس کے بعد جو دن آیا وہ واجد کے لیے شدید مصیبت کا دن تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس پر بہت بڑی افتاد گری ہے۔ ایک آگ اس کے سارے جسم کو جلا رہی تھی اور گھٹنے سے نیچے اس کی ٹانگ سوجی ہوئی تھی اور اس کے سرخ تلوے پر پھپھولے اُبھرے ہوئے تھے اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں کی جلد پھٹ جائے گی۔ اب بٹالین کا ڈاکٹر ہی اس کا علاج کر سکتا تھا۔ اس نے گاؤں کے مکھیا حسن داد کو بلا بھیجا۔ وہ جب آیا تو اس نے دیکھا کہ واجد کی آنکھیں بند تھیں، اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور وہ زور زور سے کراہ رہا تھا۔ واجد کو اس حال میں دیکھ کر مکھیا حسن داد بری طرح گھبرا گیا۔

''یا خدا...... ہمارے بادشاہ کو کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ پیر

واجد بھی عام انسانوں کی طرح کسی مرض سے محتاج اور بے بس ہو سکتا ہے۔

کراہتے ہوئے واجد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ کچھ دیر واجد خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''دہائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کا جو حکم تھا وہ ہو گیا۔ رجمنٹ کے ڈاکٹر صاحب کے پاس میں چل کر اور نہ ہی گھوڑے پر چڑھ کر جا سکتا ہوں۔ علاج کے لئے ان کے پاس جانا ضروری ہے۔''

''ہم اپنے بادشاہ کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لے جائیں اس سے بڑی خوش قسمتی ہماری اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں ابھی رحمو اور دوسرے لوگوں کو بلا کر لاتا ہوں۔'' یہ بولتا ہوا حسن داد حجرے سے باہر جانے کے لئے مڑا۔ نوراں نے اسے اشارے سے روکا اور بولی۔

''ہم دونوں بھی شاہ جی کے ساتھ جائیں گے۔'' لیکن واجد نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ حسن داد وجہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے نیم گنجے سر کو سہلاتا ہوا بولا۔

''راستہ کٹھن ہے۔ کون جانے وہاں کتنی دیر ہو جائے۔ اندھیرا ہونے کے بعد اپنی فوج کے گشتی نکل پڑتے ہیں اور کبھی کبھی دشمن کے سپاہی بھی چوری چھپے ادھر آ نکلتے ہیں۔ اپنی زندگی سے کھیلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''لیکن؟'' خانقاہ میں شاداں کے ساتھ تنہا رہ جانے سے نوراں ڈر رہی تھی۔

''فکر مت کرو۔ خانقاہ میں آنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی ہے۔ گاؤں سے کوئی عورت رات بیلا یہاں سونے کے لیے آ جائے گی۔''

نوراں چپ ہو گئی۔ اس کی پریشانی دور نہیں ہوئی تھی۔ قسمت ایک بار پھر دھوکا دے جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''میں ابھی چارپائی لے کر آتا ہوں۔ ہم اپنے بادشاہ کو سیدھے رجمنٹ کے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر دم لیں گے۔'' حسن داد بولا اور چلا گیا۔ جلد ہی وہ رحمو اور گاؤں کے چند اور افراد کے ساتھ آ گیا۔ جس چارپائی کو وہ لے کر آئے تھے اس پر ایک دری بچھی تھی۔ لیکن چارپائی پر تن و توش کے مالک واجد کو اٹھا کر کھڑی ڈھلان پر نیچے اترنا آسان نہیں تھا۔ کچھ دیر تک سبھی پیچ و تاب میں مبتلا رہے۔ رحمو کی نگاہ مگن شاہ پر گئی جو اداس محویت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ رحمو نے اشارے سے مگن شاہ کو بتایا کہ وہ واجد کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر نیچے چلے۔ مگن شاہ

نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ وہ جھکا اور گاؤں کے لوگوں نے واجد کو مگن شاہ کی پیٹھ پر چڑھنے میں مدد کی۔ جوں ہی مگن شاہ اپنے بوجھ کو اٹھا کر سیدھا ہوا اس کے منہ سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔ گاؤں کے اور لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ خمدار پگڈنڈی جو چٹانوں کے درمیان ڈھلان پر نیچے جاتی تھی۔ اس پر بڑی احتیاط سے مگن شاہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ گو اسے ڈھلان سے خوف آتا تھا لیکن اپنی پشت پر آقا کے بوجھ سے اس کا ڈر کم ہو گیا تھا۔ واجد نے مضبوطی سے مگن شاہ کو پکڑا ہوا تھا۔ جب کبھی اس کا زخمی پیر کسی چٹان سے ٹکراتا تو اس کی چیخ نکل جاتی۔ اس کی داڑھی کے سخت بال مگن شاہ کی گردن کو گدگدا رہے تھے۔ مگن شاہ مسکرایا پھر ہنسی اس کے منہ سے پھوٹ پڑی۔ واجد کو غصہ آ گیا۔ اس نے مگن شاہ کے سر کے بال کو زور سے کھینچا۔

''ذلیل کتے تو میری اذیت پر ہنس رہا ہے۔''

''کتے...... کتے...... آہ...... آہ......'' مگن شاہ درد سے کراہا اور رک گیا۔

واجد نے اس کے سر کے بال کو پکڑ کر ایک دو بار جھٹکا دیا۔ جن لوگوں کو چارپائی پر واجد کو اٹھا کر لے جانا تھا وہ نیچے اتر چکے تھے۔ مگن شاہ کو اس کی معصوم خطا پر جو سزا مل رہی تھی اسے وہ لوگ نہیں دیکھ سکے۔ مگن شاہ نے دوبارہ نیچے اترنا شروع کیا۔ واجد کی داڑھی اس کی گردن کو پھر گدگدانے لگی۔ مگن شاہ نے پھر قہقہہ لگایا۔ واجد گھونسے اور تھپڑوں سے اسے مارنے لگا۔ مگن شاہ رو پڑا۔ لیکن مسلسل گدگدی کی وجہ سے اس کی ہنسی کم نہیں ہوئی۔ جب وہ اپنے بوجھ کے ساتھ نیچے پہنچا تو گاؤں والے اس کے چہرے پر آنسو اور ساتھ ہی مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی حیرانی اس لیے بھی کچھ زیادہ تھی چونکہ ان کا پیر درد کی شدت سے زور زور سے کراہ رہا تھا۔ جب واجد کو چارپائی پر لٹایا گیا تو اس کے جلے ہوئے پیر پر زرد اور کالے پھپولوں کو دیکھ کر مگن شاہ بہت سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے جھک کر واجد کے زخمی پیر کو چھوا۔

''روکو اسے۔'' واجد چیخا۔ مگن شاہ نے اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا۔

''ہمارے پیر کا اچھا حال نہیں ہے۔ مگن شاہ اپنی کرامات سے پیر کا درد کم کرنا چاہتا تھا۔'' رحمو اپنی خوابیدہ سی آنکھوں کی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے بولا۔

''جلدی کرو۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہمیں لوٹ آنا ہے۔ ہم نادان لوگ ہیں۔ مگن شاہ ہنس رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ ہی سب جانتا ہے۔'' مکھیا حسن داد نے سہمے

ہوئے لہجے میں رائے زنی کی۔

گاؤں سے آئے ہوئے چار آدمیوں نے چارپائی اٹھالی اور بٹالین ہیڈکوارٹر کی جانب روانہ ہو گئے۔

نوراں اور شاداں جو اوپر پہاڑی پر کھڑی تھیں وہ زور زور سے بین کرنے لگیں۔ ان کا سہارا جا رہا تھا۔ وہ کب واپس آئے گا انھیں خبر نہیں تھی۔

بخار کی وجہ سے واجد کی جو حالت ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ڈراؤنے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اسے موت سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی بہت قیمتی تھی جو آرام اسے میسر تھا وہ اسے بہت عزیز تھا۔ اطراف کے لوگوں سے جو احترام اور عقیدت اسے ملتی تھی اور فوجی جس طرح اس کی قدر کرتے تھے ان سے اسے انتہائی آسودگی اور مسرت ملتی تھی۔ وہ ایک بادشاہ تھا جس کی مملکت کی سرحدیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بخار کی شدت اس کے ذہن کو ماؤف کیے دے رہی تھی۔ کبھی اس پر بیہوشی سی طاری ہو جاتی اور کبھی وہ ہوش میں آ جاتا۔ دھوپ کی گرمی اور چارپائی کے ہلنے کی وجہ سے اسے مسلسل اذیت ہو رہی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس کی زبان جلی ہوئی لکڑی کی طرح خشک ہو رہی تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' واجد نے آنکھوں کے گرد چھائے دھند سے جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ اسی سڑک پر تھا جسے مدت ہوئی اس نے مجاہدوں کے ساتھ مل کر تعمیر کیا تھا۔ اسے ٹوٹی پھوٹی ایک کوٹھری نظر آئی جس کے پاس سے سڑک مڑتی ہوئی تندر گاؤں کی جانب جاتی تھی۔

''وہ پل اب پاس ہی ہوگا۔'' واجد کی دھیمی آواز آئی۔ وہ پھر بولا۔ ''میں پیاس سے مر رہا ہوں۔'' جنھوں نے چارپائی اٹھائی ہوئی تھی انھوں نے اس کی آواز سن لی۔ وہ اس نالے کے پاس پہنچ چکے تھے جس میں شفاف پانی تیزی سے بہہ رہا تھا اور نالے پر وہی پل تھا جس پر کچھ دن پہلے واجد اور مگن شاہ رکے تھے۔ چارپائی سمیت گاؤں والے نیچے اتر گئے اور جب اسے نیچے رکھا تو پانی کو دیکھ کر واجد تڑپ اٹھا۔

''پانی۔ پانی۔'' وہ بیتابانہ چیخا۔ اس کا بس چلتا تو وہ نالے میں کود کر پانی میں منہ ڈال دیتا۔ لیکن مارے نقاہت کے ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

جو لوگ اسے ڈھو کر لائے تھے وہ احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسا برتن نہیں تھا جس میں پانی ڈال کر وہ واجد کو پلاتے۔ مگن شاہ اچانک

نالے میں کودا اور اس نے وہی کرنا شروع کیا جو اپنی پیاس بجھانے کے لیے وہ جنگل میں کیا کرتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیالہ سا بنایا اور اس میں پانی بھر کر واجد کے جلتے منہ میں ڈالنے لگا۔ گاؤں والے جو پاس کھڑے تھے انھوں نے بھی وہی کرنا شروع کیا۔ جلد ہی واجد کی پیاس بجھ گئی۔ تیز جلتے ہوئے جسم کو ذرا سکون سا ملا۔ اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسے چیڑھ کے درختوں سے آتی ان کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے درختوں کی شاخیں دھند میں غائب ہوتی محسوس ہوئیں۔ بخار اس کے ہوش وحواس کو پھر معطل کرنے لگا تھا۔ دور پہاڑوں سے کسی کے پکارنے کی آواز آئی۔ کیا یہ کسی سپاہی کی آواز ہے جو اپنے ساتھی کو خبردار کر رہا ہے؟ واجد نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ دھند میں جو کچھ اسے نظر آیا اسے شناخت کرنے کی اس نے کوشش کی۔ یہ لوگ کون ہیں جو مجھے گھیرے ہوئے ہیں؟ اور یہ موٹا شخص جس کی ٹھڈی پر ننھی سی داڑھی ہے اور جس کے منہ سے لعاب ٹپک رہا ہے۔ کیا فوج کا کرنل ہے؟ سلام علیکم کرنل صاحب۔ واجد نے مگن شاہ کو سلام کیا...... یہ گنگناہٹ کیسی ہے؟ کیا یہ نالے میں بہتے پانی کی صدا ہے...... یا نوراں گنگنا رہی ہے......؟ اس کا چہرہ کتنا خوبصورت ہے؟...... نہیں یہ شاداں ہے۔ میری جوان...... پکی ہوئی...... رسدار بیوی۔ واجد ہذیان بک رہا تھا۔ گاؤں والے ابھی تک نالے میں کھڑے تھے۔ رحمو نے اپنی نیم خوابیدہ پلکیں جھپکائیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ویرو...... ہمارے چپ شاہ مرنے والے ہیں۔ اگر یہ مر گئے تو ہم انھیں یہیں نالے کے کنارے گاڑ دیں گے۔ یہ جگہ اچھی اور ہوادار ہے۔ پھر مگن شاہ ہمارا پیر ہوگا۔"

مکھیا حسن داد نے اپنا موٹا سر زور سے نفی میں ہلایا اور سبھوں کو مخاطب کرکے رائے زنی کی۔

"ہرگز نہیں۔ مگن شاہ کو مکمل پیر بننے میں ابھی دیری ہے۔ مانتا ہوں کہ ابھی ہمارے چپ شاہ کو جب وہ پیٹھ پر اٹھا کر لایا تھا تو اس کا دل میلا تھا اور ہنسی بھی اس کے منہ پر تھی اور وہ جنگلوں میں معرفت ڈھونڈنے میں دن ڈھلے تک پھرتا رہتا ہے۔ لیکن وہ چمار کی اولاد ہے۔ وہ ہمارا پیر نہیں بن سکتا۔" اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ واجد کے پاس جا کر اس کے ہاتھ کو پکڑ کر منتیں کرنے لگا۔

"پیروں کے پیر۔ ہوش میں آجاؤ۔ ہمیں یتیم مت چھوڑو۔ رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر دور نہیں ہے۔ ہم وہاں جلد پہنچ جائیں گے۔"

۱۳

تندر گاؤں کے پاس جو وادی تھی اسی میں بٹالین ہیڈ کوآرٹر کے مٹی اور پتھروں سے بنے خاکستری بنکر تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر کے معائنے کا بنکر بھی تھا۔ ازراہِ ہمدردی ڈاکٹر سپاہی مریضوں کے علاوہ آس پاس کے گاؤں والوں کے معمولی امراض کا علاج کر دیا کرتا تھا۔ اس دن اسے اپنے کام سے فرصت پانے کے بعد سکون کی توقع تھی۔ ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر بے معنی نگاہوں سے چھت کو تکنے لگا۔ اچانک باہر سے بہت سارے قدموں کی آواز آئی۔ ڈاکٹر چونک پڑا اور باہر نکل آیا۔ سامنے میدان میں رائفل بردار سپاہی پریڈ کر رہے تھے اور کچھ اپنے اسلحہ کی صفائی میں مصروف تھے۔ اس کے دفتر کے باہر گاؤں والوں نے وہ چارپائی زمین پر رکھ دی تھی جس پر واجد بیہوش پڑا تھا اور اپنے چہرے کا پسینہ کرتے کے دامن سے خشک کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ واجد کے پیر کے زخموں سے پیپ اور بدبو نکل رہی تھی۔ اس کے خشک ہونٹ پر پپڑیاں تھیں اور وہ بے سدھ پڑا تھا۔ گاؤں والوں نے اسے سلام کیا۔ دوپہر ہونے میں دیر تھی لیکن دن گرم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مریض کو معائنے کے کمرے میں لانے کے لئے کہا۔ واجد کو وہاں لا کر اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔

''ابھی کل ہی تو چپ شاہ کی شادی ہوئی تھی ان کی ایسی حالت کیسے ہو گئی؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''مائی باپ۔ یہ ہماری اور پیر جی کی بُری قسمت ہے...... اور کیا کہیں۔ شادی کی رات میں گولی چلنے کی آواز جب جنگ بندی لائن سے آئی تو لوگ ادھر ادھر بھاگے۔ شاہ جی کا پیر غلطی

سے آگ میں پڑ گیا۔'' رحمو بڑی مسکینی سے بولا۔

''یہاں ان کا علاج نہیں ہو سکتا ہے۔ چپ شاہ کو ہسپتال لے جانا لازمی ہے۔''

''مائی باپ۔ تم ہی کچھ کرو۔ ہمارے شاہ جی کو تم پر بڑا بھروسہ ہے۔'' حسن داد نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ دیگر گاؤں والے بھی ملتجی نگاہوں سے ڈاکٹر کو تکنے لگے۔

لیکن ڈاکٹر بے بس تھا۔ اس کے پاس صرف فرسٹ ایڈ اور بہت معمولی بیماریوں کے علاج کی سہولتیں تھیں۔ جن مریضوں کے مرض کا علاج پیچیدہ اور بڑا ہوتا تھا انھیں میر پور ملٹری ہسپتال میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح ان سادہ لوگوں کو اپنی مشکل سمجھائے۔ وہ خالی نظروں سے ان سب کو دیکھنے لگا۔ واجد کے زخموں سے نکلتی بو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اور واجد کے منہ سے بے معنی جملے نکل رہے تھے۔ کبھی وہ کرنل حنیف کو ہندستان پر حملہ کرنے کا حکم دیتا اور کہتا کہ اس کے سارے مرید سر کٹانے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور کبھی نوراں، نوراں اور شاداں، شاداں پکارنے لگتا، اور پھر اس کے منہ سے کوٹ فتح خان کے جاگیردار ظہیر علی کے لیے گالیاں نکلنے لگتیں۔

''تم لوگ سب دروازے کے پاس سے ہٹو۔'' ڈاکٹر نے حکم دیا۔

''سر...... شاہ جی کو واپس بھیج دیجیے۔ خدا نے اگر ان کی موت لکھی ہے تو ہم لوگ انھیں نہیں بچا سکتے ہیں۔'' وہ سرجنٹ بولا جو ڈاکٹر کا معاون تھا۔

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جلدی سے واجد کا معائنہ کیا اور اس کے زخموں کو احتیاط سے صاف کرنے لگا، اور پھر اسے صاف گاز سے ڈھک دیا۔ اس کے بعد اسے پنیسلین کا انجکشن دیا اور سلائین کے بوتل سے جڑی ایک نلکی کو موٹی سوئی کے ذریعے اس کے بازو کی رگ میں لگا دیا۔ سلائین تیزی سے واجد کے جسم میں جانے لگی۔ ڈاکٹر بس اسی حد تک کر سکتا تھا۔ وہ بے بس سا افسوس کے ساتھ واجد کو تک رہا تھا۔

کرنل حنیف کو خبر مل چکی تھی کہ چپ شاہ تشویشناک حالت میں فوج کے ڈاکٹر کے پاس لایا گیا ہے۔ وہ اپنے سرجنٹ میجر کے ساتھ لمبے لمبے قدم بھرتے آئے۔ ڈاکٹر اور اس کے سرجنٹ نے تن کر کرنل حنیف کو سیلوٹ کیا۔ ان کی نظر جب بیمار واجد پر پڑی تو انھیں بہت افسوس ہوا اور وہ ایک دھیمی آہ بھر کر بولے۔

''خدا کی حکمت بھی عجیب ہوتی ہے۔ دو دن پہلے شاہ صاحب اپنی شادی کی خوشیاں منا رہے تھے اور آج اس حال میں پڑے ہیں۔''

''سر...... ان کے زخمی پیر میں جراثیم بھرے ہوئے ہیں جنکا زہر شاہ صاحب کے جسم میں پھیل گیا ہے۔ یہاں ان کا علاج ناممکن ہے۔'' ڈاکٹر تیز لہجے میں بولا۔

''ہاں...... میں سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے؟''

''سر انھیں میر پور کے سول ملٹری ہسپتال میں لے جانا چاہئے۔''

''کس طرح؟'' کرنل حنیف نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر کو گھورا۔

''میں ایمبولنس نہیں دے سکتا ہوں۔ وہ صرف بیمار اور زخمی سپاہیوں کو لے جانے کے لیے ہے۔''

کرنل حنیف نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کا ایک ہاتھ ان کے منہ پر چلا گیا۔ دوسرے ہاتھ میں جو پتلی سی بید کی چھڑی تھی اسے وہ آہستہ آہستہ اپنی پنڈلی پر مارنے لگے۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھے۔ گاؤں والے ملتجی نگاہوں سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ چپ شاہ کی زندگی کرنل حنیف کو عزیز تھی۔ انھیں یقین تھا کہ بغیر ان جیسے متقی اور پرہیز گار انسان کے اسلام ایسے دور دراز علاقوں میں زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ کرنل حنیف کو خیال آیا کہ اگر وہ چپ شاہ کو کسی طرح بٹالین کی کسی ٹرک میں میر پور روانہ کر دیتے ہیں تو پیر کی زندگی بچ سکتی ہے۔

''سرجنٹ میجر صاحب۔ کوارٹر ماسٹر صاحب کو سلام بولئے اور کہیئے کہ میر پور سے رجمنٹ کے لیے کچھ سامان لانے کے لیے فہرست بنا دیں۔ ہمارے شاہ صاحب اسی ٹرک میں جائیں گے۔''

لمبا تڑنگا اور ادھیڑ عمر سرجنٹ میجر سیلوٹ مار کر بٹالین ہیڈ کوارٹر کے دفتر کی جانب چلا گیا۔ کرنل حنیف کی کوٹلی میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ملٹری پولس کا جو کرنل تھا، اس سے دوستی تھی۔ فوجی قانون کی جو خلاف ورزی ان کے حکم سے ہو رہی تھی، اس سے اپنے دوست کی مدد سے کرنل حنیف بچ سکتے تھے۔

جلد ٹرک تیار ہو گئی۔ واجد کو اسٹریچر سمیت اس میں لٹا دیا گیا اور سلائن کی بوتل پٹیوں کی مدد سے ٹرک کی چھت میں لوہے کی جو منحنی کڑیاں تھیں ان میں سے ایک میں لٹکا دی گئی۔ دو رائفل بردار سپاہی جنھیں فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ مل چکی تھی وہ ساتھ کر دیئے گئے۔ گاؤں والے

بہت خوش ہوئے اور زور زور سے کرنل حنیف کو دعائیں دینے لگے۔ مگن شاہ اداسی سے اس عجیب وغریب کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیز ڈگ بھرتا ہوا سڑک پر آ گیا جہاں بھاگتی ٹرک کے پیچھے سے گھنا غبار اٹھ رہا تھا۔ واجد کو جاتے دیکھ کر اس نے گاؤں والوں پر نا سمجھی سے بھری نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

''ہاں اللہ بہت بڑا ہے مگن شاہ۔'' حسن داد بولا، پھر دبی زبان سے اپنے آپ کو اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر اچھا ہوتا تو کم سے کم ہمارے شاہ صاحب کو ہوش میں لے آتا۔ خیر اللہ مالک ہے۔''

''سرجنٹ میجر صاحب! ان گاؤں والوں کو کھانا کھلوا دیں۔'' کرنل حنیف نے حکم دیا۔

''ٹھیک ہے سر۔ بعد میں کھانے کے بدلے ان سے کچن کے لیے لکڑیاں کٹوالیں گے۔'' سرجنٹ میجر نے جواب دیا۔

کرنل حنیف نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔

شام ڈھل رہی تھی اور جنگلوں سے اندھیرا خانقاہ کی جانب سرک کر آ رہا تھا، اور سرمئی آسمان میں چند تاروں کے چراغ جل چکے تھے۔ حسن داد، رحمو، مگن شاہ اور دیگر گاؤں والے تھکے ہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خانقاہ پہنچے۔ ان کی حفاظت کے لیے دو رائفل بردار گشتی سپاہی بھی تھے۔ نوراں اور شاداں غم سے سر جھکائے دیوار سے پیٹھ لگائے برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ آنے والوں کے ساتھ خالی چارپائی کو دیکھ کر دونوں مارے ڈر کے کانپ گئیں۔

''اللہ رحم کر۔ ہمارے شاہ جی کو کیا ہو گیا؟'' نوراں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ وہ مارے دہشت کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ شاہ جی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس نے دو ہتڑ شاداں کی پیٹھ پر مارا اور بولی۔

''منحوس...... تیری قسمت میں کوئی بھلا دن نہیں آ سکتا۔ تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مر گئی؟'' دونوں ہاتھوں سے سر ڈھک کر شاداں رونے لگی۔ وہ سمجھنے سے معذور تھی کہ یہ سب غیر متوقع واقعات اس کی زندگی میں اچانک کیوں ہونے لگے ہیں۔

''عورت...... اپنی بیٹی کو سزا مت دے۔ اس کا کیا قصور؟ شاہ جی کو میرپور کے ملٹری ہسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ وہاں سے بہت لوگ چنگے ہو کر لوٹے ہیں۔ شاہ جی پر بھی اللہ کرم کرے گا۔'' حسن داد نے نوراں سے سخت لہجے میں کہا۔ دونوں سپاہیوں نے ماں بیٹی پر للچائی

ہوئی نظر ڈالتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''لیکن میر پور کیوں؟'' نوراں کی سمجھ میں وجہ نہیں آئی تھی۔

''فوج کے ڈاکٹر صاحب علاج نہیں کر سکے۔ اس لیے شاہ جی کو میر پور بھیج دیا گیا۔'' حسن داد ہلکی سی سسکی لے کر بولا اور برآمدے میں دم لینے بیٹھ گیا۔

''ہم نادان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا کہ شاہ جی اتنے بیمار ہیں۔'' رحمو اپنی جھکی ہوئی مونچھوں کو سہلاتا ہوا بولا۔

''شاداں کل صبح ہی تیاری کر لے۔ ہم میر پور جائیں گے شاہ جی کی خدمت کرنے۔''

''نوراں...... تو وہاں ٹھہرے گی کہاں؟'' حسن داد نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ہسپتال میں۔''

''نوراں! تو باؤلی ہوگئی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم پہاڑی لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔ لیکن تو میدان کی رہنے والی ہم سے بھی آگے نکل گئی۔ ملٹری ہسپتال میں کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔'' حسن داد نے چہرے کے پسینہ کو آستین سے خشک کرتے ہوئے ایک طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

نوراں سوچنے لگی کہ اگر شاہ جی مر گئے تو کیا ہوگا؟ اچانک اس سوال کا حل اس کے ذہن میں شعلے کی طرح لپکا۔ وہ اور شاداں یہیں خانقاہ میں رک جائیں گے اور مشہور کر دیں گے کہ شاہ جی سے شاداں کو بچہ ہونے والا ہے۔ اس نے ایک رات شوہر کے ساتھ گزاری ہے کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہو گیا۔

''شاہ جی میر پور گئے کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''کرنل صاحب کی مہربانی۔ انھوں نے ایک فوجی ٹرک میں شاہ جی کو سوار کر کے بھیج دیا۔'' رحمو نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اپنی مونچھ کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ اس کی نگاہ بار بار نوراں پر گئی۔

حسن داد اور رحمو کے علاوہ باقی گاؤں والے واپس ہو گئے تھے۔ گشتی سپاہی بھی سامنے کی پہاڑی کی دوسری جانب کمپنی ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے تھے۔ نوراں، حسن داد اور رحمو کو اچھی طرح نہیں جانتی تھی پھر بھی اسے احساس تھا کہ دونوں شاہ جی کے بڑے ہمدرد ہیں۔ ان دونوں کی وجہ سے اسے تحفظ کا احساس تھا۔

''تم دونوں بہت تھک گئے ہو گے۔'' نوراں نے نرمی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

''ظالم سرجنٹ میجر نے ڈھیر ساری لکڑیاں ہمیں چیرنے کے لیے کہا۔ وہ تو شکر ہے ملنگ شاہ ساتھ تھے۔ انھوں نے جلد ہی ان کا برادہ بنا دیا۔'' رحمو نے فخریہ جواب دیا۔

''بیچارہ...... جب تک شاہ جی نہیں آئیں گے یہ یتیم رہے گا۔'' ملنگ شاہ پر مشفقانہ نگاہ ڈالتے ہوئے نوراں بولی۔

''پانی...... پانی...... اللہ اکبر۔'' ملنگ شاہ نے طلب کی۔

شاداں نے کسی حکم کا انتظار نہیں کیا۔ وہ اٹھی اور گلاس میں پانی بھر کر لے آئی۔ ملنگ شاہ نے کئی گلاس خالی کر دیے۔ اس کے تھکے ہوئے جسم میں تازگی آ گئی۔

''خانقاہ میں اکیلے رہنے سے مجھے خوف آ رہا ہے۔'' نوراں نے اپنے ڈر کا اظہار کیا۔

''یہاں چور ڈاکو نہیں ہیں۔ رات کے وقت فوج کے گشتی سپاہی نیچے سڑک پر اور پہاڑی کی دوسری طرف گشت کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو خانقاہ کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہیں ہو سکتی ہے اور ملنگ شاہ بھیڑ کے بچے کی طرح معصوم ہے۔ لیکن تم دونوں ہمارے گاؤں میں رہنا چاہو تو ہم سب کو خوشی ہوگی۔'' حسن داد نے ہمت بندھائی۔

نوراں خانقاہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ گاؤں میں جا کر رہنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ رحمو کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ شاہ جی کے جانے کے بعد اس جگہ کی ذمہ داری اس پر تھی۔ اس کے علاوہ اب شاداں اس خانقاہ کی مالکن تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ یہی اس کا گھر بھی تھا۔ اب اس کی حفاظت اسی پر تھی۔

''اب اللہ کی مرضی ہے کہ ہم اس خانقاہ میں بغیر شاہ جی کے رہیں تو ایسا ہی ہوگا۔'' نوراں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چل گھر چلیں۔'' حسن داد نے رحمو سے کہا۔ پھر دونوں پنجنی کی جانب روانہ ہو گئے۔

خانقاہ میں صرف ملنگ شاہ اور دو عورتیں رہ گئی تھیں۔ سامنے کا جنگل مہیب سایہ کی طرح پھیلا تھا اور پہاڑی سے پرے کالا دیو پہاڑ جیسے بانہیں پھیلائے کسی کا منتظر تھا۔ نوراں کے اشارے پر شاداں نے لالٹین روشن کی پھر وہ، چولھے میں آگ جلانے کے بعد آٹا گوندھنے لگی۔ اس کی کلائی پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں اور محنت کی وجہ سے اس کے بالائی ہونٹ پر پسینہ کے قطرے نمایاں ہو گئے تھے۔ ملنگ شاہ محویت سے اس کے جسم کے پیچ و خم کو دیکھ رہا تھا۔ شاداں کا آگے کی طرف جھکنا۔ بازو سے سر کے بال کو پیچھے کرنا اور انگلیوں سے لپٹے گیلے آٹے

کو آہستہ آہستہ صاف کرنا۔ ان سب میں مگن شاہ کو کشش محسوس ہونے لگی۔ نوراں نے جلدی جلدی روٹیاں اور دال بنا کر مگن شاہ کے سامنے کر دیا اور ایک جانب بیٹھ کر ماں بیٹی نے بھی یہی کھایا۔ جب مگن شاہ نے کھانا ختم کر دیا تو نوراں نے وہ دہی بھی اسے کھانے کے لیے دیا جسے وہ اپنے اور شاداں کے لیے کوٹھری میں رکھا ہوا تھا۔ وہ مگن شاہ کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ اب وہی ان دونوں کا محافظ تھا۔ وہ خوش ضرور ہوا، ا، رجمنٹ میں لکڑیاں چیرنے اور ایک بڑی مسافت طے کرنے سے جو تھکاوٹ اس کے جسم میں تھی وہ بھی دور ہوئی۔ لیکن اسے اصل مسرت شاداں کو دیکھتے رہنے میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا اور کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ نوراں نے تاڑ لیا۔ جب رات آئی تو ماں بیٹی حجرے میں چارپائی پر پڑ رہیں اور نوراں نے دروازے کو بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ مگن شاہ برآمدے میں سو گیا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی تھی۔ گاؤں کی عورتوں نے اسے بتا دیا تھا کہ سپاہیوں کا غیر فوجی کے گھروں میں داخلہ ممنوع ہے۔ پھر بھی نوراں کو ڈر تھا۔ پنجنی آتے ہوئے نائک نے فوجی ٹرک میں اس کے ساتھ جو دست درازی کی تھی وہ اسے یاد آئی۔ کہیں سپاہی یہاں گھس آئے تو کیا ہوگا؟ لیکن اب یہ سب سوچنا بیکار تھا۔ اوپر اللہ تھا اور شاہ جی کی دعائیں بھی ان کی محافظ تھیں۔

دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ مگن شاہ کے خراٹوں کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اس نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ تاریکی میں جیسے کچھ دیکھ رہا تھا۔ واجد کی بکریاں جہاں بندھی تھیں وہاں سے ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں گنگنائیں۔ مگن شاہ انہیں کچھ دیر تک سنتا رہا پھر وہ آہستہ سے اٹھا اور اس پیڑ کے پاس گیا جس پر جھنڈی تھی۔ مگن شاہ نے درخت کے سبک تنے کو ہلایا۔ شاخوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ان پر بیٹھے پرندوں نے اپنے پنکھ پھڑپھڑائے۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ایک مشفقانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور کچھ بڑبڑاتا ہوا واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ جن سے اسے قربت تھی وہ بھی محفوظ تھے۔ مگن شاہ کو آرام کی نیند آ گئی۔

نوراں نے پاس لیٹی شاداں کے سر کو چھوا اور پوچھا۔

"کیا تو سو رہی ہے۔"

"نہیں ماں۔"

"کیا تجھے ڈر لگ رہا ہے؟"

''ہاں۔''

''بہت زیادہ۔''

''ہاں۔'' شاداں بولی اور اس نے اپنے سر سے ماں کے سینے کو دبایا۔ جیسے وہ ماں کے دودھ کی متلاشی تھی۔ جیسے اسے اس طاقت کی تلاش تھی جس نے روز اول سے اسے حرارت بخشی تھی اور تحفظ دیا تھا۔

''اب اس میں دودھ نہیں ہے۔'' نوراں نے بیٹی کو چھیڑا۔

''ماں...... تو کیسی باتیں کرتی ہے...... اگر ان میں دودھ ہوتا تو کیا مجھے پلاتی؟''

''کیوں نہیں...... بچے ماں کی آنکھوں میں کبھی بڑے نہیں ہوتے۔''

''ماں...... کیا تو مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔''

نوراں کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ اس نے ایک سسکی لی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ تاریک خلا میں تکتی ہوئی بولی۔ ''ہاں...... جب شاہ جی واپس آجائیں گے تو میں چلی جاؤں گی۔''

شاداں خاموش ہوگئی۔ اس کا خاوند جس حال میں خانقاہ سے گیا تھا اس کی وجہ سے اسے خیال آتا رہا تھا کہ شاید وہ مرجائے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ شاداں کو خوف سے ایک جھٹکا سا لگا۔ اردگرد کی نیم تاریکی سے کوئی عجیب سا ہیولا شاداں کے پاس آکر ہنسنے لگا۔ وہ سہم گئی اور کچھ جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''اگر شاہ جی نہیں آئے تو؟''

''پھر میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' نوراں نے مستحکم جواب دیا۔ شاداں نے زور سے ماں کو لپٹا لیا۔

''شاداں...... کیا شاہ جی نے وہ کیا تھا؟''

بیٹی مارے شرم کے سکڑ گئی۔ اس سے جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

''شاداں جواب دے۔''

''انھوں نے کوشش کی تھی لیکن نہیں ہوا۔'' شاداں نے جھجکتے ہوئے دھیمے سے جواب دیا۔

''مت فکر کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شاہ جی کو واپس آنے دے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا تو نے وہ لال پانی پھینک دیا ہے؟''

"نہیں ماں...... وہ اب بھی چارپائی کے نیچے پیالی میں پڑا ہے۔ ماں...... مجھ سے ایسی باتیں مت کر مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"میرے سوا اور کون تجھے عقل دے سکتا ہے۔ جب بھی شاہ جی وہ کام کریں تو اپنی شلوار پر لال پانی سے داغ ڈالنا مت بھولنا۔ مرد کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی کنواری نہیں ہے تو وہ اسے مار کر نکال باہر کرتے ہیں۔"

"وہ کیوں ایسا چاہتے ہیں ماں؟"

"مرد انہیں اپنا نوکر چاکر سمجھتے ہیں جس پر کسی اور نے کبھی حکم نہیں چلایا ہو۔"

"کیا مرد بھی کنوارے ہوتے ہیں؟"

"میں نہیں سمجھی شاداں۔ کیا مطلب ہے تیرا؟"

"نہیں معلوم۔" شاداں کے دل میں جو خیال آیا تھا اس کا اظہار وہ نہیں کر سکی۔ بہت دور سے کسی کی بھیانک آواز آئی۔

"یہ کس جانور کی آواز ہے ماں؟" شاداں نے مارے ڈر کے پوچھا۔

"نہیں معلوم بیٹی...... وہ کتے نہیں ہیں۔ وہ بھیڑئیے بھی نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں نہیں؟"

"اگر ان کا خوف ہوتا تو شاہ جی مگن شاہ کو باہر نہیں سونے دیتے۔ رات بیلا فوجی جنگل میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ وہاں بھیڑیا اور چیتا نہیں ہو سکتا۔" نوراں نے بیٹی کے سر کو مشفقانہ سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ نوراں بھی اس آواز کو غور سے سن رہی تھی۔ یہ کسی عورت کے بین کرنے کی صدا تھی جو دور سے آ رہی تھی اور رات کی خاموشی میں بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ نوراں کچھ دیر تک اسے سنتی رہی پھر سرگوشیوں میں بولی۔

"یہ فضلاں ہے جو کبھی کبھی باؤلی ہو جاتی ہے اور اپنی مری بہن کو یاد کر کے رونے لگتی ہے۔"

"کیا ہو گیا تھا اس کی بہن کو؟"

"سو جا شاداں...... اوروں کے دکھ کو سن کر اپنے دکھ بھی بڑھ جاتے ہیں۔" شاداں کو جستجو ہو گئی۔ اس نے ایک کہنی پر ٹیک کر ہاتھ پر سر رکھ دیا اور اندھیرے میں ماں کے چہرے کے تاثرات کو جاننے کی کوشش کی۔ لیکن نوراں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کروٹ بدل کر بیٹی کی جانب پشت کر دی۔ شاداں کا تجسس اور بڑھا۔ اس نے ماں کے شانے کو آہستہ سے

ہلا کر اپنا سوال دہرایا۔ نوراں نے ہاتھ بڑھا کر بیٹی کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور بغیر اس کی جانب چہرہ کیے وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ملک کے بٹوارے سے کچھ پہلے کی بات ہے۔ فضلاں کی ایک بن بیاہی اور جوان چھوٹی بہن تھی۔ یہاں ایک ٹھیکیدار اپنے آدمیوں کے ساتھ جنگل کے درختوں سے رس نکال کر گوند بنانے آیا کرتا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک فضلاں کی بہن کے پیٹ میں بچہ چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ گاؤں والے جان گئے اور فضلاں کی بہن کی جان کے دشمن ہو گئے۔ پنجنی میں ان دنوں ایک ہندو ترکھان تھا اسے فضلاں کی بہن پسند تھی۔ اس نے کہا کہ میں کروں گا تیرے ساتھ بیاہ اور تیرے بچے کو اپنی اولاد سمجھوں گا بیشک وہ بعد میں مسلمان بن جائے۔ ۴۷ء میں جب دونوں ملکوں میں جنگ ہونے لگی تو وہ ترکھان فضلاں کی بہن کو ساتھ لے کر رات میں بھاگ نکلا۔ لیکن دونوں فوجیوں کی گولیوں کا کہیں نشانہ بن گئے۔ ان کی لاش بھی نہیں ملی۔"

شاداں اداس ہو گئی۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہو؟ اس نے سوچا اور ماں سے چمٹ گئی۔ اسے پتہ تھا کہ جب تک اس کی ماں اس کے قریب ہے وہ ہر طرح محفوظ ہے۔ اسے اپنی ماں کی غیر معمولی ہمت اور ارادوں کا علم ہو چکا تھا۔ وہ ٹرین اور بس میں دور تک سفر کرنے کے بعد یہاں پہنچی تھی۔ یہی نہیں اس نے فوجی گاڑیوں میں بھی سفر کیا تھا۔ اجنبی افراد کے درمیان اس نے کسی قسم کے خوف کا نہ اظہار کیا اور نہ ہی ان سے مدد حاصل کرنے میں اسے دشواری ہوئی تھی اور ایک بزرگ دین دار انسان کو اس کا خاوند بنا دینا بھی شاداں کی نگاہ میں معرکہ تھا۔ ان سارے مسائل کا حل اس کی ماں اتنی آسانی سے کر سکتی ہے شاداں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایسے کام تو ایک مرد ہی کر سکتا تھا۔ اس کی ماں اس عجیب و غریب دنیا میں بڑی عقلمند اور دلیر عورت تھی، جس پر وہ جتنا بھی فخر کرتی کم تھا۔

حجرے کے باہر سے مگن شاہ کے کراہنے کی آواز پھر آئی۔ مرد کب اس طرح کراہتا ہے نوراں جانتی تھی۔ وہ کسی نامعلوم خوف سے کانپ گئی۔

"ماں۔"

"ہوں۔"

"مگن شاہ سونے میں کیوں اس طرح کراہتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم شاداں۔ شاید وہ بھوک کی وجہ سے کراہتا ہے۔ خدا کرے تیرا خاوند جلد

چنگا ہو جائے۔ وہ مگن شاہ کے ساتھ برتاؤ کرنا جانتا ہے۔ اللہ رحم کر۔"

"مگن شاہ بالکل بچہ کی طرح ہے۔" شاداں مسرور لہجے میں بولی۔

"گاؤں والے کہتے ہیں مگن شاہ بھی ایک پہنچا ہوا فقیر ہے۔"

"کیا پیر بھی ایسے ہوتے ہیں؟"

"ہاں...... وہ کبھی پاگل دکھتے ہیں۔ کیونکہ ہر بیلا اللہ کی سوچ انھیں کچھ اور سوچنے یا سمجھنے نہیں دیتی۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل ننگ دھڑنگ گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔"

شاداں یہ سن کر ہنس پڑی۔ "ماں تجھے کیسے معلوم ہوا۔"

"رینو نے بتایا تھا۔"

"کون تھا وہ؟"

"تو اسے بھول گئی؟ اس کے بندروں سے تو کھیلا کرتی تھی۔"

"اب یاد نہیں پڑتا۔"

"رینو بھلا آدمی تھا۔ اس نے تیری ماں کو اس وقت سہارا دیا جب بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔" بولتے وقت نوراں کی ایک سسکی نکل گئی۔ وہ گزرے دن اسے یاد آنے لگے تھے۔

شاداں چونک پڑی۔ اس کی فرشتہ اور دلیر ماں سے کوئی نفرت بھی کر سکتا تھا اس کے لیے یہ بات نا قابل فہم تھی۔ اندھیرے میں شاداں نے نوراں کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہی گورا اور آشنا چہرہ تھا۔ پیار بھرا اور پیارا سا۔ لیکن وہاں جو کرب تھا اسے شاداں نہیں دیکھ سکی۔

"تجھ سے...... ماں۔ تجھ سے لوگ نفرت کرتے تھے؟" بیٹی نے زخمی لہجے میں ماں سے پوچھا۔

"جب تیرا باپ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو لوگوں نے مجھے بُری عورت کہا اور یہی سمجھتے رہے۔ اکیلی عورت پر داغ نہ بھی ہو جب بھی سب کو داغ نظر آتا ہے۔ جانے دے ان باتوں کو۔ تیرے بال میری ماں کی طرح چکنے اور لہریلے ہیں۔" نوراں اپنی بیٹی کے سر کو مشفقانہ سہلا رہی تھی۔ اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی اور بچپن بھی دھیما دھیما شور بن کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ بچپن جسے علم نہیں تھا زندگی سے کیا ملتا ہے اور دنیا کیا دیتی ہے۔

"ماں...... میرے بال بھی تیری طرح ہوتے۔ پھر مجھے کتنا اچھا لگتا۔ رات سے بھی

زیادہ کالے۔ جس میں ہر دم چھپے رہنے کو میرا دل کرتا۔"

شاداں کو اپنی پیشانی اور گالوں پر ماں کی گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ ساری رات اسی طرح ماں سے چمٹی اس سے باتیں کرتی رہے اور اس کی شفیق باتیں سنتی رہے اور دن کبھی نہ آئے۔ اس رات میں جو طلسمی سکون تھا وہ کبھی نہ مٹے۔

"ماں۔"

"کیا بات ہے بیٹی؟"

"میں ماں کیسے بن گئی؟"

نوراں کا وہ ہاتھ جو شاداں کے سر پر تھا اسے بے اختیار اس نے کھینچ لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نوراں کو پہلی بار احساس ہوا کہ حجرے میں ان دھلے لحاف اور دیمک زدہ کاغذوں کی ناخوشگوار بو تھی۔ نوراں کو اپنے خاوند زری خاں سے شدید نفرت اور گھناؤنے پن کا احساس ہوا۔ اس کے لیے جو زہر بھری گالیاں اس کے زبان پر آئیں انھیں نوراں نے بکنے سے روک لیا۔ کاش وہ شاداں کو اس ہولناک راز سے آگاہ کر سکتی۔ اس طرح خود اس کا دل بھی ہلکا ہو جاتا۔ لیکن یہ محال تھا۔ پھر اسے بہت کچھ بتانا پڑتا۔ اس کی ساری زندگی۔ شاداں جس کی ہونے جا رہی تھی اس کے ساتھ وہ رشتہ بھی زبان پر لانا پڑتا جو امام واجد سے اس کا تھا اور جس نے اس جیسی ایک بے بس عورت کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ نوراں کچھ دیر تک خاموش رہی۔ اس کا ہاتھ پھر بیٹی کے سر پر چلا گیا اور ایک بار پھر بیٹی کے بالوں کو نوراں سہلانے لگی۔ وہ سرگوشیوں میں بولی۔

"مجھے بھی اس کا نہیں پتہ...... لیکن فکر مت کر جب بچہ پیدا ہوگا تو شاہ جی اسے اپنا ہی سمجھیں گے۔"

"اگر میں نے انھیں بتا دیا کہ بچہ ان کا نہیں ہے...... تو؟"

"تیرے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ تو مٹا دی جائے گی شاداں۔"

نوراں کو محسوس ہوا کہ شاداں ڈر کر اس کی قمیص کو کھینچ رہی تھی۔

"ماں...... مجھے ڈر انہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تو چپ رہے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جب تیرا خاوند آئے تو اس کی اچھی طرح خدمت کرنا۔ تو پیٹ سے مشکل سے چھ ہفتے ہوئی ہے۔ کبھی کبھی بچے

نو مہینے سے پہلے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مردوں کو ہم عورتوں کی سمجھ نہیں ہوتی۔ شاہ جی تو باپ بن جانے کے بعد خوش ہی ہوں گے۔''

شاداں کی نگاہیں چھت کے پاس جھروکے پر گئیں۔ اسے دور آسمان میں تارے نظر آئے۔ اس نے سوچا کاش ان کے پاس ان مصیبتوں کا حل ہوتا جنھیں اسے ماں کے جانے کے بعد تنہا جھیلنا ہوگا۔

''تیرے جانے کے بعد میں تو اکیلی ہو جاؤں گی۔''

نوراں کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر زور سے دبا دیا۔ اگر وہ شاداں کے پاس اس کے بچے کی پیدائش تک رُک جاتی پھر اسے کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔ لیکن واجد اسے چلے جانے کا حکم دے چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایسا نہیں ہوا تو واجد پھر پھسل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے ذلیل خاوند سے بھی بدلہ چکانا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب سا تھا جسے وہ کس طرح کہتی۔ نوراں نے کروٹ بدلی اس کی پشت شاداں کی جانب ہوگئی۔

''اب سو جا شاداں۔ جب تو پیدا ہوئی تھی تو اس وقت میں بھی اکیلی تھی۔ تیرا باپ گاؤں سے دور شہر گیا ہوا تھا اور میرے ماں باپ بھی مر چکے تھے۔ یہی ہماری قسمت ہے۔'' نوراں کی آواز میں شکایت نہیں تھی اور نہ ہی بیکسی کا شکوہ۔ یہی اس جیسی کا مقدر تھا جو کبھی نہیں بدلتا اور خدا بھی جسے نہیں بدلنا چاہتا۔

دوسرے دن جب ضرورت مند خانقاہ آئے تو انھیں واجد کو نہیں پا کر حیرت ہوئی۔ خانقاہ میں مگن شاہ اکیلا تھا۔ نوراں اور شاداں نہانے اور دھونے اس چشمہ پر گئی ہوئی تھیں جو کچھ فاصلہ پر تھا۔ حاجت مندوں کو مگن شاہ اداس اور پریشان سا اپنے کام میں مصروف نظر آیا۔ وہ حجرہ جہاں سے واجد کی شیریں قرائت آیا کرتی تھی اس کی خاموشی انھیں عجیب سی لگی۔ ان کے پیر کی غیر موجودگی کی وجہ انھوں نے مگن شاہ سے پوچھا لیکن اس نے ان کے سوالات کو دہرا دیا۔ آخر کار سبھی چلے گئے۔ مگن شاہ ادھر ادھر خانقاہ کے گرد گھومتا رہا۔ جو کام وہ ہر روز کرتا تھا اس میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے بھیڑوں اور بکریوں کو چراگاہ کی طرف ہنکا دیا۔ برآمدے میں جھاڑو دینے کے بعد چولھے میں جلانے کے لئے جو لکڑیاں ادھر ادھر پڑی تھیں انھیں اس نے ایک جانب کر دیا پھر وہ درخت جس پر جھنڈی لہراتی رہتی تھی اس کے نیچے اداس سا بیٹھ گیا۔ گڈمڈ کرتے جو خیالات اس کے ذہن میں گھومتے رہتے تھے ان میں کھو جانے اور کسی سے جدا ہو

جانے کے خیالات بھی تھے۔ وہ واجد کو ہر دن دیکھنے اور اس کی وہ باتیں سننے کا عادی تھا جنھیں واجد کبھی کبھی اسے حکم دیتے وقت بولتا تھا۔ اس کی جو سزائیں اس نے سہی تھیں ان کے باوجود واجد سے مگن شاہ کو گہرا لگاؤ تھا۔ ایک ایسی وابستگی تھی جس کا اظہار اس کے لیے ناممکن تھا۔

اکتاہٹ اور اداسی سے مجبور ہو کر مگن شاہ اٹھا اور واجد کے حجرے میں چلا گیا۔ جیسے اسے امید تھی کہ اس کا مونس اور محافظ اب بھی وہاں موجود تھا۔ لیکن وہاں خالی پن کا نوحہ تھا۔ وہ اب ایک اجنبی اور نامانوس سی جگہ تھی۔ مگن شاہ اس دری پر بیٹھ گیا جس پر واجد عبادت کیا کرتا تھا۔ مگن شاہ کو اس حجرے میں شاذونادر آنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ وہاں قرآن، تسبیح اور جائے نماز وہ متبرک اشیا تھیں جو مگن شاہ کے نجس ہاتھوں سے ناپاک ہو سکتی تھیں۔ وہ حجرے میں کبھی آتا تو اسے ان سب کو چھونے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ لیکن آج مگن شاہ کا آقا وہاں نہیں تھا۔ مگن شاہ دری پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں حجرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اچانک اس کی نگاہ چارپائی کے نیچے رکھی پیالی پر پڑی۔ مارے تجسس کے اس نے اسے اٹھا لیا۔ اس پیالی میں کوئی گاڑھی سرخ سیال شے تھی۔ مگن شاہ نے سمجھا وہ کوئی مزیدار پینے کی شے ہے۔ اس پیالی کو نوراں نے ایک خاص وجہ سے وہاں رکھ دیا تھا۔ اسی شے سے اپنی شلوار کو داغدار کر کے شاداں کو اپنے خاوند پر ثابت کرنا تھا کہ وہ کنواری تھی۔ مگن شاہ پیالی کو چند لمحے تک للچائی ہوئی نظروں سے تکتا رہا پھر اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔ جو شے اس میں تھی اس کا مزہ کچھ ایسا تلخ تھا کہ اسے اس نے فوراً تھوک دیا۔ اس کی ٹھوڑی اور کپڑوں پر سرخ چھینٹیں پڑ گئیں۔ باہر سے قدموں کی آواز آئی۔ نوراں اور شاداں واپس آ گئی تھیں۔ لیکن مگن شاہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ منہ بنائے اسی طرح بیٹھا رہا۔ نوراں حجرے میں داخل ہوئی وہاں مگن شاہ کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ نکل یہاں سے۔'' نوراں ڈپٹ کر بولی اور دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

مگن شاہ اٹھ کر جب باہر جانے لگا تو نوراں کو اس کی ننھی داڑھی اور کپڑے پر سرخ داغ نظر آئے۔

ایک گندہ قہقہہ اس کے منہ سے نکلا اور وہ ہنستی ہوئی حجرے کے باہر آ گئی۔ شاداں کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا۔ مگن شاہ بھی احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اس نے سبھوں کو خوش کر دیا تھا۔

''اللہ اکبر۔'' اس نے پرمسرت نعرہ لگایا۔

''تو ایسی بڑی بات بولتا ہے۔ کیا تجھے اپنی دُم بھی دھونا آتا ہے؟'' نوراں نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

''دم؟'' مگن شاہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ منھ، داڑھی اور مونچھ کے سرخ ہو جانے کی وجہ سے وہ احمق نظر آ رہا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... تیری دم...... احمق۔'' نوراں بولی اور اس نے مگن شاہ کی پشت کے نیچے اشارہ کیا۔

اپنے آپ سے بھی گئے گزرے، ناسمجھ اور نادان فرد کو اس حال میں دیکھ کر نوراں پر سے بیکسی اور بے بسی کی وہ چادر گر گئی تھی جس کی وجہ سے وہ معصوم اور بے ضرر نظر آتی تھی۔

''دم احمق۔'' بغیر جانے بوجھے کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں مگن شاہ نے انھیں دہرا دیا۔

نوراں اور شاداں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ مگن شاہ بھی ان کی ہنسی میں شریک تھا۔ اس کی ننھی آنکھیں بند تھیں اور اس کی توند ہنسنے کی وجہ سے ہل رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تینوں واجد کو بھول گئے۔ نوراں کو مگن شاہ کی موجودگی پسند آئی اور شاداں کو یہ عجیب و غریب گول مٹول سا انسان ایک بچے جیسا معصوم لگا۔ اس نے سوچا کہ کاش یہ بامعنی باتیں کر سکتا پھر اس کا وقت کتنا اچھا کٹتا۔

''مگن شاہ اب جا کر جنگل سے جلانے کے لیے لکڑیاں لے آ۔'' نوراں نے کلہاڑی کی جانب اشارا کرتے ہوئے حکم دیا۔

مگن شاہ نے کلہاڑی اٹھا کر اس طرح شانے پر رکھا جس طرح سپاہی کبھی کبھی رائفل اٹھائے نظر آتے تھے۔ جب چلتے وقت وہ شاداں کے پاس سے گزرا تو غیر ارادتاً اس کا جسم شاداں کے جسم پر سے پھسلتا ہوا گزرا۔ اس نے شاداں کے گداز بازو کو اپنے جسم سے ٹکراتا محسوس کیا۔ اس نے مڑ کر عجیب نگاہوں سے شاداں کو تکا۔ جس کی آنکھوں میں شریر مسکراہٹ تھی۔ مگن شاہ کچھ بدبدایا اور پھر اس نے اپنی راہ لی۔ نوراں زمین پر بیٹھی اپنا سر کھجا رہی تھی اس لیے وہ کچھ نہیں دیکھ سکی۔

۱۴

کچھ دن گزر گئے۔ واجد کی غیر موجودگی کی نوراں عادی سی ہو گئی۔ شاداں بھی خانقاہ اور اس کے گرد و نواح سے مانوس ہو گئی۔ یہاں اسے ہر روز آسمان دھلے ہوئے نیلے شیشے کی طرح نظر آتا۔ ہوا نرم اور خنک اور تازگی سے بھری محسوس ہوتی۔ ہر دن آفتاب نیا لگتا۔ اس کی تپش بھلی لگتی۔ سپاہی جب خانقاہ کے پاس سے گزرتے تو اکثر رک کر ان کی خیریت پوچھ لیتے اور ساتھ ہی واجد کی بابت اچھی ہی خبر دیتے۔ وہ آہستہ آہستہ بہتر ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی مکھیا حسن داد اور چوکیدار رحمو بھی آ ٹپکتے۔ وہ نوراں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کرتا اور اس کی ہر بات کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ لیکن نوراں نے اسے منھ نہیں لگایا۔ وہ اپنے کام میں کچھ زیادہ تندہی سے مصروف ہو جاتی اور فضلاں جب آتی تو اپنی ٹیڑھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی۔ مگن شاہ پر حکم چلاتی اور پھر برآمدے میں پڑ جاتی۔ اسے سونے کا مرض تھا اور خانقاہ میں اس کی آسانی بھی تھی۔ کوئی اسے نہیں ٹوکتا۔ مرید یا ضرورتمند واجد کی دعاؤں یا تعویذ کے لیے آتے اور اسے نہ پا کر نا اُمید واپس چلے جاتے۔ محنت اور مشقت کا کام کرنے کے لیے مگن شاہ موجود تھا۔ نوراں اور شاداں کے لیے زندگی آسان ہو گئی تھی۔

برسات کا موسم قریب آ رہا تھا۔ پنجنی اور کالا دیو پہاڑ پر بادل کثیف دھویں کی طرح اڑتے ہوئے کبھی کبھی گزر جاتے۔ ہوا میں نمی آ گئی تھی۔

''پیر پنجال پر بادل ہماری مفلسی پر رو رہے ہیں جلد ہی کالا دیو پر آ کر بھی ہمارے لیے آنسو بہائیں گے۔ میرے بھائی بند پچھلی جنگ میں تتر بتر ہو گئے۔ بہن تو انھیں یاد بھی نہیں ہوگی جو اپنے مفلس خاوند کے ساتھ یہاں رہ گئی۔ وہ بھی مر گیا۔ چھوٹی بہن زندہ ہوتی تو اس

وقت سہیلی اور سنگتی ہوتی۔ موت اور جدائی پہلے ہمیں ہی ملتی ہے۔'' ترچھی آنکھوں والی فضلاں ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ وہ کچھ دیر پہلے خانقاہ میں گپ لڑانے آ گئی تھی۔ اسے دوپہر میں روٹی ملنے کی بھی امید تھی۔

وہ برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ نوراں کوٹھری میں چارپائی پر پڑی تھی اور شاداں چولھے میں آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بادلوں کے رونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ آنسو بہا کر چلے جانے ہی کے لیے آتے ہیں۔'' نوراں نے جواب دیا۔

''جنگل سے ڈھیر سی سوکھی لکڑیاں چولھے میں جلانے کے لیے منگالو۔ ورنہ بارش کے بعد جنگل میں اتنی پھسلن ہو جائے گی کہ وہاں چلنا مشکل ہو جائے گا۔'' فضلاں نے کچھ سوچتے ہوئے رائے دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے تھی۔

''تو ٹھیک کہتی ہے۔ شاداں کھانا پکا لے گی پھر میں اسے مگن شاہ کے ساتھ جانے کے لیے کہوں گی۔ شاداں تو نے سن لیا فضلاں کیا کہہ رہی ہے؟''

''ہاں ماں...... لیکن میں گاؤں کی عورتوں کے ساتھ جاؤں گی۔ اگر صرف مگن شاہ ساتھ ہوا اور کوئی مصیبت آ گئی تو وہ اللہ اکبر کے نعرے لگانا شروع کر دے گا۔ کچھ اور نہیں کر پائے گا۔'' شاداں نے مگن شاہ کا مذاق اڑایا اور چولھے میں جو ہلکی آگ تھی اس پر پھونکیں مارنے لگی۔

نوراں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ مسکرا کر رہ گئی۔ برآمدے میں مگن شاہ سبھوں سے بے نیاز جھاڑو دینے میں مصروف تھا۔ اچانک چھت پر سے بہت بڑا مکڑا شاداں کے پاس گرا۔ اس کی لمبی ٹانگیں اور بڑے سے کالے جسم پر روئیں دیکھ کر شاداں ڈر سے چیخ مار کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ماں۔ بچا مجھے۔''

نوراں گھبرائی ہوئی کوٹھری سے نکل آئی۔ اس نے دیکھا کہ شاداں دیوار سے چپکی ہے۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا ہے اور اس کے لب بھنچے ہیں۔ اس کا دوپٹہ زمین پر پڑا تھا۔ مگن شاہ اسے اس حال میں دیکھ کر قہقہہ لگانے لگا۔ ایک معمولی کیڑے سے شاداں کو اس طرح ڈرتے دیکھ کر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''مکڑا۔ مکڑا۔'' مگن شاہ نے کیڑے کی جانب اشارہ کیا جو اب رینگتا ہوا برآمدے کے

ستون پر چڑھ رہا تھا۔ نوراں مسکراتی ہوئی واپس اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

شاداں کو اپنی حرکت پر ندامت سی ہو رہی تھی۔ اسے اس طرح کے کیڑے مکوڑے اور سانپ بچھو سے بہت خوف آتا تھا۔

''تو دلیر سپاہی ہے جبھی تیرے ڈر سے مکڑا بھاگ گیا۔'' شاداں اپنے دوپٹے کو زمین سے اٹھا کر اپنے سر پر ڈالتے ہوئے بولی۔ مگن شاہ کے سر پر اس وقت فوجیوں والی ایک بوسیدہ خاکی ٹوپی تھی اور اس نے ایک پھٹا ہوا نیکر بھی چڑھایا ہوا تھا۔ یہ لباس کسی سپاہی نے اس پر ترس کھا کر دے دیا تھا۔

''سپاہی۔'' مگن شاہ نے اپنا سینہ پھلا کر کہا۔

''بڑا سپاہی بنا پھرتا ہے۔ میں نے تجھے کسی دشمن کا پیچھا کرتے نہیں دیکھا۔ کیسا فوجی ہے تو؟''

''دشمن فوجی؟'' مگن شاہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ آگئی تھی اور وہ سوالیہ نگاہوں سے شاداں کو تک رہا تھا۔

''ہاں...... ہمارا دشمن۔''

''ہمارا دشمن؟'' اب مگن شاہ کے چہرے پر درد بھری بے بسی آگئی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ خیالات اور الفاظ اس کے ذہن میں بگولے کی طرح چکر لگا رہے تھے۔ لیکن ان کا اظہار یا انھیں بولنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''اللہ...... تو کیوں نہیں کچھ سمجھتا؟''

''شاداں۔ یہ سچا بندہ ہے۔ اسے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔'' فضلاں عقیدت بھری نگاہوں سے مگن شاہ کو تکتے ہوئے بولی۔

''بندہ۔ اللہ اکبر۔'' اچانک مگن شاہ کا چہرہ روشن ہو گیا اور اس نے نعرہ بلند کیا۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔

''ہاں ہاں۔ وہ بہت بڑا ہے۔ تجھ پر اس کی بڑائی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تو دو سال کا بچہ رہ گیا۔ اگر تو سچ مچ پیر ہے تو دکھا کوئی کرامات۔'' شاداں نے بڑی ادا سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

''کرامات...... کرامات۔'' مگن شاہ نے اس کی نقل کرتے ہوئے خوشدلی سے جواب دیا۔

''میرا سر کھانا بند کر...... لے...... روٹی کھا۔'' یہ بولتے ہوئے شاداں نے اس کی جانب روٹی اور چھاچھ بڑھا دیا۔

"ماں...... میں تیرے لئے کھانا لے آؤں۔"

"ہاں...... اپنی اور فضلاں کے لئے روٹیاں بھی ساتھ لیتی آ۔ سب ساتھ مل کر کھالیں گے۔" نوراں نے کوٹھری کے اندر سے جواب دیا۔

جب گاؤں کی عورتیں اور بچے جنگل کی جانب لکڑیاں لانے کے لیے جانے لگے تو شاداں بھی ان کے ساتھ ہولی۔ نوراں کے حکم پر مگن شاہ نے کلہاڑی اٹھالی اور ان سب کے ساتھ چل دیا۔ سب کے سب اس چراگاہ پر سے گزرے جس پر پگڈنڈیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ پھر جو پہاڑی آئی اس پر چڑھ کر دوسرے جانب جنگل میں پہنچے۔ وہاں ایک کھلی جگہ میں چیڑھ کا ایک لحیم شحیم خشک درخت پڑا تھا۔ چڑھائی پر چڑھنے کی وجہ سے شاداں تھک گئی تھی۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گئی۔ مگن شاہ سیدھا درخت کے پاس گیا اور اس پر پوری طاقت سے وار کرنے لگا۔ کلہاڑی ہوا میں بلند ہوتی اور بجلی کی طرح درخت پر زور سے گرتی۔ جلد ہی اس کے چہرے پر سے وہ معصومیت رخصت ہوگئی۔ وہاں ایک وحشیانہ چمک تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے بڑی ہوگئی تھیں اور بازوؤں کے پٹھے نمایاں ہوگئے تھے۔ گردن کی نسیں بھی ابھر آئی تھیں۔ مگن شاہ جیسے اپنے کسی دشمن سے نبرد آزما تھا۔ اس کی کنپٹیوں، چھاتی اور پشت پر پسینے کی دھار پگھلے ہوئے لوہے کی طرح بہہ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے ادھر ادھر جو خشک ٹہنیاں گری ہوئی تھیں، انھیں اٹھا کر جمع کرنے لگے۔ مگن شاہ کے پاس جب لکڑیوں کا ڈھیر ہو گیا تو انھیں اُٹھا کر وہ شاداں کے پاس آیا اور اس چادر پر ڈال دیا جسے اس نے زمین پر بچھایا ہوا تھا۔ جب وہ جھک رہا تھا تو اس کا شانہ شاداں کی ران سے ٹکرایا۔ لیکن وہ ہٹی نہیں۔ اس کے اور گاؤں والیوں کے درمیان جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ان کی نگاہیں اس کی جانب نہیں تھیں۔ مگن شاہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے بجھی آواز میں بے معنی الفاظ نکلے اور ساتھ ہی اس نے اپنی ننھی داڑھی سے شاداں کے چکنے رخسار کو سہلایا۔ شاداں نے شرما کر اپنے چہرے کو گھٹنوں کے درمیان چھپا لیا۔ مگن شاہ نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور زمین پر لٹا دیا۔ شاداں کے جسم سے جیسے ساری طاقت سلب ہوگئی۔ گاؤں کے افراد اس کی نگاہوں سے گم ہو گئے۔ جس انسان کے بازوؤں میں وہ بے بس تھی، جس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں اس کے لیے طلب تھی۔ وہ شاداں کو ایک ایسا فقیر لگا جس میں پراسرار طاقت تھی۔

ایسی طاقت جس نے ابھی ایک درخت کا برادہ بنا دیا تھا، جو پہاڑ سے ٹکر لے سکتی تھی۔ کسی انجانی حس نے مگن شاہ کے منہ کو شاداں کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ ایک سسکی کے ساتھ کھل گئے اور شاداں کی زبان مگن شاہ کی زبان سے ٹکرائی۔ مگن شاہ نے اس کے پستان کو سختی سے ملا۔ جو اذیت شاداں کو ہوئی اس نے اسے بیدار کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ جو ہونے جا رہا ہے وہ بہت بُرا ہے۔ شاداں نے مگن شاہ کی آغوش سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ کشمکش میں اس کی نگاہ اچانک دو بچھوؤں پر پڑی جو جھاڑی سے نکل کر اپنے ڈنک اٹھائے ان کی جانب آ رہے تھے۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ واقعی مگن شاہ ساحر تھا۔ جو لذت اور عذاب، خوشی اور اذیت دینے کا سحر جانتا تھا۔ وہ بچھو اسی کے ان کہے حکم سے نکل آئے تھے۔ مگن شاہ کی نگاہ بھی ان بچھوؤں پر پڑی۔ ماضی میں وہ کیڑے اسے ڈنک مار چکے تھے۔ جس کی وجہ سے جو بے انتہا تکلیف ہوئی تھی وہ اسے یاد تھی۔ اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ شاداں نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور بھاگ کر گاؤں کی عورتوں کے پاس چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے مگن شاہ بھی سہما ہوا آ گیا۔ اس کے جذبات کی آگ کو خوف نے جس طرح اچانک سرد کر دیا تھا، ان کی وجہ سے وہ پریشان بھی تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت جسے سانپ بچھوؤں سے اتنا خوف نہیں تھا، وہ ان لکڑیوں کے ڈھیر کو لے آئی، جسے مگن شاہ نے کاٹا تھا۔

جب گاؤں کی عورتیں واپس آنے لگیں تو وہ آپس میں ان لوگوں کی بات کرنے لگیں جو سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے سے مر گئے تھے۔ شاداں ان سب کے سامنے تیز چل رہی تھی۔ جو کچھ ابھی اس کے ساتھ ہوا وہ بھی کچھ غیر متوقع اور اچانک تھا۔ جس کی بابت اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مگن شاہ ایک ہاتھ سے لکڑی کے ڈھیر کو اپنی پیٹھ پر سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی لئے سبھوں کے پیچھے تھا۔ اس کی نگاہ بھوکے بھیڑیئے کی طرح بار بار شاداں کی جانب اٹھتی تھی۔ خانقاہ پہنچنے کے بعد شاداں نے لکڑیون کو ایک جانب پھینکا اور سیدھی ماں کے پاس کوٹھری میں گئی۔ جو ابھی تک بستر پر پڑی آرام کر رہی تھی۔

''لکڑیاں لے آئی؟'' نوراں نے پوچھا۔

''وہاں بچھو کاٹنے کو دوڑے۔'' شاداں نے اپنی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بچھو......؟ وہ ہر جگہ ہیں۔ ان سے بھاگ کر کہاں کوئی جا سکتا ہے۔'' نوراں نے آنکھیں

پوری طرح کھول دی تھیں۔ شاداں اس سے سٹی بیٹھی تھی اور اس کی پشت اس کی جانب تھی۔ اس کے چہرے پر گناہ سرزد ہو جانے کی وجہ سے جو گھبراہٹ تھی اسے وہ ماں سے چھپانا چاہتی تھی۔

"جا...... بکریوں کا دودھ دوھ لے۔"

"ماں...... وہ میدان میں ہیں۔ میں تھک گئی ہوں وہاں نہیں جا سکتی۔" شاداں کو مگن شاہ سے مڈبھیڑ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ جو اس کے ساتھ ہوا وہ غلط تھا پھر بھی شاداں کے دل میں مگن شاہ کے لئے نرم سا احساس آ گیا تھا۔

"لیکن دودھ تو دوہنا ہے۔ ورنہ چھاچھ کیسے نکالیں گے۔ تجھے صبح ہی اس کام کو کر دینا تھا۔"

"صبح یاد نہیں رہا۔ دوپہر بیلا تو نے لکڑیاں لانے بھیج دیا۔"

"ٹھیک ہے۔ تو آرام کر لے۔ میں ہی جاتی ہوں۔" یہ بولتی ہوئی نوراں اپنی کمر پر ہاتھ رکھتی ہوئی اٹھی اور باہر نکلی۔ ابھی وہ چند قدم ہی گئی ہو گی کہ اس نے مگن شاہ کو اس کوٹھری کی جانب جاتے دیکھا جہاں شاداں تھی۔

اس وقت نوراں کو وہ مختلف انسان نظر آیا۔ نوراں کے قدم رک گئے۔ اس وقت وہ بے ضرر احمق نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈراؤنی وحشت تھی اور اس کی ننھی آنکھیں جن میں ہر وقت مسرت چھلکتی رہتی تھی، وہ سنجیدہ تھیں اور ان میں عجیب سی چمک تھی۔

"مگن شاہ...... تو کہاں جا رہا ہے؟"

لیکن مگن شاہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ بڑھتا ہی گیا۔

"شاداں...... دروازہ بند کر لے اور زنجیر چڑھا دے...... جلد۔" نوراں چیخی اور بھاگتی ہوئی آئی۔ مگن شاہ نے اس نے راستہ روک لیا۔

"مگن شاہ تو میری لاش پر چڑھ کر اس کوٹھری کے اندر جا سکے گا۔ ایک قدم بھی تو نے آگے بڑھایا تو میں تیری آنکھیں نکال دوں گی۔" نوراں پھنکاری۔ اس کے سر کے بال چہرے پر بکھر آئے تھے اور اس کی سرخ آنکھیں مگن شاہ پر گڑی تھیں۔ نوراں کے نوکیلے ناخنوں سے بھری انگلیاں مگن شاہ کی آنکھوں کے قریب آ گئی تھیں۔ نوراں یقیناً اپنی جان پر کھیل جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

مگن شاہ نے آنکھیں جھپکائیں اور پیچھے ہٹ گیا۔ شاداں نے لرزتے ہاتھوں سے کوٹھری کے واحد دروازے کی زنجیر چڑھا دی تھی، اور باہر نوراں تنی کھڑی تھی۔ دانت بھینچے ہوئے اور

مٹھیاں کسی ہوئی۔ وہ ایک شیرنی کی طرح لڑنے کے لئے تیار تھی۔ نفرت اور غصے سے بھری نگاہیں اب بھی مگن شاہ پر گڑی تھیں۔ واجد بھی کبھی اسی طرح طیش میں نظر آتا تھا۔ مگن شاہ کو اپنی غلطی کا احساس سا ہوا۔ وہ چپکا سا برآمدے میں بیٹھ گیا۔

''اٹھ یہاں سے...... جا میدان سے بکریاں لے آ۔'' نوراں نے میدان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

مگن شاہ نے غصیلی نگاہیں اس پر ڈالیں اور میدان کی جانب چل دیا۔ جس خطرے میں نوراں اور شاداں اب تھیں اس کا احساس نوراں کو ہوا۔ اب مگن شاہ وہ مرد ہو گیا تھا جسے شہوانی جذبات مضطرب رکھتے ہیں۔ اگر اسے ذرا بھی موقع ملا تو وہ شاداں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا لے گا۔ خانقاہ میں ان کے تحفظ کو کوئی بھی نہیں تھا، اور وہ دن رات اپنی بیٹی کی رکھوالی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے خیال آیا کہ مکھیا حسن داد کو بلا کر مشورہ کرے۔ لیکن ممکن ہے اسے یقین نہ آئے۔ چونکہ وہ مگن شاہ کو بھی پیر سمجھتا تھا۔ رحمو کی رائے لینا بیکار تھا۔ وہ اسے اور شاداں کو گاؤں میں آ کر رہنے کی نصیحت کرے گا۔ رحمو کے جو ارادے اس کی جانب تھے، انھیں وہ سمجھ چکی تھی۔ پنجنی آتے ہوئے ٹرک میں فوجی نے جس طرح اس کے ساتھ دست درازی کی تھی وہ نوراں کو یاد تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

''شاداں...... دروازہ کھول۔'' نوراں دروازے کو دھکا دیتے ہوئے بولی۔

کوٹھری میں جو تاریکی تھی اس کی وجہ سے نوراں اپنی بیٹی کے چہرے پر جذبات کی ہلچل نہیں دیکھ سکی۔

''جب تو جنگل گئی ہوئی تھی تو کیا مگن شاہ نے تیرے ساتھ کوئی برائی کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''نہیں تو...... کیوں؟'' شاداں نے جواب دیا۔

''ہمیں چوکنا رہنا چاہئے۔ مگن شاہ اتنا نادان نہیں ہے جتنا وہ نظر آتا ہے۔''

''ہاں...... وہ نادان نہیں ہے۔'' شاداں اپنی ماں سے نظر چراتے ہوئے دھیمے سے بولی۔

شاداں چاہتی تھی کہ ماں اسے تنہا چھوڑ دے۔ تاکہ وہ اس لطف اور خوف کی بابت سوچ سکے جس کا آج اسے تجربہ ہوا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس وقت مگن شاہ کہاں تھا۔ اس کی جس طاقت کا اسے احساس ہوا تھا اس میں مقناطیسی کشش تھی۔ شاداں کی خواہش ہو رہی تھی کہ اس کے پاس جائے۔ اس کے قریب ہو۔ کہیں بھی...... کسی درخت کے نیچے یا کسی غار میں یا کھلے

آسمان کے نیچے کسی میدان میں جہاں لمبی گھانس ان دونوں کو دنیا کی نظروں سے چھپالے۔ وہ آزاد ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس وقت وہی کرنا چاہ رہی تھی جو اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ماں کی موجودگی اسے بُری لگی۔ لیکن ماں سے بغاوت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

نوراں نے اس دن شاداں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ مسلسل اس کے پاس رہی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ مگن شاہ کسی نہ کسی بہانے شاداں کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نوراں اسے دھتکار دیتی۔ کبھی اسے مارنے کے لئے ہاتھ بھی اٹھا لیتی۔ نوراں ایک عجیب سے انتشار میں مبتلا تھی۔ گھبراہٹ میں کبھی پانی پیتی یا کبھی سر کھجانے لگتی۔ اس کی نگاہ اس چھری پر بھی گئی جو چولھے کے پاس پڑی تھی لیکن اس نے لرز کر نگاہیں ہٹا لیں۔

جب رات آئی تو کچھ زیادہ روٹیاں شاداں، مگن شاہ کو دینے لگی۔ نوراں چیخی۔

''تو اس بھوکے کتے کو بدہضمی سے مارنا چاہتی ہے کیا؟'' نوراں کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر اس نے شاداں پر کڑی نگرانی نہیں رکھی تو وہ خود کو یقیناً مگن شاہ کے حوالے کر دے گی۔ عورتیں کسی کی جانب بھی کھنچ سکتی ہیں اس کا علم نوراں کو عورت ہونے کے ناطے تھا۔ چولھے میں جلتی آگ کی روشنی میں اسے شاداں کا چہرہ متبسم نظر آیا۔ اس پر ماں کے خوف اور اضطراب کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسری دنیا میں تھی۔ ایسی دنیا جہاں کوئی ڈر پاس نہیں آتا اور سوائے اپنے آپ کے کسی اور کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ایک عجیب سی بے بسی نوراں پر آ گئی۔ اس سے کچھ کھایا نہیں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اور ماتھے پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں مبتلا خاموش بیٹھی رہی۔

مگن شاہ کے سامنے کھانا رکھا تھا۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ جلد ہی وہ جو کی روٹیاں اور ساگ کے بڑے بڑے لقمے بنا کر پپڑ پپڑ کھانے لگا۔

اس رات شاداں کو ایک عجیب سا خواب آیا۔ اس نے دیکھا کہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور وہ چراگاہ میں کھڑی ہے۔ مگن شاہ سفید براق لباس میں ملبوس ایک سیاہ گھوڑے پر بیٹھا اسے اس کے اردگرد بھگا رہا ہے...... اور گاؤں والے، بچے اور بوڑھے، عورت و مرد، سبھی زور زور سے تالیاں بجا کر خوشی سے چیخ رہے ہیں۔ مگن شاہ جب بھی اس کے پاس سے گزرتا تو ایک سفید پر سے کبھی اس کے رخسار کو چھوتا اور کبھی گردن کو۔ جس کی وجہ سے اسی لذت کا احساس ہوتا جس سے وہ دن کے وقت آشنا ہوئی تھی۔ اچانک مگن شاہ گھوڑے سمیت اس پر کود گیا۔ شاداں کی آنکھ کھل گئی۔ اس عجیب و غریب خواب سے اس نے خود کو خوف سے لرزتا ہوا محسوس کیا۔ اس کا

جسم پسینے سے نم تھا۔ شاداں کو محسوس ہوا کہ ماں اس کے قریب نہیں ہے۔ اس نے اس جگہ کو ٹٹولا۔ نوراں واقعی چارپائی پر نہیں تھی۔ ''ماں کہاں ہے؟'' شاداں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ باہر سے عورت اور مرد کی گھٹی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاداں کو بڑی حیرت ہوئی۔ حجرے میں گہری تاریکی تھی۔ وہ اٹھی اور ٹٹولتی ہوئی دروازے پر جا کر اسے کھولا۔ برآمدے میں نوراں اور مگن شاہ چارپائی پر برہنہ ایک دوسرے سے لپٹے تھے۔ مگن شاہ جذبات کی شدت سے کراہ رہا تھا اور نوراں نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں اسے کسا ہوا تھا۔ شاداں کو محسوس ہوا کہ کسی نے سلگتی لکڑی اس کی آنکھ میں پیوست کردی ہے۔ نفرت اور گھناؤنے پن کے احساس سے لڑکھڑاتی ہوئی وہ واپس آئی اور اپنی چارپائی پر گر کر رونے لگی۔ اسے بچپن کے وہ دن یاد آنے لگے۔ جب مرد چھپتے چھپاتے اس کی ماں کے پاس آتے تھے اور وہ اسے بتاتی تھی کہ وہ شاداں کے ماموں یا چچا تھے۔ جب وہ سو جاتی تو کبھی کبھی اسے کچھ شور سنائی دیا کرتا تھا۔ ان مردوں کا آنا جانا اس وقت سے بند ہو گیا جب اس کی ماں نے اس کے سوتیلے باپ سے شادی رچالی۔ شاداں کو کبھی کبھی شبہ ہوا تھا کہ اس کی ماں اچھی عورت نہیں ہے۔ لیکن آج رات اسے پختہ ثبوت مل گیا۔ اس کی ماں نے آج اسے بھی ذلیل کر دیا تھا۔ شاداں کے اندر کوئی قوت آج کی رات فنا کر دی گئی تھی۔ شاداں کی آنکھوں سے جلتے ہوئے آنسو گرنے لگے۔ وہ تکیہ میں منہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔ وہ دیر تک روتی رہی اور باہر دیر تک وہی کھیل ہوتا رہا۔ ہر بار اس کی شدت میں کمی آئی۔ مگن شاہ اب لذت کی خوشی سے کراہ نہیں رہا تھا بلکہ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ جیسے اس کے جسم کی ساری تندی جذب کرنے کے بعد کوئی اس کے جسم کو سزا دے رہا تھا۔

جب نوراں حجرے میں واپس آئی تو شاداں نے خود کو گہری نیند میں سوتا بنا لیا۔ وہ سکڑ کر چارپائی پر ایک جانب ہو گئی تھی تاکہ اس کا جسم ماں کے جسم سے مس بھی نہ ہو۔ صبح نوراں پہلے اٹھی۔ سورج نکل آیا تھا لیکن شاداں بے خبر سوئی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنے چہرے کو دوپٹے سے چھپایا ہوا تھا۔ حجرے میں خنکی سی تھی۔ نوراں نے شاداں پر چادر ڈالی اور اسے اچھی طرح ڈھکنے کی کوشش کی۔

''چھوڑ دے مجھے۔'' شاداں نے دھتکار دیا۔ وہ باہر نہیں نکلی اور دیر تک چارپائی پر پڑی رہی۔ چولھا سرد تھا اور بھیڑ بکریوں کو بھی ابھی تک ان کی کوٹھریوں سے نہیں نکالا گیا تھا۔ نوراں حجرے کے اندر گئی۔ لیکن اس کے دل میں نہ ندامت تھی اور نہ ہی غلطی کا احساس۔

"بے عقل لڑکی اٹھ۔ اگر تو نے خود کو بچایا نہیں تو بھیڑئے تجھے نوچ کھائیں گے اور تیرا خاوند بھی تجھے بھوکے کتوں کے سامنے پھینک دے گا۔" نوراں نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا۔ نوراں کے لہجے میں غصہ اور کڑواہٹ تھی۔

شاداں نے آنکھیں کھولیں اور جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اپنی پشت ماں کی جانب کر دی۔

"نہیں اٹھے گی تو میں تھپڑ تجھے ماروں گی۔ تیری حفاظت کے لئے تیری ماں ہر دم تیرے ساتھ نہیں ہو گی۔" وہ جان گئی تھی کہ بیٹی کو رات کے واقعے کا پتہ چل گیا ہے۔ لیکن نوراں کو نہ ندامت تھی اور نہ ہی غلطی کا احساس۔ مگن شاہ ان ناپسندیدہ مردوں کی طرح تھا جن کے ساتھ وہ ماضی میں اپنے جسم کا سودا کر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر تلخی تھی اور کچھ غصہ بھی۔ وہ کچھ دیر تک اپنی کمر پر ہاتھ رکھے شاداں کے اٹھنے کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کار بیٹی اٹھی اور باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد شاداں اپنے روز کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ مگن شاہ برآمدے میں اپنی چارپائی پر پسرا کسی شرابی کی طرح نشہ میں دھت خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بالوں سے بھرے اس کے سینہ پر تھا اور بے خبری میں گردن ایک جانب ڈھلکی تھی۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑیں تو اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ چولھے کے قریب بیٹھی شاداں پر اس کی نگاہ پڑی۔ جس کا سبز دوپٹہ اس کی گردن کے گرد جھول رہا تھا اور ہاتھ جب بھی حرکت کرتے تو کلائی کی چوڑیاں کھنک اٹھتیں۔ ایک ہلکا سا تبسم مگن شاہ کے چہرے پر آ گیا۔ رات کی تاریکی اور جذبات کی تندی میں جس طرح وہ اندھا ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے اس نے سمجھا کہ شاداں اس کے پاس آئی اور اپنی محبت سے سرشار کر کے چلی گئی اور ایک ایسا تسکین دے گئی جس کی مسرت کو بھلانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے ایک عجیب سی نرمی اور اپنا پن شاداں کے لئے محسوس کیا۔ اس کے قریب جانے اور بیٹھنے کی خواہش اسے ہوئی۔ مگن شاہ کا دل چاہا اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے سینے سے لگا لے۔ مسکراتا ہوا مگن شاہ اٹھا اور ہاتھ پیروں پر بھیڑ کی طرح چلتا ہوا وہ شاداں کے پاس گیا اور نرمی سے اس کے شانے کو چھوا۔

"ہٹ جا گندہ سور۔" شاداں نفرت سے چیخی اور چولھے میں سلگتی لکڑی، جس سے شعلہ اٹھ رہا تھا، اس سے اسے مارا۔

مگن شاہ آگ دیکھ کر ڈر سے اچھلا پھر بھی سلگتی لکڑی اس کے برہنہ بازو پر لگی اور وہاں سرخ نشان ابھر آیا۔ درد کی شدت سے مگن شاہ چیختا ہوا بھاگ کر دور کھڑا ہو گیا۔

"اب کتا نہیں کاٹے گا۔ اس کے دانت گر چکے ہیں۔" نوراں متنفر لہجے میں بولی۔
رات کے واقعے سے ماں کے لئے نفرت، مگن شاہ کے خلاف غصہ اور تنفر، ان سب سے شاداں کے ذہن میں ایک ہلچل مچی تھی۔ ایک بیوقوف انسان کو جلتی ہوئی لکڑی سے مارنے کا رنج بھی اسے ہو رہا تھا۔ شاداں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ وہ بھاگتی ہوئی حجرے میں جا کر چارپائی پر گر گئی اور منہ کو تکیہ میں چھپا کر آنسو بہانے لگی۔
"شاہ جی...... شاہ جی۔ تم مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ۔ مجھے شاہ جی چاہئے۔ انھیں بھیج دے میرے پاس۔"
وہ سسکیاں لے رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے تکیہ کو زور سے پکڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ شاہ جی تھا۔ اس کا سہارا اور اس وقت اس کی قوت بھی۔
نوراں نے کھانا بنایا اور شاداں کو آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے رونے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ "جوانی کی نادانی اسے برباد کردے، اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ غم کھائے اور بھوکی رہے۔" نوراں نے سوچا۔ اپنی بابت اسے نہ کوئی افسوس تھا اور نہ ہی اسے کسی گناہ کا احساس تھا۔ مدت ہوئی وہ اپنا آپ لٹا چکی تھی۔ اس کی خودداری، عورت کی وہ عزت جسے عورت ہی سمجھ سکتی ہے، وہ سبھی کبھی کی فنا ہو چکی تھیں۔ کسی طرح زندہ رہنا اور اپنی بیٹی کو تحفظ دینا، یہی اب اس کی زندگی تھی۔ یہ دنیا بری، بہت بری تھی۔ اس میں برا بن کر ہی زندہ رہا جا سکتا ہے۔ نوراں کبھی کا خود کو یقین دلا چکی تھی۔ خدا بے بس ہے۔ وہ بھی غریبوں کی مدد کو نہیں آ سکتا۔ نوراں یہ بھی جان چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ روٹیاں کھاتی گئی، اور یہی سارے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ نوراں نے مڑ کر دیکھا۔ مگن شاہ سہما ہوا کھڑا تھا۔ 'اللہ اکبر......!' نیچی آواز میں وہ بولا اور روٹیوں کی جانب اشارہ کیا۔ نوراں نے روٹیاں اور چھاچھ اس کی جانب بڑھا دیں۔ وہ اداسی سے انھیں کھانے لگا۔ اس نے بھی شاداں کے رونے کی آواز سنی۔ اس کی نگاہ حجرے کے کھلے دروازے کی جانب گئی۔ چارپائی پر اوندھی گری شاداں اسے نظر آئی۔ لیکن اس کے قریب جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ آگ کا خوف اور سلگتی لکڑی سے جو زخم اس کے بازو پر ہو گیا تھا، ان کی وجہ سے مگن شاہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کا غم اور شدید ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑانے لگا۔
نوراں نے سارا دن اسی طرح گزارا جس کی وہ عادی تھی۔ شاداں نے کچھ دیر کے بعد

چند نوالے نگل لئے۔ نوراں نے اسے پل بھر کے لئے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ شاداں جس خطرے میں گھری تھی اس کا اسے احساس نہیں تھا۔ مگن شاہ دیکھنے میں بیوقوف سا معصوم انسان تھا۔ لیکن اس میں بلا کی طاقت تھی اور جوانی کا وہ جوش تھا جو دوسروں کو نظر نہیں آتا تھا۔ یہ جوش اور یہ طاقت شاداں کو تباہ کر سکتی تھی۔ لیکن وہ اس سے بے خبر تھی۔ نوراں کو اس وجہ سے شاداں پر بار بار غصہ آتا رہا۔

جب رات آئی اور تاروں کو نیندسی آنے لگی۔ بوڑھا چاند کالا دیو کی چوٹی کے اوپر اور پرے تھک سا گیا۔ تو جنگلوں سے سائے نکل کر پھیل گئے اور دور بہت دور سے جانوروں کی بیتاب چیخنے کی آوازیں آنے لگیں، جیسے کسی کو بلا رہے ہوں۔ نوراں چارپائی پر سے اٹھی اور مگن شاہ کے پاس چلی گئی۔ کڑیل مردوں کی ہوس کو مٹانے کے جتنے حربے اور حرفتیں وہ جانتی تھی سب اس نے مگن شاہ پر بار بار اس طرح آزمائے کہ مگن شاہ خشک ندی بن گیا۔

۱۵

ہر رات کی طرح آج کی رات بھی واجد کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس کے زخمی پیر میں درد ہو رہا تھا۔ زخم سے بدبو جا چکی تھی اور وہ مندمل بھی ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس میں تکلیف تھی جو رات کے وقت کچھ زیادہ ہو جاتی تھی۔

واجد ہلکے سے کراہا اور اس نے مشکل سے کروٹ بدلی۔ وارڈ میں تاریکی تھی۔ جو لالٹین وہاں تھی اس کی لو لرز رہی تھی جیسے بجھنے والی ہو۔ واجد کی بے چینی پھر عود کر آئی جو اسے اکثر ہوتی تھی۔ جس کی وجہ صرف زخم کی تکلیف نہیں تھی۔ بلکہ وہ مجبوری بھی تھی جس کی وجہ سے نہ وہ اچھی طرح نماز پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ اس طرح مراقبے میں جا سکتا تھا جس کا وہ عادی تھا۔ واجد بزرگ تھا اور عام لوگوں سے دور اور چھپ کر رہنے کا عادی تھا۔ ہسپتال میں بھی وہ ڈاکٹر کو دو تین الفاظ میں اپنی حالت کی اطلاع دیتا اور پھر خاموش آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا۔ ہر روز ہی اسے اپنی بیوی کا خیال آتا جو تنہا رہ گئی تھی، اور نوراں بھی اس کے تصور میں آجاتی اور جیسے پوچھتی۔

''خیر سے ہو شاہ جی؟''

وہ ملنگ شاہ کی بابت بھی کبھی کبھی سوچتا۔ پتہ نہیں اسے کھانا اچھی طرح مل رہا ہے یا نہیں۔ جلد سے جلد بہتر ہو جانے کے لئے اس نے بہت ساری آئتیں پڑھیں اور دعائیں مانگیں۔ لیکن جتنی جلدی واجد شفا پانا چاہتا تھا وہ نہیں ہوا۔ اسے بارہا خیال آیا کہ اس کی دعائیں دوسروں کو اچھا کر دیتی تھیں لیکن اس کے معاملے میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے آخر کار خود کو سمجھا دیا کہ خدا کی خدائی کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اسے مولانا غیظ مرحوم کی بات بھی یاد آئی، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا کی بڑائی کو جاننے کے لئے کرب

و اذیت میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔

واجد نے مچھر دانی کا ایک کونہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ وارڈ میں فنائل کی مہک تھی۔ مریض اپنے بستروں پر سکڑے پڑے تھے۔ ایک دو نیند میں کراہ بھی رہے تھے۔ مرد نرس ایک اسٹول پر پیروں کو رکھے سو رہا تھا۔ گو وارڈ کے دروازے کھلے تھے پھر بھی ہلکی سی گرمی تھی۔ واجد کے چہرے کے قریب مچھر آ کر بھنبھنانے لگے۔ اس نے پردہ گرا دیا۔ اسے پتہ تھا کہ اب نیند نہیں آئے گی اور کچھ دیر بعد مرغوں کی بانگ ہسپتال کے کوارٹروں سے آئے گی اور قریب میں جو فوجی یونٹ تھی وہاں بگل بجے گا۔ اس وقت تک اسے کروٹیں لیتے رات کاٹنی ہوگی۔

''شاداں۔ شاداں۔'' بے اختیار سرگوشیوں میں واجد بولا۔ اس کی بابت جب وہ سوچنے لگا تو نوراں کی شکل بھی سامنے آ گئی۔ اکثر تاریکی میں شاداں پر نوراں کا اسے شبہ ہوا تھا۔ شاید اس نے نوراں ہی سے شادی کی تھی۔ جو ابھی حال ہی میں جوان ہوئی تھی۔ جب وہ خانقاہ سے چلی جائے گی جب بھی وہ اس کے پاس ہی ہوگی۔ واجد کو نوراں کی طلب تھی اور وہ اسے مل گئی۔ ''خدا رحم کر۔'' واجد نے دھیمے سے دعا مانگی اور گناہ سے بوجھل خیالات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کی۔

پھر اچانک ایک دن شفایاب ہو کر واجد تین سپاہیوں کی حفاظت میں اپنی خانقاہ پہنچ گیا۔ مگن شاہ اسے دیکھ کر 'اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا اس کی جانب دوڑا اور واجد سے لپٹ گیا۔ نوراں اور شاداں بھی خوش ہو گئیں اور انھوں نے اپنے دوپٹے کو سر پر کھینچ لیا۔

''خدا کا تجھ پر رحم ہو مگن شاہ۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''اللہ اکبر......ٹھیک......ٹھیک۔'' مگن شاہ نے جواب دیا۔

''ماں اور بیٹی تو خیریت سے ہیں؟'' واجد نے برآمدے پر چڑھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ہاں شاہ جی تہڈی دعا تھی اور رب کا کرم جس نے تمھیں چنگا کر دیا۔'' نوراں نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ کرم والا ہے۔'' اور اس دری پر بیٹھ گیا جسے شاداں نے برآمدے میں اس کے لئے بچھا دیا تھا۔ جو سپاہی واجد کے ساتھ آئے تھے وہ مارے احترام کے چند قدم دور کھڑے تھے۔ واجد کی نگاہ جب ان پر گئی تو نرمی سے اس نے شاداں کو حکم دیا۔

"انھیں لسی بنا کر دیدے۔"

شاداں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ سپاہیوں کو گلاس دینے لگی تو اپنے خاوند کو صحت یاب دیکھ کر مارے خوشی کے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سپاہیوں کے لب گلاس سے لگے تھے ان میں جو نوجوان تھا وہ واجد کی قسمت پر رشک کر رہا تھا جسے اتنی حسین بیوی ملی تھی۔ لسی ختم کرنے کے بعد باری باری سپاہی واجد کے پاس آئے اور احترام سے جھکے۔ واجد نے ان کی پشت پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر زیر لب دعائیں دیں۔ پھر سلام کر کے سب واپس چلے گئے۔

واجد کی واپسی کی خبر جلد ہی پہنچی اور آس پاس کے گاؤں میں پھیل گئی اور حاجت مند آنے لگے۔ ان کا پیر آ گیا تھا۔ اس ویرانے میں ان کا محافظ۔ جس کے خیر و برکت سے بلائیں دور رہتی تھیں اور جس کے سحر سے ملکن شاہ بھی ایک بزرگ بن رہا تھا۔ جو بھی آیا اس نے واجد کے پیروں کو چھو کر اپنے اور اپنے بچوں کے لئے دعائیں حاصل کی۔ جلد ہی خانقاہ کے سامنے اور اردگرد ایک ننھا سا ہجوم جمع ہو گیا۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"ٹبر کی قسمت اچھی تھی جبھی اس کا خاوند اتنی جلدی اچھا ہو گیا۔"

"پیر بادشاہ کو اتنی جلدی موت نہیں آتی۔"

"سو ڈیڑھ سو سال تک جینا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں۔" جو بھی اس طرح بولتا ساتھ ہی احترام سے بھری اس کی نگاہ واجد کی جانب بھی جاتی۔

واجد بہت خوش تھا۔ خانقاہ، اس کے سامنے مرغزار اور جنگل۔ ان سے پرے پہاڑی اور اس سے کچھ فاصلے پر کالا دیو اور یہ سارے لوگ جو اس پر فریفتہ تھے۔ یہی اس کی دنیا تھی۔ جہاں چاہت، اپنا پن اور آشنائی ہوا میں تحلیل ہو کر اسے تھپکیاں دیتی رہتیں اور اب تو اس دنیا میں اس کی بیوی شاداں بھی تھی۔ لیکن اس نے اپنی مسرت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ کی طرح چپ چپ سا رہا۔ دعاؤں کے جو الفاظ اس کے منہ سے نکلے وہ بھی کم کم اور وہ بھی اس طرح جیسے وہ سرگوشیوں میں کچھ بول رہا ہو۔ آج وہ زیادہ ہی دیر حجرے کے باہر رہا۔ شاداں کو وہ نیا انسان نظر آ رہا تھا۔ جس طرح لوگ اس کے خاوند کو تعظیم دے رہے تھے اس کی وجہ سے اسے اس اہمیت کا احساس ہوا جو اس نے پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ ماں کے ساتھ اتنی دور کا سفر کر کے ایسی عجیب و غریب جگہ پر پہنچنا اور ایک عجیب سے بزرگ سے ملنا جو اتنا کم بولتا تھا۔ اس کی بیوی بننا اور شادی کی رات اس کے شوہر کا آگ سے جلنا اور اس سے جدا ہو جانا اور اس کی

غیر موجودگی میں ایک احمق گونگے کے ساتھ مستی کرنا اور ماں کا ایسا گناہ کرنا جسے وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ سارے واقعات ہوا کے تیز جھونکے کی طرح اس کے سامنے سے گزر گئے تھے۔ لیکن آج اسے سکون سا آگیا تھا۔ جیسے وہ کسی تیز بہتی ندی میں غوطے کھاتی رہی تھی اور اس کے خاوند نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر نکال لیا تھا۔ نوراں نے اسے کسی کام کو کرنے کے لئے کہا۔ لیکن شاداں کی نفرت اس سے کم نہیں ہوئی تھی۔ شاداں نے ان سنی کر دی۔ لیکن نوراں نے برا نہیں منایا۔ سچ تو یہ تھا کہ آج وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اب شاداں کا خاوند یہاں موجود تھا۔ بیوی کی حفاظت اس کے ذمے تھی۔

جب رات آئی اور ہر سو تاریکی چھا گئی تو خانقاہ کے باسیوں نے کھانا کھایا اور عشا کی نماز ادا کی۔ واجد کو جو کی روٹی اور ساگ میں کچھ زیادہ ہی مزہ آیا۔ نوراں اور شاداں کی موجودگی کی وجہ سے اسے عجیب سی رونق کا احساس ہوا۔ کچھ دیر بعد جب چاند مہین بادل کا نقاب اوڑھے آسمان میں سرکنے لگا۔ تو حجرے سے واجد کی خوش الحان تلاوت بلند ہونے لگی۔ مسرت سے بھری اس آواز میں واجد کے دل کا سوز اور اس کا جذبہ پوری شدت سے متلاطم تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مالک کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جس نے اسے شفا دی تھی۔ جس نے اس کی اس طلب کو کسی حد تک بجھا دیا تھا جو نوراں کی یاد بن کر اسے مضطرب کر دیتی تھی۔

جب قرآن کی تلاوت ختم ہو گئی تو واجد نے محبت بھری نظروں سے شاداں کی جانب دیکھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اس نے واجد کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز ادا کی تھی۔ سرخ ڈوپٹے سے سر کو اچھی طرح ڈھانکے ہوئے، نگاہیں جھکائے اور سینہ پر ہاتھ باندھے اور کسی نیک کام کو کرنے کی وجہ سے پرسکون...... بہت ہی پرسکون......

نماز کے دوران وہ پورے انہماک سے اپنے خاوند کی طرح رکوع میں گئی، سجدہ کیا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ نماز کے دوران جو سورۃ واجد نے پڑھا، یا جو تلاوت اس نے کی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن جو الفاظ اس نے سنے، جس نغمگی کو اس نے محسوس کیا وہ بھی بہت متبرک تھے۔ کچھ اس لئے بھی چونکہ یہ سب اس کے خاوند کے منہ سے بلند ہوئے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں وہ دزدیدہ نگاہوں سے واجد کو دیکھتی رہی تھی۔ ایک آگ سی شاداں نے اپنے دل میں جلتی محسوس کی۔

تلاوت ختم کرنے کے بعد واجد نے قرآن کو جزدان میں سرکایا اور اسے دیوار میں ٹھکی

موٹی میخ میں لٹکا دیا۔ اس نے پگڑی اتار کر شاداں کو رکھنے کے لئے دی، لالٹین کی لو دھیمی کی اور جوتے اتار کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ شاداں سر جھکائے اس کے حکم کی منتظر کھڑی رہی۔ ایک خوف سا اس کے دل میں تھا جو تیز دھڑک رہا تھا۔ خاوند کے ساتھ پہلی رات کوئی خوشگوار نہیں گزری تھی اور آج بھی اسے اسی کا خطرہ تھا۔

''میرے پیر دبا۔'' گو واجد کے پاؤں نہیں دکھ رہے تھے پھر بھی اس نے نرمی سے حکم دیا۔

شاداں بہ خوشی خاوند کے پاؤں دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی گرمی، ان نرم ہاتھوں کا دباؤ۔ کبھی پیر کی انگلیوں پر، کبھی ٹخنے پر اور کبھی پھلیوں پر، واجد کو بے پناہ خوشی دے رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی بیوی کی صحت، توانائی اور ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں مانگیں۔

''میں تجھے قرآن پڑھنا سکھاؤں گا اور تجھے آئتیں بھی یاد کرنی پڑیں گی۔ کرے گی نا۔''

''ہاں۔'' شاداں نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور پیر دبانے مصروف رہی۔ خاوند کے پیر کی سخت ہڈیوں سے اسے توانائی مل رہی تھی۔ کتنا مضبوط ہے میرا خاوند وہ مجھے ہر بلا سے محفوظ رکھے گا۔ شاداں نے سوچا۔ اس کا دل چاہا کہ واجد کے پیروں کو اپنے سینے سے لگا لے اور کہے اب تم جہاں بھی جاؤ گے، میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میلوں میل کا سفر کروں گی۔ تمہارے تھکے پیروں کو دھوؤنگی اور دباؤں گی۔ تمہارے سر کو اپنی گود میں رکھ کر پہروں تمہاری آنکھوں کو تکتی رہوں گی۔ لیکن شاداں سے کچھ بولا نہیں گیا۔

''آ...... میرے پاس آ کر لیٹ جا۔''

شاداں فرمانبرداری سے واجد کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس کا چہرہ متبسم تھا۔ واجد کے لہجے کی نرمی نے اس کے خوف کو بہت حد تک دور کر دیا تھا۔ واجد کو شاداں کے ملبوس کے اندر اس کے نرم جسم کا احساس ہوا اور اس سے مکھن کی بو اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاداں دودھ سے مکھن نکالنے میں مصروف رہی تھی۔ اس لئے اس کے ہاتھوں اور کپڑوں میں اس کی بو بس گئی تھی۔

''تو یہاں خوش رہے گی۔ بہت خوش...... کبھی۔'' واجد نے بیقراری سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

حجرے کے ساتھ کی کوٹھری میں نوراں لیٹی تھی۔ وہ تلاوت سنتی رہی تھی۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جب اسے نماز پڑھنے کی ہدایت ملی تو اس نے پڑھ لی اور خدا سے پرخلوص دعا مانگی۔ اپنی بیٹی کی دائمی خوشی کے لئے۔ ہر اس آفت سے محفوظ رہنے کے لئے جو نوراں کا مقدر

بنا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ خانقاہ سے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں اور وہ اب شاداں سے پھر کبھی نہیں مل سکے گی۔ اگر خدا چاہتا تو اس کی زندگی مختلف ہو سکتی تھی۔ لیکن اب شکایت کرنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب جو زندگی اسے گزارنی ہے وہ آنسو بہاتے گزر جائے گی تو ٹھیک ہے ایسا ہی ہو۔ جب وہ اونگھنے لگی تو اسے برآمدے سے مگن شاہ کے بے معنی بڑبڑانے کی آواز آنے لگی۔ جس وقت اس نے واجد اور شاداں کو حجرے میں بند ہوتے دیکھا اسی وقت سے اس پر ایک عجیب سی وحشت اور پریشانی چھانے لگی تھی اور اس کے چہرے پر غصہ آ گیا تھا۔

''اب سوکھی مٹی سے پیاس بجھا۔'' نوراں نفرت سے بڑبڑاتی ہوئی سو گئی۔

اس رات کے بعد جو چند دن آئے وہ شاداں کو بے پناہ خوشی سے بھرے محسوس ہوئے۔ اس کا خاوند دن میں اس سے زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب رات آتی تو سراپا محبت بن جاتا۔ ماں نے سرخ رنگ کی بابت جو نصیحت کی تھی شاداں نے وہی کیا۔ اپنی شلوار پر سرخ رنگ کے بڑے بڑے چھینٹے اس نے اس طرح ڈالے کہ وہ واجد کو نظر آ گئے۔ شاداں کے لئے اس کی الفت اور بھی زیادہ ہو گئی اور قرآن کی سورۃ کو یاد کرنے کی جو کوششیں وہ کر رہی تھی اس نے بھی اس کی قدر و منزلت کو واجد کی نگاہوں میں دونا کر دیا تھا۔ شاداں کو اپنی ماں کا اتنا خیال نہیں آتا تھا۔ وہ اس کے لئے ایک بیگانہ فرد تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مقدس خانقاہ میں اس کا گناہ گار وجود شاداں کو گراں گزر رہا تھا۔ وہ جتنی جلدی یہاں سے چلی جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ شاداں اکثر سوچتی۔ ایک دن اس نے نوراں کو کہتے سنا۔

''میں جلد یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''چلی جا...... اب انتظار کس کا کر رہی ہے۔''

نوراں کے دل پر گھونسہ لگا۔ بیٹی کے لئے اب وہ دودھ رکھنے کا ٹوٹا برتن ہو گئی ہے۔ اتنی جلدی اور اچانک اس کی محبت ختم ہو جائے گی نوراں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ خاموش رہی اور اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا بس چلتا تو جو کچھ اس کی زندگی میں ہوا تھا اسے بیٹی کے سامنے کر دیتی۔ لیکن اسے کیا ملتا اور بیٹی کیا کہتی اور کیا سمجھتی۔ ایسی الجھنیں، ایسی پریشانیاں، اتنے دکھ اور اتنی بے بسی تو مشکل سے کسی اور کو ہوتی ہوگی۔ بڑھاپے میں بیٹی اور داماد کے ساتھ رہنے کا اس کا خواب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔

''تو یہاں خوش رہے گی شاداں۔''

"ہاں...... میں بہت خوش ہوں۔" شاداں نے خشک لہجے میں جواب دیا اور ماں کے پاس سے اٹھ کر بکریوں کو کھول کر چرنے کے لئے چراگاہ کی جانب بھگا دیا۔ اس کا دل نہیں چاہا کہ ماں کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سنے اور اپنی اس مسرت کا اظہار کرے جو اسے مل رہی تھی۔ شاداں چولھے کے پاس چلی گئی۔

نوراں نے نیم وا حجرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی حاجت مند یا کوئی مرید واجد کے پاس تھا۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیص کوٹھری سے لے آئی اور اسے سینے لگی۔ اس کا دل اب بھی بھرا تھا۔ بیٹی سے دلاسے کے دو بول سننے کی اسے خواہش ہو رہی تھی۔ اس کا سر جھکا تھا اور انگلیاں لرز رہی تھیں۔ نوراں کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

"تو مجھ سے اس طرح کیوں باتیں کر رہی ہے؟ میں نے تجھے کوئی دکھ نہیں دیا ہے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مڑ کر ماں کی جانب دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جس کے چہرے پر شاداں کو پہلی بار جھریاں نظر آئیں۔ جو پہلے بھی تھیں اور آہستہ آہستہ پھیل رہی تھیں لیکن شاداں کو نظر نہیں آئی تھیں۔ اچانک اس کی ماں پر ضعیفی آ گئی تھی۔ لیکن شاداں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے حال کی وہ راتیں یاد آ رہی تھیں جب اس کی ماں غلاظتوں میں ڈوبی تھی۔ شاداں کو ذلت کا احساس پھر سے ہوا۔ ماں سے دوری اور بیگانگی اب بھی شدید محسوس ہوئی۔ شاداں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

شاداں وہ واحد فرد تھی جسے نوراں اپنا کہہ سکتی تھی۔ جس کی قربت سے اسے روحانی تسکین ملتی تھی۔ شاداں کی وجہ سے نوراں کو اپنی زندگی بھی اہم اور ضروری محسوس ہوئی تھی۔ وہ یہاں سے غیریت کا صدمہ لے کر جائے گی۔ دوری کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ دل کا حال سنانے کے لئے اب کوئی نہیں تھا۔ جو مرد اس کی زندگی میں آئے وہ اس کی روح کو زخمی کر کے چلے گئے اور اس کا خاوند تو سب سے ذلیل نکلا۔ اس نے اس کو وہ کاری زخم دیا جس کا کوئی علاج نہیں۔ نوراں کی اذیتیں اس کے دل میں سوئی بن کر چبھتی رہیں لیکن وہ چپ سی رہی۔ وہ اٹھ کر شاداں کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"بیٹی...... تو جو چاہتی ہے ضرور بول۔ ماں کے خلاف تیرے دل میں جو بھی آئے اسے آنے دے۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" بیٹی ماں کے وجود کا حصہ ہی تھی۔ نوراں کے غم کا کچھ اثر شاداں پر ہوا۔

"مت جا ابھی۔ رک جا کچھ دنوں کے لئے۔"

"نہیں۔ میرا جانا ضروری ہے۔ ایک کام کرنا ہے مجھے۔ میں دیر نہیں کر سکتی۔" نوراں نے چولھے میں جلتی آگ کو تکتے ہوئے کہا۔ اس کے دانت بھینچے تھے اور کسی پختہ ارادے کی وجہ سے آنکھوں میں گہرائی تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب نوراں کو جانا تھا۔ خنک صبح میں کانپتی اور لرزتی دھوپ بجنی پر چھا رہی تھی۔ خانقاہ خاموش اور اس کے سامنے درخت پر لگی سبز جھنڈی بھی سرنگوں۔ جیسے کسی المیے کا سبھوں کو انتظار تھا۔ پھر زندگی کی ہلچل ہر سو نمایاں ہونے لگی۔ مگن شاہ مٹکا اٹھائے چشمے کی جانب پانی لانے روانہ ہوا۔ نوراں اور شاداں خانقاہ کے برآمدے میں آ کر ہر روز کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ بیٹی سے جدا ہونے کے غم میں نوراں سے کچھ کھایا نہیں گیا۔ وہ اپنی موٹری کو کبھی کھولتی اور کبھی باندھتی۔ ایک دو بار جب شاداں پاس سے گزری تو اسے لپٹا کر پیار بھی کیا۔ لیکن بیٹی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ ماں کے غم زدہ چہرے کا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں ان آنسوؤں کا جو بہنے کے لئے بیقرار تھے۔ شاداں اب اتنی خوش تھی کہ اسے پرواہ نہیں تھی کہ ماں اس کے قریب رہتی ہے یا نہیں۔ شاداں اب پیر کی بیوی تھی اور اس وجہ سے اس کا درجہ بھی بلند اور محترم تھا۔ اس کے بزرگ خاوند کو اب تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ حاملہ تھی۔ آئندہ بھی اسے پتہ نہیں چلے گا۔ جو بچہ ہو گا وہ اسی کا سمجھا جائے گا اور وہ بھی اس کی طرح نیک اور بزرگ انسان ہو گا۔ شاداں اکثر سوچتی رہی تھی۔ اس سوچ میں اس کی ماں کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اس نے مگن شاہ کے ساتھ مل کر جو برائی کی تھی اس کی ذلت شاداں شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس لئے ماں کا نظروں سے دور ہی رہنا اچھا ہو گا۔ شاداں کو اکثر خیال آیا تھا۔ اس سوچ کے باوجود اس نے کچھ روٹیاں اور شکر ماں کے حوالے کر دیں۔

وہ گاؤں والے جو میرپور اپنا ہل مرمت کرانے یا کچھ خرید فروخت کرنے جا رہے تھے وہ خانقاہ میں پہنچ گئے۔ نوراں کو ان ہی کے ساتھ جانا تھا۔ راستہ طویل تھا اور طے پایا تھا کہ گاؤں والوں کے جو رشتہ دار میرپور میں رہتے ہیں نوراں ان ہی کے یہاں رات ٹھہرنے کے بعد دوسرے دن بس سے جہلم چلی جائے گی۔ گو واجد کو پتہ تھا کہ نوراں جا رہی ہے پھر بھی وہ اپنے حجرے میں تلاوت کرتا رہا۔ کئی بار واجد کو خیال آیا تھا کہ حجرے میں اس کے ساتھ تنہا ہو۔ اس

سے باتیں کرے اور اس کی باتیں سنے۔ اس کے سر کے چکنے بالوں کو سہلائے۔ آہستہ آہستہ۔ اسے چومے، لپٹائے اور جی بھر کے پیار کرے۔ اسی طرح بالکل اسی طرح جیسے پہلے وہ کیا کرتا تھا۔ کوٹ فتح خان کی ویران حویلی میں ان گھنے درختوں کے سائے میں، جن کی آپس میں گتھی ہوئی شاخیں انھیں چھپا لیتی تھیں۔ اِس وقت بھی وہی خیالات اس کے دل میں آرہے تھے۔ ان خیالوں سے نجات پانے کی اس نے کوشش کی۔ نوراں کا چلے جانا ہی ہر طرح سے اچھا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

باہر نوراں سسکیاں لے رہی تھی۔ جب اس نے شاداں کو لپٹایا تو اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ اپنے میلے دوپٹے سے آنسوؤں سے نم چہرے کو پونچھتے ہوئے نوراں بولی۔

"تیری ماں بری نہیں ہے بیٹی۔ اسے راستہ نہیں مل سکا۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں۔"

ماں کیا سمجھانا چاہتی تھی شاداں نہیں سمجھ سکی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ دل اداس سا ہو گیا۔ پھر بھی وہ نوراں کو نہیں کہہ سکی رُک جا۔ ماں کے لئے محبت، نفرت اور دوری کے احساسات سے اس کے دل میں ہلکا سا طلاطم تھا۔ جس کا اظہار مشکل اور بولنا اور بھی مشکل۔ آخر کار واجد حجرے سے باہر آیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور انگلیوں کے درمیان تسبیح کے دانے پھسل رہے تھے۔

"شاداں اب تہڈی حفاظت میں ہے شاہ جی۔ اس کے ساتھ اچھائی کرنا اور اس کے گناہوں کو معاف کر دینا۔ رب کا کرم ہوگا تم پر۔ شاداں تیری ماں اب وہاں جارہی ہے جہاں مجھ سے لپٹ کر سو جانے کے لئے تو نہیں ہوگی...... اور میرے سر کے بالوں میں کنگھی کرنے کے لیے میری بیٹی، سنگنی اور سہیلی بھی نہیں ہوگی۔ یہی قسمت ہے۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ جب دل ٹوٹا تو سارے رشتے ناطے بھی ٹوٹے۔ انسانوں کو دکھ ہی دینا ہوتا ہے تو وہ انھیں پیدا کیوں کرتا ہے؟ خیر......" نوراں ہچکیاں لیتی ہوئی بولی اور ہتھیلی سے اپنے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔

گاؤں کی عورتیں بھی نوراں کو الوداع کہنے آگئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بھی آبدیدہ تھیں۔ سبھوں نے اسے باری باری گلے لگایا۔ اپنی بیٹی کو گاؤں کے پیر کے ساتھ بیاہ کر وہ ان سب کے لئے عزیز ہوگئی تھی۔ فضلاں بھی ان کے درمیان تھی۔ اس نے ایک روپیہ نوراں کے دوپٹے میں باندھ دیا۔ پھر نوراں کے ساتھ ساتھ سب پہاڑی کے کنارے تک آئے اور وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ کئی بار اس نے رک کر بلند آواز میں شاداں کو دعا دی جو غم زدہ گونج بن کر وادی

میں لہرائی۔ شاداں کے آنسو بھی رواں تھے وہ دوری کی وجہ سے نہیں سمجھ سکی ماں نے کیا کہا۔ شاداں کے آنسو دیکھ کر مگن شاہ بے چین سا ہو گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اس کی زبان پر گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔

نوراں کی کٹیا کا راستہ کوٹ فتح خان ہو کر جاتا تھا۔ جب وہ وہاں تھکی ہاری پہنچی تو شام ہو چکی تھی اور فضا خشک اوپلوں کی بو سے بوجھل تھی۔ وہ اس جوہڑ کے درخت کے نیچے آ کر رک گئی جو ملک ظہیر کی حویلی کے سامنے تھا۔ مدتوں سے وہ اس کے پاس بھی نہیں پھٹکی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اسے بھول چکی تھی۔ لیکن آج وہ اسے جانا پہچانا لگا۔ ایک دیرینہ رفیق جس سے اس کا گہرا رشتہ تھا۔ جو بانہیں پھیلائے اسے اپنے آغوش میں لے لینا چاہتا تھا۔ کبھی اس کے قریب نوراں بھی اپنی کوٹھری میں رہتی تھی۔ نوراں درخت کے تنے سے ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ شاخوں سے اس کی زندگی کی میٹھی یادیں شبنم کی طرح ٹپکنے لگیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اسی درخت کے نیچے اپنی بلی سے کھیلتی تھی۔ کبھی اسے گود میں اٹھا کر ناچتی، گاتی اور کبھی بلی کو شاخ پر بٹھا کر کودنے کے لئے کہتی۔ نوراں کے باپ نے اسی درخت کی ایک موٹی شاخ میں اس کے لئے جھولا ڈال دیا تھا اور وہ دن بھر جھولا جھولتی۔ کبھی اس کا باپ پاس آ کر اسے پینگیں دیتا اور نوراں اسے خوب زور سے پینگیں دینے کے لئے کہتی۔ پھر نوراں کو لگتا کہ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی ہے اور ماں کوٹھری کے دروازے پر کھڑی مسکراتے ہوئے اسے تکتی۔ جب نوراں کی پہلی شادی ہوئی تھی تو وہ اور اس کا خاوند رات کے اندھیرے میں یہیں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نوراں کے والدین کے سو جانے کا انتظار کرتے تھے۔

جہاں اس کی کوٹھری تھی وہ اب بیل باندھنے کی جگہ تھی۔ مجید کی کوٹھری بھی اسی کام کے لئے استعمال میں تھی۔ ملک ظہیر کی حویلی کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پھر وہیں بھٹکیں جہاں اس کی کوٹھری تھی اور وہاں سے بہت ساری یادیں لئے واپس آ گئیں۔ اس کے ماں باپ اور شاداں شام کی تاریکی میں دور افق کے تاروں کی طرح جھلملائے۔ نوراں کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر درخت کی چند پتیاں توڑیں اور ان کے سبز رنگ کو تکنے لگی۔ اس کی ماں کو یہ رنگ پسند تھا۔ شاداں بھی سبز رنگ بہت پسند کرتی تھی۔ نوراں کا دل بھر آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آنسوؤں

کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔ ''اڑ جاؤ۔ پاگل چیلوں کی طرح دُور اُڑ جاؤ۔ میرا دل کھانے اب مت آؤ۔'' نوراں نے زیرِ لب اپنی یادوں کو کہا۔

حویلی سے ایک خادمہ کسی کام سے باہر آئی اور نوراں کو دیکھ کر اس کے پاس رک گئی۔ مارے حیرت کے سنولی، ادھیڑ عمر خادمہ کا ہاتھ اس کے منہ پر چلا گیا۔ اس نے پوچھا۔

''نوراں! تو کہاں چلی گئی تھی۔ تیرا خاوند زری خاں تجھے ہر طرف تلاش کرتا پھر رہا تھا۔''

''میں شاداں کا بیاہ کرنے گئی ہوئی تھی۔''

''اللہ رحم کرتا ہے، میں جانتی تھی تیرے اچھے دن پھریں گے۔ لیکن تیرے خاوند کو اس بابت کچھ پتہ نہیں تھا۔''

''اسے کیوں پتہ ہوتا۔ شاداں اس کی بیٹی تو تھی نہیں۔ میں نے شاداں کو ایک بزرگ سے بیاہ دیا ہے۔'' نوراں فخریہ بولی اور اپنی خستہ رہائش کی جانب چل دی۔

اسٹیشن سے یہاں تک وہ پیدل چل کر آئی تھی۔ اس کے پیر تھکان کی وجہ سے لوہے کے بنے محسوس ہو رہے تھے، اور اس کی قمیص جس میں پسینہ خشک ہو گیا تھا، وہ اس کے جسم میں کانٹے کی طرح گڑنے لگی۔ اپنے گھر واپس آنے کی اسے کوئی خوشی نہیں تھی۔ لیکن اسے آنا تو تھا۔ اپنے خاوند زری خاں کا سامنا کرنے اور وہ معرکہ سر کرنے جس کا فیصلہ اس نے کر لیا تھا۔ اس ارادے نے اس کی بھوک ختم کر دی تھی۔ شاداں نے جو روٹیاں دی تھیں ان میں سے محض دو تین اس نے مشکل سے کھائی تھیں۔ وہ ایک فاتح کی طرح ان جھونپڑیوں کے قریب پہنچی جہاں اس کی کوٹھری بھی تھی۔ وہاں دہلیز پر زری خاں بیٹھا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ کھچڑی جیسے بال اس کی پیشانی پر بکھرے تھے اور اسی رنگ کی داڑھی اور مونچھ ایک دوسرے سے الجھے تھے۔ نوراں کو دیکھ کر مارے غصے کے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چیخا۔

''کسبی۔ کہاں گئی تھی تو۔'' اور ساتھ ہی پوری طاقت سے ایک تھپڑ اس نے نوراں کو مارا۔

نوراں کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ جو گٹھری وہ اٹھائے ہوئے تھی وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر گر گئی اور اس میں بندھی روٹیاں زمین پر بکھر گئیں۔ وہ چکرا کر پیچھے ہٹی۔ زری خاں اسے طمانچے مارتا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا اور ساتھ ہی مغلظات گالیاں بھی بکتا گیا۔ نوراں نے کوئی واویلا نہیں مچایا۔ کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ اسی طرح مار کھانے کی اسے امید تھی اور اس نے اس کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔ وہ بت بنی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خاوند کے لئے

نفرت کے جو شعلے اٹھ رہے تھے، اسے زری خاں اپنے غصے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا۔ آس پاس کی جھونپڑیوں سے مرد و عورت نکل آئے تھے اور نوراں کی ذلت کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''جتنا بھی مارنا چاہے مار لے۔ میں تیری طرح فرشتہ نہیں ہوں۔ لیکن میں کوئی گناہ کرنے نہیں گئی تھی۔'' نوراں نے آہنی آواز میں جواب دیا۔ زری خاں نے اس کے الفاظ کے طنز کو محسوس کر لیا۔ وہ جان گیا کہ جو کچھ اس نے شاداں کے ساتھ کیا تھا اسے نوراں جان گئی تھی۔ زری خاں کی نگاہیں ذرا دیر کے لئے جھکیں۔ اس نے بغیر نظریں اٹھائے پوچھا۔

''شاداں کہاں ہے؟''

''میں اسے داتا کے دربار میں لے گئی تھی، وہاں وہ اغوا ہو گئی۔''

زری خاں اور جو لوگ اردگرد کھڑے تھے انھیں یقین نہیں آیا۔ لیکن ایسی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ شاید سچ مچ ایسا ہوا ہو۔ کچھ نے سوچا۔

''تو جھوٹ بول رہی ہے۔ تو نے اسے رنڈیوں کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔''

نوراں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کوٹھری کے اندر جا کر چارپائی پر پڑ گئی اور وہیں سے بولی۔

''اگر میں نے اسے بیچ دیا ہے تو تجھے کیوں غم ہو رہا ہے۔ وہ تیری بیٹی نہیں تھی۔ میری پتری تھی۔ اس کا بھلا مجھے معلوم تھا۔ میں نے اس کے لئے جو کیا وہ اچھا ہی ہوا۔''

شاداں کی پھر یاد آنے لگی۔ نوراں کا دل اس کی یاد سے پھر دکھا، ساتھ ہی جو مار اسے پڑی تھی اس کی وجہ سے اس کا سر شدت سے دکھنے لگا۔ وہ ہلکے سے کراہی اور دیوار کی جانب کروٹ لی۔ جیسے وہ زری خاں اور وہ سارے لوگ جو باہر کھڑے تھے انھیں نظروں سے دور کر دینا چاہتی ہو۔ زری خاں خاموشی سے باہر کھڑا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ کچھ کہنے کے لئے اب تھا ہی کیا۔ بیوی اس کے کرتوت سمجھ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے منانا چاہتا تھا۔ زری خاں کو شاداں کی جستجو تھی۔ اس شکاری کی طرح جو اپنے شکار کا مزہ نہیں بھولتا۔ وہ کوٹھری کے اندر آیا۔ تاریکی کی وجہ سے نوراں کی نفرت اور جس طرح ڈراؤنی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی تھی، زری خاں نہیں دیکھ سکا۔

''میں لالٹین جلاتا ہوں۔ ہانڈی میں دال ہے اور کچھ روٹیاں بھی ہیں۔ تو بھوکی ہوگی انھیں کھا لے۔'' زری خاں نے نوراں کو منانے کی کوشش کی۔

"رہنے دے...... کھانا باسی ہو چکا ہوگا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے دے۔ میں کچھ پکاؤں گی۔ تو نے بھی اچھی طرح نہیں کھایا ہوگا۔"

نوراں کو جو مار پڑی تھی وہ نئی نہیں تھی۔ ایسا ماضی میں بھی ہوا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ بستر پر پڑی رہتی اور کسی نہ کسی بہانے اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ لیکن آج اس کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا جو اسے چاق و چوبند ہونے کے لئے کہہ رہا تھا۔ زری خاں خوش ہو گیا۔ اتنی جلدی اس کی بیوی مار کھانے کی اذیت کو بھول جائے گی، اسے امید نہیں تھی۔ وہ چارپائی پر نوراں کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی ران پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔

"جاناں۔ مجھے بتا کر جاتی پھر میں نہیں ناراض ہوتا۔ لگتا ہے تو شاداں کو کسی رشتہ دار کے پاس چھوڑ کر آگئی ہے۔ کھانا بنانا ہی ہے تو جلدی بنا۔ سچ مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"ہاتھ ہٹا زری خاں۔ مجھے مارنا تیرے لئے نیا نہیں ہے۔ دکھ پہلے بھی سہا، اب بھی سہہ لوں گی۔ میرے دل میں میل نہیں رہتا۔ مجھے کچھ دیر آرام کر لینے دے۔ ساری رات ہمارے لئے پڑی ہے۔" زری خاں کا ہاتھ نرمی سے ہٹاتے ہوئے نوراں نے جواب دیا۔

زری خاں کوٹھری کے باہر چلا گیا۔ نوراں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں لیتی رہی۔ اس کے بعد اٹھ کر اس نے زنگ آلودہ لالٹین جلائی اور اسے دھوئیں سے سیاہ طاق میں رکھ دیا۔ زری خاں باہر کسی سے بات کرنے میں مشغول تھا۔ کوٹھری کے کونے میں جو چولھا تھا وہاں اس نے آگ روشن کی۔ ایک ہانڈی میں دودھ تھا اسے نوراں نے چولھے پر چڑھایا۔ چاول اور چینی اس میں ملایا اور دروازے کے باہر تکا۔ زری خاں ابھی تک کسی سے زور زور سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

"فوجیوں کی حکومت ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ کسی کو سمجھا رہا تھا۔

نوراں نے اپنے ڈوپٹے میں بندھی زہر کی پڑیا نکالی اور ساری کی ساری اس نے ہانڈی میں خالی کر دی۔ اس نے ہانڈی میں سب اشیا کو خوب اچھی طرح ملایا۔ کچھ دیر میں دودھ کے پکنے کی عمدہ بو کوٹھری میں پھیل گئی۔

"اندر آ...... کھانا تیار ہے۔" نوراں نے پکارا۔

زری خاں اندر آ گیا اور کھانے کی خوشبو سے مسکرا دیا۔ اس کے ناہموار دانت جن کے درمیان شگاف تھا، وہ نمایاں ہو گئے۔ اس کا گھٹا ہوا سر خوشی سے ہل رہا تھا۔

"واہ رے واہ۔ کیسی اچھی بو ہے، بالکل ویسی جیسی میری بیوی کی گرم سانسوں سے نکلتی ہے۔"

"تو ہر دن دال روٹی کھا کر اکتا گیا ہوگا۔ اسی لئے میں نے کھیر پکا دی ہے۔ سب تیرے لئے ہے۔ میں نے جو میٹھی روٹیاں کھائی ہیں ان کی وجہ سے مجھے متلی آ رہی ہے۔"

"میں تیرے لئے تھوڑی سی چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں نہیں شیرا...... سب تیرے لئے ہے۔ میں کل کچھ اپنے لئے پکا لوں گی۔ تو اسے ختم کر دے۔"

"وہ تو میں کروں گا۔" یہ بولتا ہوا زری خاں بیٹھ گیا اور جلدی جلدی کھیر کے لقمے لینے لگا۔

"اچھی ہے نا؟" نوراں کی آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی۔

"ہاں نوراں...... بہت اچھی۔ بالکل تیرے منہ کی طرح میٹھی۔ کھیر جادو کر رہی ہے۔ آگ لگی جا رہی ہے میرے جسم میں۔ ساری رات تیرے پانی سے اسے بجھاؤں گا۔"

"پھر کیا بچے گا میرے میں۔ خشک ہڈی چوسنے میں تجھے کیا مزا آئے گا۔" نوراں اس کی مونچھ پر ہلکے سے انگلیاں پھیرتی ہوئی ادا سے بولی۔

"مزہ کیسے لیتے ہیں زری خاں جانتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے زری خاں نے نوراں کو زور سے لپٹا لیا اور اسے چومنے کی کوشش کی۔ نوراں نے منہ موڑ لیا اور ترچھی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری ہڈیاں مت توڑ۔ ذرا مجھے ہاتھ منہ تو اچھی طرح دھو لینے دے۔"

زری خاں نے ساری کھیر جلد ختم کر دی۔ وہ اس سے اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لئے بیتاب تھا۔ اس نے نوراں کو کھینچ کر زمین پر لٹا دیا اور اس کی شلوار کو اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نوراں اسے مضبوطی سے پکڑے رہی۔

"شیرا...... روک اپنے کو۔ باؤلا ہوا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور لوگ باہر کھڑے ہیں۔" نوراں نے اپنے منہ کو اس کے منہ کے پاس سے ہٹائے رکھا۔

باہر جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے سن لیا تھا کہ اندر کیوں اُٹھا پٹک ہو رہی ہے۔ وہ بھی ہنس رہے تھے۔ ان کے ہنسنے کی آواز کو زری خاں نے سن لیا۔ اس نے نوراں کو اپنی آغوش سے آزاد کر دیا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور باہر جا کر اس نے لوگوں کو ڈانٹ کر دروازے کے پاس سے ہٹنے کے لئے کہا۔ پھر اس نے نیم کے پتوں سے اپنے ہاتھوں کو خوب مل مل کر دھویا۔ جب

واپس آئی تو دروازے کے پاس ہی رُک گئی اور زری خاں کو غور سے دیکھا جو چارپائی پر پڑا تھا۔ نوراں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے وجود میں ایک تہلکہ مچا تھا۔ بار بار اسے خیال آرہا تھا کہ اگر زہر نے کام نہیں کیا تو؟ زری خاں نیم تاریکی میں اس نفرت کے شعلوں کو نہیں دیکھ سکا تھا جو نوراں کی آنکھوں میں اٹھ رہے تھے اور اپنے شہوانی جذبات کی رو میں وہ نہیں سمجھ سکا کہ نوراں کے ہاتھ کیوں اس قدر سرد تھے۔ وہ اس کے لئے وہی عورت تھی جس کے ساتھ وہ جس وقت بھی چاہتا اپنی طلب پوری کرسکتا تھا اور اس وقت اس کی بیتابی بڑھتی جارہی تھی۔

''کس کا انتظار کررہی ہے۔ تیرے لئے جو تڑپ ہے اسے سمجھ باؤلی۔''

لیکن نوراں کے پیر زمین میں گڑے تھے۔ وہ ذرا بھی نہیں ہلی۔ اس کا میلا دوپٹہ گردن میں جھول رہا تھا اور اس کے سر کے خشک بال چہرے پر آگئے تھے۔ وہ دانت بھینچے زری خاں کی کسی حرکت کی منتظر تھی۔ زری خاں سے رہا نہیں گیا۔ وہ اٹھا اور جوں ہی اس نے قدم بڑھایا وہ چیختا ہوا بستر پر گر پڑا۔ اس کے جسم کو کسی نے ہولناک زنجیر سے جکڑ دیا تھا۔ ہر لمحے اس کا حلقہ اس طرح تنگ ہوتا جارہا تھا کہ زری خاں کے لئے سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔ اس کے جبڑے کے پٹھے سخت ہوکر اکڑ گئے تھے۔ زری خاں نے خود کو جھٹک کر آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا جسم اکڑ کر کمان کی طرح تن گیا۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں نکل آئیں اور اس نے شدید اضطراب میں نوراں کو تاکا جو اس کی چارپائی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ نوراں نے اس کے منہ پر تھوکا۔

''گندے چوہے۔ تو اب اس جہنم میں ہے جہاں تجھے گندی موت آئے گی۔ میری بیٹی کی معصومیت تو نے مٹی میں ملادی لیکن تو بھول گیا کہ اس کی ماں زندہ تھی۔ میں نے کھیر میں زہر ملا کر اسی لئے تجھے کھلایا تھا تاکہ تو تڑپ تڑپ کر مرے۔ تو اب زندہ نہیں بچ سکتا۔'' نوراں اپنے زہریلے الفاظ کو چبا چبا کر بول رہی تھی۔

''نو......نو......'' زری خاں سے بولا نہیں گیا۔ اس کی زبان جکڑ گئی تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے موت سامنے کھڑی دکھائی دی جس کی تیز ناخنوں سے بھری انگلیاں اس کی گردن کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

نوراں کو ذرّہ برابر بھی رحم نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں مارے حقارت کے جل رہی تھیں۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے زری خاں پر پھر تھوکا۔

''زری خاں...... کاش میں چاقو تیرے سینے میں گھونپ سکتی اور پھر تیرے خون میں نہاتی...... نہیں، تیرا خون بھی تیری طرح گندہ ہے اور بدبو ہے اس میں۔ تو آہستہ آہستہ مرے گا...... اور تیری ہر سانس کے ساتھ تجھے ایسا دکھ ہوگا جسے تیری ماں نے تجھے پیدا کرتے وقت بھی نہیں جانا ہوگا۔ میں تجھے چھوؤں گی بھی نہیں۔ تیرا جسم مردہ کتے کے سڑے جسم سے بھی بدتر ہے۔'' نوراں نے ہر لفظ کو چیخ چیخ کر کہا۔ جیسے وہ ساری دنیا کو اپنی اذیت اور نفرت کی وجہ بتانا چاہتی ہو۔

پڑوس والوں نے سب کچھ سن لیا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہیں بھی۔ دوسرے دن جب زری خاں دیر تک کوٹھری سے باہر نہیں آیا تو چند افراد کوٹھری کے اندر گئے۔ زری خاں مردہ پڑا تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہولناک مسکراہٹ منجمد تھی۔ اس کا چہرہ اور جسم نیلا پڑ گیا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر نوراں زمین پر سو رہی تھی۔

زری خاں کے مارے جانے کی خبر جلد کوٹ فتح خان پہنچ گئی جہاں اب ملک ظہیر کا بیٹا بڑا جاگیردار تھا۔ گو وہ نوراں کے جسم سے مدت ہوئی فیضیاب ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے پولس کو خبر دینے میں دیر نہیں کی۔ پولیس نوراں کو پکڑ کر لے گئی۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا اور کچھ دنوں بعد اسے قتل کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ نوراں روتی ہوئی پھانسی پر چڑھی اور خدا سے فریاد کرتی رہی کہ زندگی بھر اذیت ہی دینی تھی تو پھر اسے اس نے پیدا ہی کیوں کیا؟

۱۶

واجد کو اپنی نئی زندگی سے ہم آہنگ ہونے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عمر کا فرق اور اپنے عقائد پر سختی سے پابندی ایسی وجوہات تھیں جو اس کے اور شاداں کے درمیان حائل ہو رہی تھیں۔ کبھی وہ ایک کھلونا لگتی جسے زبردستی اس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جس سے کھیلنے کے لئے کبھی اس کا دل چاہتا اور کبھی نہیں بھی۔ جسم کے تقاضے اس کے پاس ضرور لے جاتے لیکن اس کے بعد کس طرح اسے پیش آنا چاہئے تھا، واجد نہیں جانتا تھا۔ وہ کبھی اسے گود میں بٹھاتا تو وہ اس کی داڑھی سے کھیلنے لگ جاتی، جسے وہ کبھی انگلیوں میں لپیٹتی اور کبھی ہلکے سے کھینچتی۔ وہ اسے پیر دبانے کے لئے کہتا تو وہ اس کے تلوے میں گدگدی کرنے لگتی جس کی وجہ سے واجد کو زور سے ہنسنا پڑتا اور اس کے پیٹ میں گدگدی کرنا بھی شاداں کو بہت پسند تھا۔ واجد کے منع کرنے کے باوجود بھی شاداں باز نہیں آتی۔ جیسے محبت کے یہی طریقے اسے آتے تھے۔ جسمانی رشتوں کے ساتھ جیسے اس چلبلاپن میں بھی شاداں کے لئے وہ مزہ تھا جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ رات کے وقت اس سے لپٹ کر وہ کہتی کہ اس میں بیل جیسی طاقت ہے اور جب وہ چلتا ہے تو زمین اس کے پیروں کے نیچے اس طرح لرزتی ہے جیسے اس پر گھوڑے بھاگ رہے ہوں۔ جانوروں سے اسے مشابہت دینا واجد کو برا لگتا اور اس نے سختی سے شاداں کو منع بھی کیا۔ لیکن دور میدانوں کی رہنے والی لڑکی کو ان سب ہی میں بڑا اپن نظر آیا تھا۔ بھیڑ اور بکریوں کے بچوں کی معصومیت میں شاداں کو اپنے شاہ جی کی معصومیت نظر آتی۔ سچ تو یہ تھا کہ شاداں بہت خوش تھی۔ ایسی خوبصورت پہاڑی پر خانقاہ کا ہونا۔ بے داغ نیلا آسمان اور شیشے کی طرح دھوپ میں چمکتا ہوا۔ دور تک پھیلی سبز چراگاہ اور وہاں بھیڑیں اور بکریاں۔

چراگاہ سے پرے پہاڑی اور جنگل اور ان سب سے پرے سرمئی کالا دیو پہاڑ۔ کبھی کبھی آنگن میں کسی کام سے جانا ہوتا تو وہ مارے خوشی کے بھاگتی ہوئی جاتی۔ اگر شاداں کو ناچنا اور گانا آتا تو یقیناً وہ ناچتی گاتی۔ جو بھی خانقاہ میں آتا وہ اسے اپنا لگتا اور اس سے باتیں کرنے میں جھجک نہیں ہوتی۔ شاداں کو اکثر ماں کا خیال آتا اور آنسوؤں سے بھرا اس کا چہرہ یاد آتا اور شاداں پھر اداس ہو جاتی۔ لیکن نئی جگہ اور خاوند سے قربت میں وہ اداسی جلد دور ہو جاتی۔ مگن شاہ بدلا بدلا سا تھا۔ وہ مارے ڈر کے اس سے دور رہتا۔ لیکن واجد کے ساتھ جس قربت کو وہ دیکھ رہا تھا وہ اسے بے چین رکھتی۔ جس کا اظہار اس کے لئے ناممکن تھا۔ کبھی کبھی اس کا چہرہ غصے سے تن جاتا، چھوٹی آنکھیں اور چھوٹی ہو جاتیں۔ بے معنی الفاظ اس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ نکلنے لگتے اور وہ ہاتھوں سے زور زور سے اشارے کرتا۔ جیسے کسی بلا کو بھگانا چاہتا ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ واجد نے اسے کوئی حکم دیا اور مگن شاہ نے جواب میں اسے غصے میں کچھ کہا اور حکم کی تعمیل نہیں کی۔ واجد کو اس سے جو لگاؤ تھا اور مگن شاہ کی مجبوری کو جس طرح وہ سمجھتا تھا ان کی وجہ سے واجد خاموش رہ جاتا۔

ایک حسین صبح جب آسمان میں بادلوں کا ننھا قافلہ رک گیا تھا۔ دھیمی سی ہوا آئی اور خانقاہ کے در و دیوار اور برآمدے میں کھڑی شاداں کو چومتی ہوئی دور کہرے میں لپٹے درختوں میں کھو گئی۔ شاداں مسکرا دی۔ وہ کچھ دیر بعد بھی روٹیاں پکا سکتی تھی۔ اس نے سوچا اور ان بھیڑ بکریوں کے پیچھے چل دی جو چراگاہ کی جانب جا رہی تھیں۔ گھانس پر پڑی خنک شبنم نے اس کے پیروں کو گدگدایا۔ شاداں ہنس دی۔ اس نے ایک بھیڑ کے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی پشت کو سہلاتی خانقاہ کے برآمدے میں واپس آگئی۔ بھیڑ جیسے شاداں کے شفیق لمس سے آشنا تھی۔ وہ اپنی سیاہ آنکھوں سے معصومیت کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ شاداں کے دل میں اس کے لئے محبت نرمی سے پھوٹ پڑی۔ اس کے جسم کی گرمی اس کے روئیں کا چکنا پن اسے بہت بھلا لگا۔ اسے اسی سرشاری کا احساس ہوا جسے وہ اپنے خاوند کی قربت میں محسوس کرتی تھی۔ شاداں اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے بولی۔

”شاہ جی...... اگر کبھی تمہارا پیر بھی ٹوٹ جائے گا تو بھی تمھیں میں خانقاہ سے نہیں جانے دوں گی۔ دن رات تمہاری خدمت کروں گی۔ جب چلنا چاہو گے تو لاٹھی بن جاؤں گی تمہارے لئے۔“

واجد حجرے میں قرآن کی تلاوت میں مصروف تھا۔ حجرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس کی

نگاہ باہر گئی۔ اس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ بھیڑ سے اسے مشابہت دینا اسے بہت برا لگا۔ کچھ عرصے سے شاداں کی عبادت واجبی لگنے لگی تھی اور قرآن کی سورۃ کو حفظ کرنے میں اس کی ناکامی واجد کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ واجد کو شاداں کے گنوار پن پر سخت غصہ آیا۔ غصہ سے تلملاتا ہوا وہ حجرے سے باہر آیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑتیں شاداں نے محسوس کیں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بھیڑ کا بچہ اُس کی گود سے پھسل گیا اور شاداں نے مارے خوف اور شرم کے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔ اس وقت خانقاہ کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ واجد اگر کوئی سزا اپنی بیوی کو دیتا تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنے غصہ کو ضبط کرلیا اور بغیر کچھ کہے حجرے میں واپس آگیا۔

کسی کسی دن واجد اپنے حجرے سے باہر آکر اس درخت کے نیچے بیٹھ کر تلاوت کیا کرتا تھا، جس پر ننھی جھنڈی اڑتی رہتی تھی۔ اسی طرح کے ایک دن میں درخت کے نیچے بچھی دری پر وہ بیٹھا تلاوت کررہا تھا۔ واجد کے چند مرید اور جو ضرورتمند آئے ہوئے تھے وہ محویت سے اس کی شیریں قرأت سن رہے تھے۔ بیکراں آسمان کے نیچے اور اردگرد کی گہری خاموشی میں واجد کی آواز کا جادو سبھوں کو مسحور کررہا تھا۔ حکمت اور دانائی کا وہ راز جو قرآن کی آیتوں میں تھا ہمیشہ سے ان کے لئے مقدس اور محترم رہا تھا۔ ان آیتوں کو سننا اور ایک خواب سی دنیا میں کھو جانا وہ کیفیت تھی جس سے فرار کبھی ممکن نہیں ہوا۔ واجد معرفت کی دنیا میں گم تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے پھٹے کپڑوں میں ملبوس اور مرجھائے ہوئے انسانوں کو انسانیت کا سبق دے رہا تھا۔ سنو، سنو غور سے سنو۔ ان ہی الفاظ میں سب کچھ ہے۔ اس کائنات کو درہم برہم کردینے کی طاقت۔ تمہیں فنا کردینے کا پیغام۔ ساری اطلاعیں ان ہی الفاظ کے ذریعے بھیجی گئی ہیں۔

جب تلاوت ختم ہوگئی تو واجد نے کوئی دعا پڑھی اور قرآن کو چوم کر اسے مخملی جزدان میں سرکا دیا۔ ضرورتمند باری باری اس کے پاس آئے۔ کسی کو اس نے تعویذ دیا اور کسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اس کے مسائل کو حل کرنے کی دعا دی۔ واجد کا اس طرح کبھی کبھی باہر آکر تلاوت کرنا اور اجنبیوں سے قریب ہوجانے میں بھی سب کے لئے مقدس کشش تھی۔ وہ شہد کی مکھیوں کی طرح شہد کی تلاش میں دیوانہ وار اس کی جانب بڑھتے۔ ان کا بس چلتا تو اس کے پیروں سے لپٹ جاتے۔ لیکن واجد ہاتھ کے اشارے سے انھیں دور ہٹنے کی ہدایت دیتا اور ایک کے بعد دوسرے کو پاس آنے کے لئے اشارہ کرتا۔

واجد کو پیاس لگی اور اس نے شاداں کو پانی لانے کے لئے کہا۔ وہ گلاس میں پانی بھر کر فوراً لے آئی۔ خاوند کو خوش کرنے کے لئے اس نے قرآن اٹھا کر حجرے میں لے جانا چاہا۔

"تیرے ہاتھ دھلے ہوئے نہیں ہیں۔ رہنے دے اسے یہیں پر۔" واجد نے شاداں کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ شاداں نے فوراً قرآن کو وہیں پر رکھ دیا جہاں سے اس نے اسے اٹھایا تھا۔ لیکن واجد نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ اس کی آنکھیں غصہ سے جل رہی تھیں اور ہونٹ مارے حقارت کے سکڑ گئے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے اس طرح ڈانٹے جانے کی وجہ سے شاداں کو ذلت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے خاوند کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ خوف سے لرز گئی۔

"شاہ جی غلطی ہوگئی۔ مجھے سمجھ نہیں ہے۔ اب کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" شاداں نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

واجد نے اس کی کلائی کو ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑ دیا۔ ڈری ہوئی اور خود کو حقیر محسوس کرتی ہوئی شاداں برآمدے میں آگئی۔ وہیں ایک جانب مگن شاہ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے شاداں کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ لیا۔

"مگن شاہ میرے ہاتھ گندے کیسے ہو گئے جب کہ ان ہی ہاتھوں سے صبح میں نے روٹی پکائی تھی۔" شاداں نیچی آواز میں بولی۔

ایک مدت کے بعد شاداں، مگن شاہ سے کچھ بولی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر بھی شاداں اس سے جس طرح مخاطب ہوئی تھی اس نے مگن شاہ کو خوش کر دیا۔ وہ ہنس کر جھومنے لگا۔ اس کا گول سر آہستہ ہل رہا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن اس کی خوشی زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ اس نے واجد کو حکم دیتے سنا۔

"مگن شاہ...... جا اس کی بیوی کو گاؤں سے چارپائی پر اٹھا کر لے آ۔"

مگن شاہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور ایک عورت کو اس کے خاوند کی مدد سے چارپائی پر اٹھا کر لے آیا۔ وہ عورت زرد اور نقاہت سے چور مسلسل کراہ رہی تھی۔ واجد دیر تک زیر لب کچھ پڑھ کر عورت پر پھونکتا رہا۔ اس کے بعد پانی سے بھرے گلاس پر اس نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس عورت کو پینے کے لئے دیا۔ عورت کراہتی ہوئی اٹھ کر بیٹھی اور پانی پینے کی کوشش کی۔ لیکن صرف چند چسکیاں لے کر رہ گئی اور دوبارہ مارے کمزوری کے لیٹ گئی۔

"خدا کی مرضی ہے یہ بھلی نہیں ہو سکتی۔" عورت کا خاوند بولا اور مگن شاہ کی مدد سے بیوی کو گاؤں واپس لے گیا۔

دن گزر گیا اور رات آ گئی اور پہاڑوں پر بنی کٹیاؤں میں دیئے بجھنے لگے۔ دن کی محنت و مشقت اور مصیبتوں سے تھکے انسانوں کو نیند آنے لگی۔ آسمان پر بادل آ گئے۔ جنگلوں میں چھپے مور جھنکارے۔ خانقاہ کی بتیاں ایک کے بعد دوسری بجھا دی گئیں اور خاموشی چھا گئی۔

واجد اور شاداں حجرے میں بند تھے۔ خانقاہ کے برآمدے میں چارپائی پر پڑا مگن شاہ آسمان کو تک رہا تھا۔ جہاں بادل آہستہ آہستہ چھٹ رہے تھے۔ کالا دیو کی چوٹی کے اوپر سکڑا، سہما چاند اسے نظر آیا۔ وہ کچھ دیر اسے تکتا رہا۔ رات کے وقت چارپائی پر جو اس کی رفیق ہوتی تھی، جس کے لمس میں لذت ہی لذت تھی اور جسے وہ شاداں سمجھتا رہا تھا، اس کی رفاقت اسے اب نہیں مل رہی تھی۔ مگن شاہ اٹھ کر اس درخت کے پاس گیا جس پر پھٹی ہوئی جھنڈی لہراتی تھی۔ اس نے درخت کے تنے کو غصے میں زور زور سے ہلایا۔ شاخوں سے پرندوں کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز کے ساتھ ان کی بے چین چہچہاہٹ بھی مگن شاہ نے سنی، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ اس کا بڑبڑانا ختم ہوا اور نہ ہی اس نے درخت کے تنے کو چھوڑا۔

چند پرندے شاخوں سے اڑے اور خانقاہ کے گرد چکر لگا کر جہاں انھیں پناہ ملی وہاں وہ چھپ گئے۔ مگن شاہ واپس اپنی چارپائی پر آ گیا۔ اس کی نگاہ حجرے کے بند دروازے پر گئی اور پھر جیسے میلے چاند نے اس کی نگاہوں کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ مگن شاہ غصے میں اسے مخاطب کر کے چیخا اور اٹھ کر اس نے حجرے کے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ حجرے کے اندر شاداں کی دبی دبی سسکیاں اچانک رک گئیں۔ دروازہ کھلا اور سامنے نیم برہنہ واجد کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال داڑھی سے الجھے ہوئے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت ناک غصہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے مگن شاہ پر ہاتھ اٹھانے سے خود کو روکا۔

"کیا چاہتا ہے؟" واجد غصے سے چیخا۔

"چاہتا ہے۔" مگن شاہ نے اس کے الفاظ کو دہرایا اور حجرے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن واجد نے اس کا راستہ روک لیا۔

"احمق...... جنگلی......" واجد کی آواز مشکل سے نکلی اور ساتھ ہی اس نے زور کا تھپڑ مگن شاہ کو رسید کیا۔

لیکن مگن شاہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دیوانہ حسد اور وحشی طاقت اس پر سوار تھی۔ اس نے اس زور سے واجد کو لات ماری کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ شاداں ڈر کر چیخی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں مگن شاہ نے اسے اپنے برہنہ جسم کو چھپاتے دیکھا۔ وہ اس کی جانب لپکا۔ زمین پر گرے واجد نے خطرے کو بھانپ لیا۔ اس نے لالٹین کو اٹھا کر اس سے مگن شاہ کو مارا۔ جس کی وجہ سے مگن شاہ تلملا اٹھا۔ لالٹین کی لو میں مگن شاہ کو وہ آگ نظر آئی جس سے وہ ہمیشہ ڈرتا تھا اور ساتھ ہی اسے جلتے چہرے کی بے پناہ اذیت بھی محسوس ہوئی۔ دونوں ہاتھوں کو اس طرح اٹھائے ہوئے جیسے کسی بلا کو روکنا چاہتا ہو وہ زخمی درندے کی طرح چیختا ہوا حجرے سے نکل کر بھاگا۔ واجد کو اپنی فضیلت کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ ذلت اور مگن شاہ کی احسان فراموشی نے اسے بھی دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ مگن شاہ کے پیچھے لالٹین لئے ہوئے دوڑا۔ لیکن مگن شاہ کو پکڑنا محال تھا۔ اندھیرے میں دوڑتے ہوئے دو افراد اور تاریکی میں جھولتے لالٹین کی روشنی۔ اگر گشتی سپاہیوں کو یہ سب نظر آیا بھی تو انھوں نے انھیں آسیب سمجھا ہوگا۔

واجد ہانپتا ہوا واپس حجرے میں آیا۔ سارے واقعے نے اسے حیران اور ششدر کر دیا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مگن شاہ ایسی جرأت کر سکتا ہے۔ واجد نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ خدا نے اسے خرگوش جیسا بے ضرر اور معصوم فرد اس کے حوالے کر دیا ہے اور حکم دیا کہ اسے سنبھالو۔ یہ تمہاری انسانیت کا امتحان ہے اور واجد اس امتحان میں پورا اترا۔ اپنے فرض کو نبھانے میں اس سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اس سے ہمیشہ واجد نے ہمدردی محسوس کی۔ اسے اولاد کی طرح عزیز سمجھا۔ اسے فاقہ اور بادوباراں کی ہلاکتوں سے بچایا۔ اس سے دل کی بات کہی۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی اپنے مخلص دوست سے کہتا ہے۔ لیکن آج مگن شاہ نے سارے رشتوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ بے ضرر انسان کے روپ میں بھیڑیا نکلا۔ اپنے آقا اور اپنے محسن کی عزت کا دشمن۔ واجد کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مگن شاہ کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس پڑ گیا۔ شاداں بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ واجد نے اسے لرزتا محسوس کیا۔ اس کے گرد اپنی بانہوں کو ڈال کر وہ بولا۔

''ہمت کر...... مگن شاہ اب خانقاہ کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔''

شاداں نے اپنا بے جان جسم خاوند کے حوالے کر دیا۔ لیکن وہ کسی اور سوچ میں تھی۔ جس خوشی میں وہ گم رہتی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہو کر آج مٹ گئی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ یہ کیسی جگہ

تھی۔ لوگ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ چہل پہل ہوتی پھر عجیب سی خاموشی اور ویرانی چھا جاتی اور اس ویرانی میں مگن شاہ مسکراتا اور آپ ہی آپ کچھ باتیں کرتا اور کبھی اس کی جانب اشارے کرتا نظر آتا اور آگ سے اس کا اس طرح ڈرنا...... سامنے درخت پر بھی جب چڑیائیں آتیں تو خاموش ہی رہتیں۔ جیسے کوئی خوف انہیں چپ رکھتا تھا اور خاوند بھی زیادہ تر اپنی عبادت اور قرآن خوانی میں گم نظر آتا۔ وہ اس سے باتیں اسی وقت کرتا اور اس کے جسم کی گرہیں اسی وقت کھلتیں جب اسے اپنی بیوی کے جسم کی طلب ہوتی۔ وہ اپنے خیالوں میں مبتلا رہی۔ واجد کے بوسے، اس کی داڑھی اور مونچھ کے بال جو اس کے لبوں، رخساروں اور گلے میں گڑ رہے تھے، وہ شاداں کے جسم میں کوئی آگ، کوئی تڑپ نہیں بیدار کر سکے۔ واجد نے جب تک چاہا اپنی ضرورت پوری کی۔ اس کے بعد اسے کچھ سکون سا ہوا۔ اس کی تیز سانسوں کی رفتار میں کمی ہوئی اور ان کی آگ بجھ سی گئی۔ اسے اپنی بیوی عزیز محسوس ہوئی جس نے ابھی اسے مسرت دی تھی۔ اس کے جسم کے کھولتے لاوے کو جذب کر لیا تھا۔ تاریک حجرے کی چھت میں کوئی کیڑا کٹ کٹ کر رہا تھا۔ دور سے زخمی درندے کی طرح مگن شاہ کی چیخیں آ رہی تھیں۔ اس چیخ میں فریاد تھی لیکن اس کا سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

''مگن شاہ آگ سے کیوں اتنا ڈرتا ہے؟'' شاداں نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

واجد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اکثر اس بابت سوچا تھا لیکن وہ نہیں سمجھ سکا۔ اس وقت بھی مگن شاہ کی وہ ساری زندگی اس کے سامنے آ گئی جسے اس نے اس کے ساتھ گزاری تھی۔ اس دوران کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا جو مگن شاہ کے خوف کی راز کشائی کرتا۔

''شاید...... شاید اس میں شیطان چھپا ہے جو دوزخ کی آگ سے بہت ڈرا رہتا ہے۔'' واجد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اور...... اور اس کا نام مگن شاہ کیوں ہے؟'' شاداں نے ڈر کر واجد کے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے پوچھا۔''

واجد نے نرمی سے اپنا ہاتھ شاداں کے سر پر رکھا اور اسے سہلاتے ہوئے بولا۔

''تو جانتی ہے کہ وہ جو بولتا ہے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ مگن شاہ مشکل سے چار سال کا تھا جب وہ مجھے ملا۔ اس کے ماں باپ کہتے تھے کہ یہ اللہ کی سوچ میں گم رہتا ہے۔ گاؤں والے اسے مگن شاہ کہنے لگے۔''

"تو کیا تم بھی اسے اللہ والا سمجھتے ہو؟" شاداں نے اپنے خاوند کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

شاداں کے معصوم لیکن مشکل سوال پر واجد زیر لب مسکرا دیا۔ اس نے بیوی کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ تاریکی میں دھندلا دھندلا سا اُجالا اسے نظر آیا۔ بیوی کی آواز میں نرمی اور اپنا پن کا اسے شدید احساس ہوا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ کوئی اور بات ہو۔ ملن شاہ کا ذکر شاداں نہ کرے۔

"اللہ کیا اور کیوں کرتا ہے ہم انسان نہیں سمجھ سکتے۔ میرے لئے ملن شاہ خبیث ہے۔ اگر اس نے خانقاہ میں قدم بھی رکھا تو میں اسے مار ڈالوں گا۔"

شاداں ڈر سے کانپ گئی اور سمٹ کر واجد سے الگ ہو گئی۔

"تم اس کی جان لو گے۔ شاہ جی۔ تم سچ مچ مار دو گے کسی کو؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ چھوڑ ان باتوں کو اب پھر سے میرا دل خوش کر۔" واجد بولا اور شاداں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

دور جہاں خانقاہ کا کھلا آنگن چراگاہ سے ملتا تھا وہاں ملن شاہ زخم کی ٹیس سے چیخ چیخ کر رحم اور مدد طلب کر رہا تھا۔ لالٹین سے اس کی گردن جلی تھی۔ لیکن اس کی اذیت اس خوف سے تھی جسے لالٹین کی لو نے بے رحمی سے جگا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں الفاظ گڈ مڈ ہوتے اور خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا کر بے جان ہو جاتے تھے، جہاں نیکی اور بدی کی کشمکش میں کبھی کبھی بدی اچانک زور آور ثابت ہو جاتی تھی۔ جہاں دھند سی رہتی تھی جس میں بہت ساری یادیں ہمیشہ کے لئے گم ہو چکی تھیں، اس کے ذہن میں ایک تصویر الاؤ کی طرح تھی جس میں اس کا گاؤں جل رہا تھا۔ گھروں کی چھتوں سے آگ نکل رہی تھی۔ مرد و عورت اور بچے آگ میں لپٹے ہوئے چیخ رہے تھے اور گاؤں پر اور اس کے گرد بم پھٹ رہے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی پہلی جنگ جو تباہی اس کے گاؤں پر لائی تھی اسے وہ نہیں بھلا سکا تھا۔

۱۷

واجد کو رات بھر نیند نہیں آسکی تھی۔ اس نے بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی۔ رہ رہ کر اسے مگن شاہ کا خیال آیا۔ واجد کو پتہ تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا۔ خانقاہ کے علاوہ کہیں اور اس کا گزر نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر وہ آگیا تو اس سے وہ کس طرح نپٹے گا۔ واجد کو موہوم سی امید تھی کہ شاید گشتی سپاہی رات کے اندھیرے میں اسے دشمن سمجھ کر اس کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن وہ ادھر کم ہی آتے تھے۔ وہ پہاڑی جو کالا دیو اور خانقاہ کے درمیان حائل تھی اس نے ان کا راستہ روکے رکھا تھا۔

واجد نے رات بھر کان کھڑے رکھے۔ لیکن گولی چلنے کی آواز نہیں آئی۔ صرف مگن شاہ کے چیخنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اگر مگن شاہ نے خانقاہ میں قدم رکھا تو وہ آگ سے اس کا استقبال کرے گا۔ اسے مارنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آگ اسے دور رکھے گی۔ مسلسل فاقے سے اس پیٹو کی جلد موت ہو جائے گی۔ کچھ دیر بعد مگن شاہ کی چیخیں بند ہوگئیں۔ لیکن واجد کے ذہن سے اس کا خیال نہیں گیا۔

شوہر کی بیقراری سے بے خبر شاداں گہری نیند میں ڈوبی تھی۔ شوہر کی قربت میں جو سکون، آرام اور تحفظ کا احساس تھا اس نے اسے دنیا کی ہلچل سے دور کر دیا تھا۔ واجد نے اس کی آنکھوں کو نرمی سے چھوا پھر اس کی انگلیاں شاداں کے گالوں پر سرکیں۔ ان گالوں کا نرم اور گرم احساس اسے ہوا۔ بیوی کی گرم سانس نے اس کی کلائی کے بالوں کو ہلکی سی لرزش دی۔ شاداں جاگی نہیں۔ وہ فرحت اور امن کی دنیا میں گم تھی۔ واجد کو بیوی کے جسم کی طلب نہیں محسوس ہوئی۔ مگن شاہ اس کے ذہن پر ایک جن کی طرح سوار تھا جو خانقاہ اور اس کی زندگی کو

درہم برہم کر سکتا تھا۔

حجرے کی دیوار میں بنے دو بڑے سوراخوں میں واجد نے صبح کو جھانکتے دیکھا۔ حجرے کے باہر چارپائی کی چرمراہٹ ہوئی۔ واجد لالٹین اٹھائے باہر نکلا۔ مگن شاہ اپنے سر کو بازوؤں میں چھپائے سو رہا تھا۔ دور دور تک سرمئی دھند تھی جس میں درخت درویشوں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی اور کچھ فاصلے پر کالا دیو اس دھند سے اُبھر آیا تھا، جیسے جاننے کے لئے کہ کیا ہونے والا ہے؟ واجد نے مگن شاہ کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچا۔ مگن شاہ چونک کر جاگ اٹھا۔ اس نے دیکھا واجد تنا کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے اور چہرے پر ڈراؤنی مسکراہٹ تھی وہ ایک پراسرار جادوگر لگا جو لالٹین کو ہلا ہلا کر کوئی مہلک سحر کرنا چاہتا تھا۔ واجد کو رات کے وقت مگن شاہ کی جس طاقت کا اندازہ ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ اپنی طاقت سے مگن شاہ کو زیر کرنا ناممکن ہوگا۔ وہ لالٹین کو مگن شاہ کے چہرے کے قریب لے آیا اور اپنے الفاظ کو چباتے ہوئے بولا۔

''مگن شاہ...... دور ہو یہاں سے...... اگر تو نے خانقاہ میں کبھی قدم بھی رکھا تو میں تجھے جلا ڈالوں گا۔''

مگن شاہ اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا ہوا بھاگا۔ وہ دیر تک جنگل اور چراگاہ میں پھرتا رہا۔ اکثر اس کی نگاہ خانقاہ کی جانب جاتی لیکن اس جانب قدم اٹھانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ دھوپ نکل آئی اور ایک سنہرا غبار چھا گیا۔ جنگل اور چراگاہ کی گھنی گھاس میں زندگی کی سرسراہٹ ہونے لگی۔ مگن شاہ بھوک سے بیتاب کبھی جنگل میں جاتا اور کبھی میدان میں واپس آتا۔ جہاں اب بکریاں اور بھیڑیں اپنے گلہ بانوں کے ساتھ آگئی تھیں۔ گڈریوں کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مگن شاہ کو ایک بھورے رنگ کی بکری اپنے بچے کو دودھ پلاتی نظر آئی۔ وہ اس کی جانب بھاگا۔ بکری کے بچے کو اس نے ایک جھٹکے سے ہٹایا اور قبل اس کے کہ بکری وہاں پر سے بھاگتی اس نے اس کے چاروں پیروں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بکری کے تھن سے اپنا منہ لگا دیا۔ بکری کا گرم، شیریں اور کچھ نمکین دودھ اس کے حلق میں بہنے لگا۔ چند قطرے اس کے منہ سے نکل کر اس کی ٹھوڑی اور ننھی داڑھی پر بھی بہہ آئے۔ بکری بہت تڑپی اپنی ٹانگوں کو زور زور سے ہلاتی رہی لیکن وہ خود کو مگن شاہ کی گرفت سے آزاد نہیں کر سکی۔ گڈریا بچے اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ لگانے لگے۔

''مگن شاہ۔ تو پاگل ہے۔'' ان میں سے ایک اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو ہلاتے ہوئے بولا۔ لیکن مگن شاہ نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ اس کے ہونٹ بکری کے تھن سے چپکے تھے اور گال زور زور سے حرکت کر رہے تھے۔ جب وہ سیر ہوگیا تو اس نے بکری کو آزاد کر دیا۔ وہ ممیاتی ہوئی بھاگی۔ مگن شاہ نے اسی طرح آواز نکالی اور ہنس پڑا۔ پھر وہ ہاتھوں اور پیروں پر ان ہی جانوروں کی طرح چلنے لگا۔ ایک گڈریا بچہ آیا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ مگن شاہ خوشی خوشی اسے پھرانے لگا۔ کبھی کبھی وہ ممیاتا اور زور سے قہقہہ لگاتا۔ باری باری سبھی بچے آتے اور مگن شاہ کی پیٹھ پر بیٹھ کر سواری کرتے۔ جب وہ ہنستے تو مگن شاہ بھی ان کے ساتھ زور سے ہنستا۔ جو مسرت مگن شاہ کے دل میں اٹھ رہی تھی وہی ان کے دلوں میں بھی تھی۔ ایک معصوم خوشی تھی جس نے ان سب کو ایک کر دیا تھا۔ ایسی شادمانی جس میں آج کیا ہوگیا اور کل کیا ہوگا خیال میں بھی نہیں آتا۔

اچانک انھیں چند رائفل بردار سپاہی بھاگتے ہوئے اس پہاڑی کی جانب جاتے نظر آئے جو کالا دیو کے راستے میں آتی تھی۔ انھیں دیکھ کر مگن شاہ کھڑا ہوگیا۔ جو بچہ اس کی پشت پر سوار تھا وہ پھسل کر گھاس پر گر پڑا۔

''اللہ اکبر۔'' جوش سے مگن شاہ نے نعرہ لگایا۔ اس کی ننھی آنکھیں پھیل کر بڑی ہوگئی تھیں اور اس کا سینہ تن گیا تھا۔

سپاہیوں نے سنی ان سنی کر دی۔ ایک افسر نے انھیں کچھ ہدایت دی۔ چند جنگل میں چلے گئے اور چند افسر کے ساتھ پہاڑی کی جانب ہو لئے۔

کرنل حنیف اس دن تقریباً پاگل ہو گئے تھے۔ کوٹلی کی وادی میں جنگ بندی لکیر کے قریب جو چند کٹیائیں ان کے زیرنگیں تھیں وہاں کے لوگ دہائی دیتے ہوئے چھاؤنی میں آئے۔ ایڈجوٹنٹ نے کرنل حنیف کو خبر دی کہ دشمن کے سپاہی ایک بھینس کو بھگا کر اپنے علاقے میں لے گئے ہیں۔ کرنل حنیف کو سخت بے عزتی کا احساس ہوا۔ ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آنکھیں نکل آئیں اور چندلے سر پر گدلے بال کی جو جھالر تھی وہ تقریباً کھڑی ہوگئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کالا دیو پر مقیم کمپنی کمانڈر میجر طارق کو فون کیا۔

''میجر طارق...... تم کیا سو رہے تھے؟ تمہاری ناک کے نیچے سے بھینس دشمن لے گیا ہے۔'' کرنل حنیف چیخے۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

"سر! کمپنی لڑائی کے لئے بالکل تیار ہے۔ میں نفری لے کر بھینس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔" میجر طارق کی آواز ادھر سے آئی۔

"جلدی کرو ورنہ اس بھینس کو وہ لوگ غارت کر دیں گے اور یاد رکھو تمہارا نام طارق ہے اس دلیر کا نام جس نے اسپین فتح کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں بھینس حاصل کرنے کے لئے اپنی جان لڑا دوں گا۔"

جن سپاہیوں کو مگن شاہ اور گڈریوں نے تیز چلتے ہوئے دیکھا تھا، وہ وہی سپاہی تھے جنھیں میجر طارق ساتھ لے کر بھینس کو حاصل کرنے نکلے تھے۔ میجر طارق جلد ہی چنار کے درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ گئے جہاں سے نشیب میں جنگ بندی لکیر کی دوسری جانب کشمیر کا وہ علاقہ تھا جو ہندوستانی حکومت کے زیرِنگیں تھا۔ جنگ بندی لکیر چٹیل میدانوں اور بنجر پہاڑوں پر سے نہیں گزرتی تھی۔ وہ ہرے بھرے کھیتوں اور کہیں کہیں پر گاؤں کے درمیان سے بھی گزرتی تھی۔ میجر طارق جس پہاڑی پر پہنچے اس سے تیس گز کے فاصلے پر نیچے وہ سماں انھیں نظر آیا کہ ایک گھٹی ہوئی آہ ان کے منہ سے نکل گئی۔ وہاں ایک جشن ہو رہا تھا۔ بھینسے کے سیاہ جسم پر سفیدی سے سواستکا کا نشان بنانے کے علاوہ اس کی سینگوں کو سیندور سے رنگ دیا گیا تھا۔ بھینسے کے گلے میں گیندے کے زرد پھولوں کا ہار بھی میجر طارق کو نظر آیا۔ چند مرد اور عورتوں کے علاوہ تین سپاہی بھی انھیں بھینسے کے گرد دکھائی دیئے۔ لیکن سب سے ہولناک سماں اس سادھو نے باندھ دیا تھا جو بھبھوت ملے اور ایک ترشل اٹھائے ننگ دھڑنگ رقص کر رہا تھا۔

"کرنل صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نامراد دشمن بھینسے کی ذات بدل دیں گے۔" میجر طارق کراہتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھوں میں اداسی تھی اور مارے بے بسی کے منہ کھلا تھا۔ ان سے ضبط نہیں ہو سکا وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ایک پاکستانی سپاہی کو دیکھ کر جنگ بندی لکیر کی دوسری جانب بھی جوش میں آ گئے اور نعرے لگانے لگے...... 'پاکستانی بھینسا مردہ باد...... ہندوستانی بھینسا جندہ باد'

ننگ دھڑنگ سادھو اور بھی جوش میں آ گیا۔ اس کے رقص میں اور بھی پھرتی آ گئی۔ اس کے زیرِ ناف کے اعضا نے ارد گرد کھڑی عورتوں کی نگاہوں کو مرکوز کر لیا۔ میجر طارق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ اگر وہ دھاوا کرتے ہیں تو عین ممکن تھا کہ جنگ نہ صرف یہاں پر شروع ہوتی بلکہ جنگ بندی لائن کے ساتھ تمام علاقوں میں پھیل جاتی اور یہ بھی ممکن تھا ہندوستان اور

پاکستان کے مابین پوری شدت سے جنگ ہونے لگتی اور پاکستانی سپاہی شہید ہونے کے بعد جب آسمان کی جانب روانہ ہوتے تو ان کے ساتھ بھینسے کی روح بھی ماتم کناں ہوتی۔ وہ واپس درختوں کے پیچھے چلے گئے۔ اکتائے ہوئے بھینس کو میجر طارق کے تذبذب کی خبر نہیں تھی۔ اس کے گرد جو ہنگامہ ہو رہا تھا اس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ تنگ آکر اس نے سادھو کے چوتڑ پر اس زور سے ڈھونس ماری کہ وہ ہوا میں اڑتا نظر آیا اور ساتھ ہی وہ بھینسا بھاگا۔

''دغاباز...... غدار...... تو دشمن کے گھروں کی جانب بھاگ رہا ہے۔'' میجر طارق دانت بھینچتے ہوئے بولا۔

پھر ایک سنسناتی ہوئی گولی چلی۔ وہ لوگ جو بھینسے کے غصے سے خائف ہو گئے تھے، ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ سادھو اپنے چوتڑ کو سہلاتا لنگڑاتا ہوا پناہ کی تلاش میں دوڑا۔ دشمن کے سپاہیوں نے رائفلیں سنبھال کر چٹانوں کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ لیکن گولی صرف ایک ہی بار چلی تھی اور مرنے والا بھینسا تھا جو اپنی مردہ آنکھوں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ جیسے خدا سے پوچھ رہا ہو کہ میں نہ وفادار تھا اور نہ ہی غدار۔ مجھے مارنا ہی تھا تو پیدا کیوں کیا؟

''خنزیر...... بے غیرت غدار۔'' میجر طارق بڑبڑایا اور اپنی رائفل کو کندھے سے لٹکا لیا۔ سپاہیوں کو اس کے چہرے پر فتح مندی کی مسرت نظر آئی۔

میجر طارق کو حکم دینے کے بعد کرنل حنیف نے اپنے ایڈجوٹنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ انٹیلی جنس کا جو نائک بٹالین کے ساتھ کام کرنے آیا ہے اسے آس پاس کے گاؤں میں جا کر دشمن کے جاسوسوں کا پتہ کرنا ہے۔ جن کے بغیر بھینسے کا اغوا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ایڈجوٹنٹ کیپٹن عظمت نے نائک کو اپنے دفتر میں بلایا اور مناسب ہدایتیں دیں۔ نائک غور سے سنتا رہا۔ سیاہ رنگت، چہرے پر کیل مہاسے کے گہرے داغ اور گھنی مونچھیں۔ اگر وہ وردی میں نہ ہوتا تو ڈاکو لگتا۔ اس کا قد ایڈجوٹنٹ سے نکلتا ہوا تھا۔

''دیکھو نائک...... دشمن نے ہماری غیرت پر حملہ کیا ہے۔ آج وہ ہمارے علاقے سے بھینسا لے گئے۔ کل وہ کسی گاؤں والے کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ اس طرح ان کی ہمت بڑھتی جائے گی اور ہو سکتا ہے کل کو وہ ہماری کسی چوکی پر بھی اچانک حملہ کر دیں۔ ہمیں یقین ہے آس پاس کے گاؤں میں دشمن کے جاسوس موجود ہیں۔ ہمیں ان کا پتہ لگانا ہے۔''

جب تک وہ حکم سنتا رہا اس کی آنکھیں ایڈجوٹنٹ پر گتھی رہیں۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا

تھا......"آج مجھے موقع آخر مل ہی گیا۔ میں ثابت کر کے رہوں گا میرا کام کتنا اہم ہے۔ اگر میں نے جاسوس کو نہیں پکڑا تو میں خود کو رجمنٹ کے باورچی سے بھی بدتر سمجھوں گا۔" اس طرح کے کاموں میں کامیابیوں کے بعد وہ ترقی کر کے ایک دن جنرل بھی بن سکتا ہے۔ نائک کی سوچ میں یہ نکتہ بھی تھا۔

"ٹھیک ہے سر......اس کام کو مجھ پر چھوڑ دیں۔" نائک متکبرانہ لہجے میں بولا۔

نائک بیرک میں واپس آیا اور وردی اتار کر اس نے سفید قمیص اور شلوار پہنی۔ ایک ٹوپی کو قرینے سے سر پر رکھنے کے بعد آئینہ میں اپنا عکس دیکھا۔

"اب میں سوداگر لگ رہا ہوں اور مجھے اپنی تجارت کو خوشی کے ساتھ ملا کر معجون بنانا ہے۔" نائک نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی۔

دوپہر کا وقت تھا اور سپاہی باہر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ اس نائک کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ اس کچی سڑک پر ہولیا جو بچنی کو جاتی تھی۔ گنے کی فصل تھی اور گاؤں والے وہیں مصروف نظر آئے۔ سڑک پر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ دھوپ تیز تھی۔ اگر کوئی چلنے والا منہ پر ڈھاٹا باندھے تیز چلتا نظر آیا تو اس پر شبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن سڑک پر سوائے ایک مریل بیل، جس کی پشت پر ایک کوا بیٹھا تھا، کچھ اور دور دور تک نظر نہیں آیا۔ وہ دو تین کٹیائیں جو سڑک کے ساتھ تھیں وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے ایک کٹیا نظر آئی جس کے سامنے درخت کے نیچے ایک درمیانہ عمر کا انسان اپنے ہل کی مرمت کر رہا تھا۔ اس کے پاس ہی اس کی نوجوان بیٹی بکری کے بال سے رسی بن رہی تھی۔ دونوں نے نائک کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے یہ جاسوس ہوں۔ سارے لوگ کھیتوں میں مصروف ہیں لیکن یہ شخص اطمینان سے اپنے گھر میں معمولی سا کام کر رہا ہے۔" نائک اپنے دل میں بولا اور اس شخص کو سلام علیکم سے مخاطب کیا۔ اس شخص نے چونک کر نائک پر نگاہ ڈالی اور سلام کا جواب دے کر ہتھوڑے کو ایک جانب رکھ دیا۔ جیسے اسے علم تھا کہ نووارد اس سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ قریب ہی کاشت کی ہوئی زمین تھی جہاں کی پیداوار مشکل سے ایک کنبہ کا پیٹ پال سکتی تھی۔

"لگتا ہے گیہوں کی کٹائی ہو چکی ہے۔ بیچنا ہے اسے؟" نائک نے پوچھا۔ وہ دہقان ایک خشک ہنسی ہنسا۔

"گیہوں؟ ہمارے پاس؟" وہ کسان بولا اور پھر ہنسا۔ اس کے سکڑے ہوئے چہرے پر بے یقینی کی پرچھائیں تھی۔ وہ نائک کو شبہ کی نگاہوں سے تکنے لگا۔

"ہاں۔ ہاں۔ گیہوں۔ میں میر پور سے اسے خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے خچر رجمنٹ کے بارک کے باہر کھڑے ہیں۔ تیار ہو جا۔ میں انھیں لے آتا ہوں۔"

"چودھری...... مجھے کہیں سے تھوڑا آٹا لا دو۔ میں کسی طرح اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔" کسان اپنے پتلے کھردرے ہاتھوں کو نائک کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولا۔

"یہ سامنے کی زمین تیری نہیں ہے؟"

"میری؟ نہیں۔ یہ ہم تین بھائیوں کی ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے اس کا تھوڑا حصہ مل جاتا ہے۔"

"پھر یہ ہل کس کے لئے تو مرمت کر رہا ہے۔"

"پڑوسی کے لئے۔ کچھ اجرت مل جائے گی۔ کچھ دن اور گزارا ہو جائے گا۔"

"ارے نادان۔ ہم بھی غریب ہیں۔ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے۔ تیری بیٹی جب بیاہی جائے گی تو اسے جہیز تو دے گا۔ اس کے لئے تو نے کچھ روپیہ پیسا تو جمع کیا ہوگا۔" نائک نے اطمینان سے کہا۔ وہ اس کسان کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا جو زمین پر پڑی کنکریوں کو ٹھوکے مار رہا تھا۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ شاید باتوں باتوں میں کوئی سراغ مل جائے۔

"یہ پیدا نہ ہوئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ اس کی ماں ایک بس ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی اور سارا بوجھ مجھ پر ڈال گئی۔" کسان نے کسی قدر غصے سے نائک کو دیکھتے ہوئے کہا جیسے بیوی کے بھاگ جانے میں اس کی ذمہ داری بھی تھی۔ پھر اس نے گفتگو جاری رکھی۔ "ہم کبھی پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھاتے۔ میں اسے چھوڑ کر کام کی تلاش میں شہر بھی نہیں جا سکتا۔ یہ کام ختم ہو جائے گا اس کے بعد کئی دنوں تک بیکاری ہو گی۔ بیچنے کے لئے گیہوں؟ بیٹی کے لئے جہیز؟ یہ سب خواب ہیں۔ ہائے میرا مقدر۔" کسان نے سسکی لے کر بات ختم کی۔

نائک کی نگاہ بار بار کسان کی نوجوان بیٹی پر بھٹک جاتی تھی۔ اس کا میلا زرد دوپٹہ سینے پر سے سرک گیا تھا۔ لڑکی کے پستان نائک کی آنکھوں کو گرم کرنے لگے۔ بکری کے بال لڑکی کی ایک پیر کے بڑے انگوٹھے سے لپٹے تھے۔ لڑکی اسے کھینچتی اور دونوں ہتھیلیوں کی مدد سے مل کر ڈور بناتی جاتی۔ جوان نائک کی بیباک نگاہوں کو اس نے محسوس کر لیا۔ جس سے اسے میٹھی سی خوشی ہوئی۔ اس نے دوپٹے سے اپنے سینے کو ڈھکنے کی کوشش نہیں کی۔

''ادھر جو لوگ رہتے ہیں انھیں کھیت سے بلا لا۔ ان کے پاس بیچنے کے لئے گیہوں ضرور ہوگا۔'' نائک کو خیال آیا کہ جب یہ شخص ادھر جائے گا تو اسے اس لڑکی کے ساتھ تنہائی مل جائے گی اور وہ اپنی ضرورت پوری کر لے گا۔

''میں ہل بھی نہیں سکتا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اجنبی کے ارادے کو بھانپ کر کسان نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

نائک کو کامیابی کی امید نہیں رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کسان کو غور سے تکتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

''دن گرم ہو چلا ہے۔ مجھے بنجنی جانا ہے، کوئی چھوٹا راستہ ہے ادھر کا؟''

''تم اس راستے سے دور نہیں ہو۔ سامنے درختوں کے بیچ سے جو پگڈنڈی جاتی ہے وہ تنگ ضرور ہے اور کھڑی چڑھائی پر چڑھتی ہے۔ لیکن تم جلد پہنچ جاؤ گے۔ راستے میں ایک چشمہ ملے گا اسی کے ساتھ جو چڑھائی ہے اس پر جانا۔ اس کے بعد فوراً ہی بنجنی گاؤں ہے۔'' کسان نے ہاتھ سے اشارا کرتے ہوئے کہا۔

''میں پھر آؤں گا۔'' نائک نے معنی خیز نگاہوں سے باپ بیٹی کو تکتے ہوئے دھمکی دی۔

''تم فوجی ہو۔ جو جی میں آئے کرو۔'' کسان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ نائک نے جس تحکمانہ لہجے میں بات کی تھی اس کی وجہ سے کسان سمجھ گیا تھا کہ وہ فوجی ہے۔ نائک کچھ بولا نہیں، وہ اس راستے پر ہو لیا جس کا پتہ کسان نے دیا تھا۔

شاداں نے گندے کپڑے سمیٹے اور اس چشمے کی جانب چل دی جہاں گاؤں کی عورتیں نہانے دھونے جاتی تھیں۔ ترائی پر کچھ دیر چلنے کے بعد جہاں بلند چٹانوں نے دور تک ڈھلان کو ڈھکا ہوا تھا وہیں پر چٹانوں سے نکلتے پانی نے ننھا سا تالاب بنا دیا تھا۔ مرد کبھی ادھر نہیں بھٹکتے تھے اور ترائی کی وجہ سے چشمہ بنجنی سے چھپا ہوا تھا۔ چشمہ کے قریب پہنچ کر شاداں نے کپڑے دھوئے اور پھر تالاب کے اندر چلی گئی جہاں پانی اس کی کمر تک پہنچتا تھا۔ وہ بیٹھ گئی اور اپنی شلوار کو اتارا اور پھر قمیص بھی اتار دی۔ خنک اور سبز پانی نے اس کے پستانوں کو جب گدگدایا تو ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ چلّو میں پانی بھر بھر کر اس نے منہ دھویا اور کنارے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ سورج کی کرنیں درختوں کی شاخوں سے چھنتی ہوئی

اس کے چہرے اور اس کے کھلے جسم کو سنہرا کرنے لگیں۔ شاداں نے اپنی ٹانگوں کو تیز حرکت دی۔ پانی کی بوندیں اڑیں اور کرنوں نے انھیں ست رنگا کر دیا۔ درختوں میں سرکتی ہوا جیسے ہنس دی۔ فرحت اور سکون کے احساس نے شاداں کو نیم خوابیدہ سا کر دیا۔ اردگرد، نیچے کیا ہو رہا تھا اس سے وہ بے خبر تھی اور نہ ہی شاداں کو گمان تھا کہ بلندی پر جہاں سے چشمہ تک جانے والی پگڈنڈی نیچے اترتی تھی، وہاں جھاڑیوں میں چھپا مگن شاہ محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جنگل میں پھرتا پھراتا ادھر آنکلا تھا اور شاداں کو چشمہ میں دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے تھے اور وہ چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ زمردیں پانی میں ڈوبا اس کا نصف جسم اور اس کے گالوں اور سینے پر مچلتی روشنی اور سائے کا کھیل، مگن شاہ کو تیز گدگداہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے منہ سے مسرت سے بھرپور چیخ نکل گئی۔ شاداں چونک پڑی۔ اس نے ڈر کر اردگرد دیکھا اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ تیزی سے پانی سے نکلی اور اپنے کپڑے اٹھا کر پاس کے غار میں جا کر جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی۔ باہر آکر اس نے ڈری ہوئی نگاہ پھر ادھر ادھر ڈالی۔ دور دور تک اونچے درختوں کی سبز رنگت کا دھواں دھواں سا تھا۔ اسے نہ انسان اور نہ ہی جانور نظر آئے۔ جو آواز اس نے سنی تھی وہ یقیناً کسی انسان ہی کی تھی۔ لیکن اس وقت سوائے ہوا کی سرسراہٹ کے کچھ اور سنائی نہیں دیا اور یہ سرسراہٹ بھی اسے اجنبی لگی اور درختوں کی شاخیں پاگل فقیروں کی بانہوں کی طرح اس کی جانب بڑھتی محسوس ہوئیں۔ اس نے جلدی جلدی کپڑوں کو سمیٹا۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شاداں نے مڑ کر دیکھا۔ جو اجنبی اسے نظر آیا وہ فوج کا وہی نائک تھا جو کچھ دیر پہلے کسان سے پنجنی کا راستہ پوچھ کر ادھر آنکلا تھا۔ چہرا پسینہ سے تر اور آنکھوں میں چمک۔ اس کی لالچی نگاہیں شاداں کے دھلے چہرے اور بھیگے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔

کڑی چڑھائی طے کرنے کے بعد اسے اپنی محنت کا ثمر سامنے نظر آیا۔ اس نے اپنے سر کو آہستہ آہستہ ہلایا اور ٹوپی کو پیچھے سرکایا۔ اس کے بالوں کی لٹیں پیشانی پر آگئیں۔ اس کا چہرہ شاداں کو بھیانک لگا اور سنسناتے ہوئے خوف نے اس کی طاقت سلب کر لی۔ اس نے جانے کے لئے جوں ہی قدم اٹھایا نائک نے راستہ روک لیا۔

"پنجنی کدھر ہے؟"

"ادھر پہاڑی کے اوپر۔" شاداں نے ہاتھ سے اشارا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ذراہٹ...... مجھے پیاس لگی ہے۔"

شاداں اس کے اور تالاب کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ ہٹ گئی۔ نائک بڑھا اور چلو میں پانی بھر کر پینے لگا۔ شاداں نے وہاں پر سے بھاگنا چاہا۔ لیکن نائک تیزی سے مڑا اور لپک کر اسے اپنی آغوش میں لے کر ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے کپڑوں کو گرا کر بولا۔

"جاناں...... پانی تیرے ہونٹوں کی طرح میٹھا نہیں ہے۔" نائک پھنکارا اور اس نے اپنے خشک لبوں کو شاداں کے لبوں سے چپکا دیا اور اس کے ہاتھ شاداں کی ران اور کولھے کو مسلنے لگے۔

"کمینے...... مجھے جانے دے...... میں پیر کی ٹہر ہوں۔" شاداں مرد کی آغوش میں تڑپتے ہوئے چیخی۔

"میں بھی پیر ہوں۔ اب مرشدوں جیسا مزا بھی لوٹنے دے۔" نائک بولا اور اس نے پھر شاداں کو سختی سے چوما۔

"آہ...... شاہ جی!" شاداں نے بے بسی سے اپنے خاوند کو پکارا اور جو بھی طاقت اس کے جسم میں تھی اس سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے نائک کی قمیص کو نوچا، اور اپنے ناخنوں سے نائک کے چہرے اور گردن پر خراشیں لگائیں۔ مارے شرم کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دیوانگی سے بھرپور اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔

"چپ رہ۔ نہیں تو میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔" نائک کے خشک منہ سے پُر ہیجان آواز نکلی اور ساتھ ہی اس نے دو تین زور کے تھپڑ شاداں کو مارے۔ اسے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ خوف سے شاداں کی آواز نے دم توڑ دیا۔ نائک اسے اٹھا کر غار کے اندر لے آیا۔

مگن شاہ ساری واردات پہاڑی پر سے دیکھتا رہا تھا۔ شاداں اس کی تھی۔ راتوں کو جو اس کے پاس آتی رہی تھی وہ یہی عورت تو تھی۔ اسی نے محبت دی تھی اور اس کے جسم سے جو تسکین اسے ملی تھی، اس نے شاداں کو اس کی روح میں بسا دیا تھا۔ وہ عورت اس سے چھین لی گئی تھی اور آج کوئی اور اسے اپنا رہا تھا۔ غصہ اور حسد سے وہ چیخا۔ جو الفاظ اس کے منہ سے نکلے ان کا سمجھنا مشکل تھا۔ وہ پہاڑی کی ڈھلان پر تیزی سے اتر کر غار کی جانب دوڑا۔

شاداں کی شلوار کو نائک نوچ کر اتار چکا تھا اور اپنے جسم کے تڑپتے مرد کو ملبوس سے آزاد کر کے وہ مجبور عورت سے لپٹنے ہی والا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے سر کے بالوں کو اس زور سے کھینچ رہا ہے جیسے اس کی کھوپڑی اکھاڑ پھینکے گا۔ اس کی آنکھیں نکل آئیں۔

مگن شاہ نے نائک کو کھینچ کر زمین پر گرادیا اور اپنے پیر سے نائک کے منہ کو کوٹ کوٹ کر پستہ بنادیا۔ اس کے لب پھٹ گئے اور ٹوٹے دانت اور ٹوٹی ناک سے خون بہنے لگا۔ نائک نے مگن شاہ کی ٹانگ کو پکڑا لیکن اس کی طاقت کا مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کراہتا ہوا کسی طرح اٹھا اور اس نے مگن شاہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ یہ حملہ کچھ اس طرح اچانک ہوا تھا کہ نائک کے لئے مدافعت مشکل ہو رہی تھی۔ شاداں جوں ہی نائک کی گرفت سے آزاد ہوئی وہ روتی چیختی گاؤں کی جانب بھاگی۔ مگن شاہ اور نائک ایک دوسرے سے گتھے غار کے باہر پگڈنڈی پر آگئے۔ مگن شاہ نے نائک کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ چٹان سے جاٹکرایا اور اس کے سر پر اس زور سے چوٹ لگی کہ اردگرد کے پہاڑ، درخت اور آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے، اور اس گھومتے، بہتے منظر میں اسے مگن شاہ کی شعلہ بار آنکھیں نظر آئیں اور اس کا پاگلوں کی طرح ہنسنا سنائی دیا۔ اس کے سر پر میلی فوجی ٹوپی، ڈھیلی لمبی قمیص کی جیب میں کسی چڑیا کے سفید پر اور پھٹی شلوار، گلے میں سیاہ تعویذ جسے اس نے خانقاہ سے اٹھا لیا تھا، اس کی ننھی داڑھی اور مونچھ اور اس کی مچی ہوئی آنکھیں۔ اس کے علاوہ اس کی غیر معمولی طاقت، نائک نے سمجھ لیا کہ خدا نے اسے سزا دینے کسی جن کو بھیج دیا ہے۔ وہ کراہتا اور ''رحم۔ رحم'' پکارتا مگن شاہ کی جانب بڑھا۔ نائک کو اپنی شلوار کسنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ڈھیلی شلوار ٹانگوں کے نیچے جھول رہی تھی جس میں اس کے پیر الجھے اور وہ تنگ پگڈنڈی پر سے جھاڑیوں اور چٹانوں سے ٹکراتا نیچے کھائی میں جا گرا۔ اس کا سر ٹوٹ گیا اور ہاتھ پیر بھی ٹوٹ گئے۔

شاداں واویلا مچاتی خانقاہ میں آئی اور برآمدے میں بھیگے کپڑوں کو پھینک کر حجرے میں جا کر پلنگ پر گر گئی۔ نہ اس کی سسکیاں رک رہی تھیں اور نہ ہی اس کے آنسو تھم رہے تھے۔ واجد باہر درخت کے تنے سے پیٹھ لگائے اور آنکھیں بند کئے مراقبے میں تھا۔ اس کے گرد چند مرید عقیدت سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ شاداں کی چیخیں سن کر حیران ہو گئے اور چونک کر انھوں نے واجد کی جانب دیکھا۔ لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ جس دنیا میں وہ گم تھا وہاں اس دنیا کی چیخ، دردبھری پکار اور نالۂ وشیون نہیں جاتے۔ آخر کسی طرح شاداں کے رونے کی آواز اس تک پہنچی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحوں تک حجرے کی جانب دیکھتا رہا پھر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''شاہ جی تہاڈی عبادت اور نیکی کس کام کی جو میری عزت نہیں بچا سکی اور میری جان بھی

کوئی لینے والا تھا۔" شاداں نے ہاتھوں کو اٹھا کر خاوند سے شکوہ کیا۔ اس کے بال بکھر کر آنسوؤں سے تر اس کے چہرے پر آ گئے تھے اور ہچکیوں کی وجہ سے اس کا جسم ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکست تھی۔ ایک بزرگ کی بیوی ہونے کے باوجود کوئی اسے ناپاک کرنے جا رہا تھا۔ شاداں کو اپنے جسم میں اب بھی نائک کے پنجے گڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

واجد کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو تھپڑ مار دیا۔ کس نے ایسی ہمت کی ہوگی؟ اس نے سوچا۔ اسے اچانک مگن شاہ کا خیال آیا۔ وہی جنگل میں بے خطر پھرتا ہے اور جدھر چاہے پہنچ سکتا ہے۔ غصے سے واجد کے جبڑے کس گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ گھڑی انتہائی نحوست کی تھی جب اس نے مگن شاہ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی تھی۔ مرنے دیتا اسے۔ اتنے سارے لوگ مر جاتے ہیں۔ ایک نادان اگر بھوک اور غربت سے فنا ہو جاتا تو کون سی آفت آ جاتی۔ اس کی قضا میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ یہ ساری سوچ واجد کے ذہن میں بجلی بن کے کوندی۔

"اب مگن شاہ کا وقت آ گیا ہے، وہ درندہ ہے اس کا دنیا سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔" واجد دانت پیستے ہوئے بولا۔

"نہیں شاہ جی نہیں۔ مگن شاہ نے تو مجھے بچا دیا۔ وہ کوئی اور تھا۔ ہمارے گاؤں کا نہیں تھا۔ آس پاس کے مسکین بھی نہیں۔ انھیں تو ایسی سوچ آ بھی نہیں سکتی شاہ جی۔"

"پھر کون تھا اور کہاں ایسا ہوا؟"

"چشمہ پر...... جہاں کوئی مرد نہیں جاتا۔ وہاں وہ آ گیا۔"

بے انتہا غصے کی وجہ سے احتیاط اور دوری جنھیں واجد غیروں سے روا رکھتا تھا انھیں وہ بھول گیا۔ وہ باہر نکلا۔ سامنے بیٹھے حیرت زدہ لوگ جیسے وجود نہیں رکھتے تھے۔ دور جنگل، جھاڑیاں، پہاڑیاں اور پہاڑ، ان سب میں کہیں اس کا دشمن بھی تھا۔ ساتھ کی کوٹھری سے اس نے کلہاڑی اٹھائی اور چشمہ کی جانب چل دیا۔ اس کے مرید سمجھ گئے کہ کوئی سنگین واقعہ ہوا ہے، وہ بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔

ان سب کے جانے کے بعد شاداں کو پیٹ میں عجیب سی تکلیف کا احساس ہوا جو بڑھ کر اذیت ناک اینٹھن بن گئی۔ وہ کراہ اٹھی اور تکیہ میں دانت گاڑ دیئے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی گرم سیال شے اس کی رانوں کے درمیان آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے۔ "ماں" وہ بے اختیار پکاری اور اس کا ہاتھ پیٹ پر گیا۔ جس تشدد کا کچھ دیر پہلے وہ شکار ہوئی تھی اس کا خوفناک اثر اب ہو رہا

تھا۔ کسی غیر مرئی طاقت نے اسے بتا دیا کہ جو زندگی اس کے وجود میں پل رہی تھی اسے جبریہ کھینچ کر جدا کیا جا رہا ہے۔ ایک بار پھر شاداں نے ماں کو پکارا۔ وہی ایک ہستی جس کا وہ اس وقت سہارا لے سکتی تھی۔ شاداں نے اپنی ماں کو معاف کر دیا تھا۔

واجد اور اس کے ساتھی جب چشمہ پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ مگن شاہ تنگ پگڈنڈی پر اکڑوں بیٹھا نیچے کھائی میں کچھ دیکھ رہا ہے۔ سب کی نگاہ ادھر گئی۔ کھائی میں کسی کی نیم برہنہ لاش پڑی تھی جس کی کمر میں ایک پستول بھی تھا۔ ان سب کو سمجھنے میں دیر نہیں ہوئی کہ لاش کسی فوجی کی ہے۔ تو یہی فوجی اس کی بیوی کی عزت لوٹنے جا رہا تھا۔ لیکن مگن شاہ نے اسے کس طرح زیر کر لیا اور اسے مار بھی ڈالا۔ سوالات واجد کے ذہن میں آئے۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مگن شاہ سے جواب طلب کیا۔

مگن شاہ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا اور اپنے سر کو واجد کے بازوؤں سے رگڑنے لگا۔ اپنے آقا سے محبت کا یہی اظہار اسے آتا تھا۔ سبھوں کو مگن شاہ کے پیر پر خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آئے۔ واجد کو وہ رات یاد آئی جب مگن شاہ نے حجرے میں اس کو دھکا دے کر گرا دیا تھا اور شاداں کی جانب بری نیت سے بڑھ رہا تھا اور آج اس نے ایک فوجی کو قتل بھی کر دیا تھا۔ یہ عجیب و غریب مخلوق اس کی عزت کا دشمن اور اس کا محسن بھی نکلا۔ جو ذلیل حرکت مگن شاہ نے اس کے ساتھ کی تھی وہ کانٹا بن کر اس کے دل میں گڑی۔ اس نے مگن شاہ کو دھکا دے کر خود سے جدا کر دیا۔ جو لوگ ساتھ تھے ان کی سمجھ میں آ گیا کہ فوجی کے مارے جانے میں مگن شاہ کا یقیناً ہاتھ ہے۔ ان کے پیر کی بیوی کا بھاگتے ہوئے آنا اور حجرے کے اندر اس کے رونے کی آواز اور مگن شاہ کے پیر پر خون کے دھبے، نیچے کھائی میں فوجی کی لاش۔ وہ اس معمہ کو سمجھنے کے لئے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر سبھی چپ ہو گئے اور اپنے پیر کی جانب دیکھنے لگے۔ جیسے اس سے راز کشائی طلب کر رہے ہوں۔ لیکن واجد کے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔

کھائی میں فوجی نیم برہنہ پڑا ہے۔ کیا وہ میری بیوی کے ساتھ زنا کر رہا تھا اور مگن شاہ نے اسے پکڑ لیا؟ سوالات واجد پر ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے اور وہ ذلت اور خواری کے احساس سے کرب میں مبتلا تھا۔ واجد کو حقیقت جاننے کے لئے تجسس ہوا۔

"مگن شاہ۔ یہاں کیا ہوا تھا؟" واجد نے اذیت ناک لہجے میں پوچھا۔

"ہوا تھا۔" مگن شاہ کے ذہن میں ہمیشہ کی طرح خیال گڈمڈ تھے اور اس کی زبان پر آنے سے قاصر۔ اس نے واجد کے دو الفاظ دہرا دیئے اور واجد کو خالی نظروں سے گھورنے لگا۔

یا خدا میری مدد کر۔ واجد نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اس نے دنیا کے ہنگاموں سے دور جو متبرک کائنات بسائی تھی وہ غلیظ کیچڑ میں دھنستی جا رہی تھی اور وہ خود بھی اسی گندگی میں گر گیا تھا۔ اب کس طرح اس کی نجات ہوگی واجد سمجھنے سے معذور تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی آ گئی اور اس کا خدا اس سے بہت دور محسوس ہوا۔ واجد اب اس جگہ پر سے بغیر کسی کاروائی کے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

"جاؤ کالا دیو پر جا کر کمپنی کے بڑے افسر کو خبر دو کہ یہاں ایک فوجی کی لاش پڑی ہے اور مگن شاہ کو پکڑے رکھو۔" ایک شخص کالا دیو پہاڑ کی جانب بھاگا اور دو آدمیوں نے بڑھ کر مگن شاہ کو پکڑ لیا۔ جس نے سمجھا کہ اس کی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ وہ زور سے ہنسا۔ اس کی آنکھیں مچ گئیں اور چہرے پر مسرت کی شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ جو وادی میں گونج اٹھا۔ واجد نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں مہیب خلا میں آفتاب کی ست کرنیں بکھری تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر ایک پتھر پر وہ بیٹھ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ جس کلہاڑی کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس سے اپنی جان لے لے۔

۱۸

نمی کے بوجھ سے ہوا ساکت اور دھوپ سے جلتا دن۔ کرنل حنیف کی خواہش ہوئی کہ اس کے دفتر کے باہر دربان کی ڈیوٹی کرنے والے سپاہی کو بلا کر پنکھا جھلنے کے لئے کہے۔ سپاہیوں سے ایسی ڈیوٹی نہیں لی جاتی تھی۔ کرنل حنیف کو خیال آیا اور اپنی خواہش پر انھوں نے خود کو ملامت کیا اور ساتھ ہی اس سڑے دن کو کوسا۔ پیشانی سے پسینہ خشک کرنے کے بعد کرنل میز پر پڑے سفید کاغذ پر دائرے اور لکیریں بنانے لگے۔ ہر رجمنٹ کی طرح کرنل حنیف کی رجمنٹ کو مصنوعی لڑائی میں حصہ لے کر چاق چوبند رہنا پڑتا تھا۔ نقشہ بنانے کی نوبت اسی لئے آگئی تھی۔ کچھ دیر تک کام کرنے کے بعد کرنل حنیف آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ پھر اپنی سوچ سے خوش ہو کر سامنے رکھے پانی کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اچانک ایڈ جوٹنٹ کیپٹن عظمت دفتر میں داخل ہوا اور پیر پٹخ کر اس نے سیلوٹ کیا۔ اس کے وجیہ چہرے پر پریشانی اور بلا کی سنجیدگی تھی۔

"سر! ہمارے انٹیلیجنس کے نائک وزیر علی کو کسی نے جان سے مار دیا ہے اور اس کی لاش پنجنی کے قریب کھائی میں پڑی ہے۔"

"کیا...... ہمارے نائک کو جان سے مار دیا گیا؟" کرنل حنیف اس خبر کو سن کر چیخے۔ پنسل ان کے ہاتھ سے پھسل پڑی اور صدمے سے وہ سفید ہو گئے۔ پسینہ کے قطرے ان کے چہرے پر بہنے لگے۔ انھوں نے وحشت ناک نگاہوں سے اپنے ایڈ جوٹنٹ کو دیکھا۔ جس کی بڑی بڑی آنکھیں کرنل حنیف سے پوچھ رہی تھیں کہ اب کیا کاروائی کی جائے؟

"دشمن کے جاسوس بڑی طاقت میں اب گھس آئے ہیں۔" کرنل حنیف نے سرگوشیوں میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ان کی ابروئیں تنی تھیں اور پیشانی پر غصے سے بل پڑ گئے تھے۔

"سر! نائک کو دشمن کے جاسوس نے نہیں بلکہ اس احمق چھوکرے نے مارا ہے جو چپ شاہ کے ساتھ خانقاہ میں رہتا ہے اور اطلاع ملی ہے کہ نائک وزیر علی چپ شاہ کی بیوی کے ساتھ زنا کرنے جا رہا تھا۔"

"......اور تم نے یقین کر لیا؟"

کپتان عظمت نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

"کیا تم زنا کر سکتے ہو؟"

کپتان عظمت کے چہرے پر گھبراہٹ سی آ گئی اس نے اپنا سر پھر نفی میں ہلایا۔ "نہیں سر...... ہرگز نہیں۔" کپتان عظمت کی آواز دھیمی تھی۔ اس نے جواب دیتے وقت اپنے کرنل سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

"ہمارے سپاہیوں کا اخلاق ہمارے جیسا ہے۔ وہ پکے مسلمان ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"لیکن سر...... نائک کی لاش نیم برہنہ ملی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ رفع حاجت میں مصروف تھا اور دشمن نے اسی حالت میں اس کی جان لے لی۔ افسوس! ہماری رجمنٹ میں چند دن پہلے نائک کی پوسٹنگ ہوئی تھی اور آج اس کی جان چلی گئی۔ تم نے کیا حکم جاری کیا ہے؟"

"سر! پلٹن جنگ کے لئے بالکل تیار ہے۔ لیکن دشمن کی جانب سے کوئی خطرناک کاروائی کی خبر نہیں ملی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لاش کو میرپور کے ملٹری ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانا ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک افسر بھی جائے گا۔ کورٹ آف انکوائری بھی ہو گی اور پھر نہ جانے کیا نتائج ہوں۔" کرنل حنیف کی آواز میں بے بسی اور بیچارگی تھی۔ انھیں پتہ تھا کہ نائک کی موت کی ذمہ داری ان کی کمان پر ڈالی جائے گی۔

"سر! میجر طارق پلاٹون کے ساتھ لاش لانے گئے ہوئے ہیں اور رجمنٹ کا ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ گیا ہے۔"

"یہ واقعہ کہاں پر ہوا ہے؟"

"سر! خانقاہ سے کچھ فاصلے پر ایک چشمہ ہے جہاں گاؤں کی عورتیں نہانے دھونے جاتی ہیں۔ اسی کے پاس یہ سب کچھ ہوا۔"

"میر پور میں پولس کو فون کرو اور اس قتل کی خبر دو۔ اس میں گاؤں کا ایک فرد ملوث ہے۔ پولس کو اس کی آگاہی ہونی چاہئے اور جیپ یہاں بھیجو۔ ہمارا ابھی پنجنی جانا ضروری ہے۔"

"رائٹ سر۔" ایڈ جوٹنٹ سیلوٹ کر کے چلا گیا۔

کرنل حنیف بیچارگی سے اس دروازے کے سفید پردے کو ہلتے دیر تک دیکھتا رہا جس سے اس کا افسر ابھی باہر گیا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھڈی پر ٹکا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"اس قتل کا ہونا میرے لئے باعث شرم ہے۔ کوٹلی میں مقیم بریگیڈ ہیڈ کوآرٹر میں افسران کو جب اس کی اطلاع جائے گی تو وہ کہیں گے۔ کرنل حنیف پانچ وقت ٹکریں مارتا رہتا ہے اس کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے اسے خبر نہیں ہوتی۔ ایک بھینسے کا اغوا ہو گیا اور اب نائک مارا گیا۔ یہ سالا نکما ہے اسے کرنل کے رینک سے ہٹا کر میجر بنا دو، اور جب میری سالانہ خفیہ رپورٹ لکھی جائے گی تو اس میں یہ ساری وارداتیں لکھی ہوں گی۔ اُف...... اب میں کہیں کا نہیں رہا۔ لیکن یہ قتل ہوا کیسے اور کون اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟" بار بار یہی سوال اس کے سامنے آیا۔ اچانک اسے جواب مل گیا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور اس نے اپنے سر کو آہستہ سے ہلایا۔ جب اس کے ایڈ جوٹنٹ نے دفتر میں آ کر کرنل حنیف کو جیپ کے تیار ہونے کی خبر دی تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ کرنل حنیف نے اس پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالی اور بولا۔

"غور سے سنو۔ دو عورتیں نہ جانے کہاں سے پنجنی پہنچتی ہیں اور افواہ اڑتی ہے کہ دونوں اس پیر کی رشتہ دار ہیں۔ ان میں جو نوجوان ہے اس سے پیر کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ عورت ہندوستانی فوج کی جاسوس ہے اور وہ خانقاہ میں محفوظ ہو کر ہماری فوج کی حرکات و سکنات کی اطلاعات دشمن کو بھیجتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے ایجنٹ کے ذریعہ نائک کو مروا دیا اور وہاں پر گواہ کون رہ جاتا ہے وہ احمق چھوکرا۔ اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ چلو جلدی پنجنی چلیں۔"

یہ کہتا ہوا کرنل حنیف اتنے جوش سے اٹھا کہ اس کی توند سے میز ٹکرا گئی اور اس پر رکھا پانی کا جگ گر گیا اور اس کا پانی چھلک کر ایڈ جوٹنٹ کی پتلون پر اس طرح گرا کہ دیکھنے والوں کو شبہ ہوتا کہ افسر نے پتلون میں پیشاب کر دیا ہے۔

۱۹

چہرے پر اذیت اور ذلت کے احساس سے جھکا واجد خود کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ ڈھیلی پگڑی کو کسنے کا خیال بھی اسے نہیں آیا۔ پیروں کے نیچے کرخت زمین بھی اسے محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی پگڈنڈی پر درختوں کی جھکی شاخوں کا اس کے چہرے سے ٹکرانا اسے گراں گزرا۔ خانقاہ کے قریب کسی کا قتل اور اس میں مگن شاہ کا ملوث ہونا اور اس کی بیوی کی عزت پر حملہ۔ کیا وہ ناپاک کردی گئی ہے؟ یہی خیال اسے بار بار آیا اور اس کے ساتھ ہر بار خنجر اس کے دل میں اتر گیا۔ پیچھے جو لوگ تھے ان کے بولنے کی آواز کہیں بہت دور سے آرہی تھی اور مگن شاہ کے ہنسنے کی صدا بھی بہت دور سے آرہی تھی۔ دو آدمیوں کا اسے پکڑ کر خانقاہ کی جانب لے جانا اسے پُرمسرت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بار بار زور سے ہنستا۔ جو دلیری اس نے دکھائی اور جس طرح اس نے شاداں کو بچایا وہ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ خانقاہ اس کا گھر تھا جہاں کی کوٹھریاں اور در و دیوار اس کے مونس اور محافظ تھے۔ وہاں واپس جانے کی خوشی ہنسی بن کر اس کی زبان پر بار بار آرہی تھی۔

جب وہ لوگ خانقاہ پہنچے تو واجد سیدھا حجرے میں گیا جہاں شاداں آنکھیں بند کئے بستر پر پڑی تھی۔ خون کا بہنا رک گیا تھا اور پیٹ کے اندر اینٹھن میں بھی وہ شدت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ کراہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پیٹ پر تھا اور دوسرے بازو سے وہ آنکھوں کو ڈھکے ہوئے تھی۔ واجد کے قدموں کی آواز سن کر وہ اسی طرح پڑی رہی۔

''شاداں...... سچ سچ بتا...... کیا اس آدمی نے تیرے ساتھ وہی کیا جو میں بستر میں تیرے ساتھ کرتا ہوں؟'' شدت جذبات سے واجد کی بجھی ہوئی آواز میں سچائی جاننے کی شدید طلب تھی۔

شاداں کو اپنے خاوند سے ہمدردی کی امید تھی۔ اس کے غصے سے اسے دکھ ہوا اور خوف بھی آیا۔ جس حیوانیت کا وہ شکار ہوئی تھی اسے بیان کرنے کے لئے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور اس کی یاد سے اسے ذلت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں بول سکی۔ جہاں اس کا بچہ پل رہا تھا وہاں شدید اینٹھن پھر شروع ہو گئی۔ گرم سیال شے پھر اس کی رانوں کے درمیان بہنے لگی۔

''شاداں جواب دے۔ میری اذیت میں اضافہ مت کر۔ میں نے زندگی میں بہت کرب سہے ہیں اب اور برداشت کرنا مشکل ہے۔ بول...... خاموش کیوں ہے؟'' واجد نے شاداں کے بازو کر پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی زبان خشک ہو گئی تھی اور جبڑے کے پٹھے سکڑ کر سخت ہو گئے تھے۔ شاداں پر ہاتھ اٹھانے سے وہ خود کو بہ مشکل روک رہا تھا۔ شاداں کو محسوس ہوا کہ اس کا بازو کسی آہنی پنجے میں تھا جو سخت سے سخت ہو رہا تھا۔

''آہ۔ شاہ جی۔ شاہ جی۔ میرے بازو مت توڑو۔ خدا سے پوچھو وہ بتا دے گا کیا ہوا؟'' شاداں نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر آنسو بہنے لگے تھے۔

شاداں کے بازو پر واجد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ واجد سکتے میں آ گیا۔ اس کی ایک خفیہ کائنات تھی جس میں وہ اکثر خدا سے ہم کلام ہوتا۔ سوالات کرتا اور اسے جوابات ملتے۔ جنھیں سن کر اسے طمانیت ہوتی اور سکون ملتا۔ ساتھ ہی ایک عجیب سی مسرت اس کے رگ و پے میں چھا جاتی۔ اس کائنات میں اچانک شاداں آ گئی تھی اور اسے خدا سے سچ جاننے کے لئے کہہ رہی تھی۔ واجد کو اچانک احساس ہوا کہ اسے کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ اس کی خفیہ کائنات میں اس وقت مکمل خاموشی ہے۔ کوئی بولنے والا نہیں۔ تو کیا...... تو کیا وہ خود کو جواب دیتا رہا تھا۔ سید واجد شاہ خالق تھا اور اسی کا مخلوق بھی...... نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ اسے شاداں کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''وہ نہیں ہوا۔ جو تم سمجھ رہے ہو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ اس انجانے آدمی نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی لیکن مگن شاہ نے مجھے بچا لیا۔'' شاداں کو اپنے جسم سے طاقت جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟ مگن شاہ نے اس آدمی کی جان کس طرح لی؟''

''مجھے نہیں معلوم...... کیا وہ ظالم مارا گیا؟'' شاداں نے مردہ آواز میں پوچھا۔ ساتھ ہی موت اپنا بھیانک چہرہ لئے ارد گرد ناچتی نظر آئی۔ کیا وہ بھی مرنے والی ہے؟ شاداں کو وہ بکری

یاد آئی جو اس کی شادی کے دن ذبح کی گئی تھی۔ جس کی گردن سے تیز چھری کے نیچے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ یہ خون جو اس کے جسم سے رس رہا ہے کیا اس کے ہونے والے بچے کا خون ہے؟ کیا وہ بھی ذبح کیا جا رہا ہے؟ شاداں لرز اٹھی۔

''شاہ جی۔ شاہ جی۔'' شاداں کی ملتجی اور کمزور آواز کہیں دور سے آئی۔ وہ اپنے خاوند کا سہارا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا خاوند اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑتا، اس کی پیشانی کو سہلاتا اور اس کی تکلیف کا مداوا کرتا۔ لیکن اس نے اس کی التجا سنی ہی نہیں۔ اسے باہر سے فوجیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز آتی سنائی دی۔ وہ تیزی سے حجرے کے باہر لپکا۔

کرنل حنیف چند افسروں، سپاہیوں اور رجمنٹ کے ساتھ غصے میں کھڑا اپنی بیت سے اپنے پیر کو آہستہ آہستہ مار رہا تھا۔ اس نے نفرت سے واجد کو گھورا۔ نائک کی لاش ایک افسر کے ساتھ پوسٹ مارٹم کے لئے میر پور ہسپتال بھیجی جا چکی تھی اور بریگیڈ ہیڈ کوآرٹر سے ایک میجر انکوائری کے لئے آ رہا تھا۔ گاؤں والوں کی نظر فوجیوں پر تھی اور کیا ہونے جا رہا تھا اسے جاننے کے لئے وہ بے چین تھے۔ مگن شاہ کے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اتنے سارے ہتھیار بند سپاہیوں کو دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔

''یہ کون ہے اور کیوں ہنس رہا ہے؟'' کرنل حنیف نے مگن شاہ کی جانب بید سے اشارہ کرتے ہوئے واجد سے پوچھا۔ کرنل کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ توڑ دے۔

واجد کو اس کا خشمناک لہجہ بہت بُرا لگا۔ اسے ذلت کا شدید احساس ہوا۔ کرنل نے اسے نہ سلام علیکم کہا اور نہ ہی اس احترام کا اظہار کیا جو واجد کو دیکھ کر وہ کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کاش وہ کرنل حنیف کے ساتھ تنہا ہوتا پھر اس نے جو کچھ شاداں سے سنا تھا اسے بتا دیتا۔

''یہ ایک یتیم لاوارث نوجوان ہے۔ جس کی میں نے پرورش کی ہے۔''

کرنل حنیف مگن شاہ کو گھور رہا تھا۔ گول مٹول، ٹھڈی پر ننھی سی داڑھی اور چیتھڑے کپڑے۔

''واجد شاہ۔ تمھیں پتہ ہے اس نے کیا جرم کیا ہے؟''

''تم'' کا لفظ سن کر واجد کو لگا کہ اس کے سینے میں کسی نے کھونٹا ٹھونک دیا۔ کرنل حنیف کا لب ولہجہ اسی طرح متنفرانہ اور غصہ سے بھرا تھا جیسا کہ ملک ظہیر کا تھا جب کوٹ فتح خان میں لوگ اسے پکڑ کر ملک کے پاس لے گئے تھے۔ واجد کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا۔ اسے بولنا مشکل محسوس ہوا۔ واجد نے تیزی سے اور دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھی اور

خدا سے رحم کی بھیک مانگی۔

''نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔'' واجد سچ بولا تھا۔ شاداں کو اگر علم ہوتا کہ مگن شاہ نے قتل کیا ہے تو وہ ضرور اسے بتاتی۔ واجد خود کو اپنی نگاہ میں گرتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی روحانی طاقتیں اسے دھوکہ دے گئی تھیں۔'' انھوں نے اسے مستقبل کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ صوفی اور بزرگ واجد زمین پر بسنے والا معمولی انسان بن گیا تھا۔

''تمھیں نہیں پتہ ہے؟ تم پیر ہو۔ غیب کی خبر رکھتے ہو اور تمھیں نہیں معلوم اس نے کیا حرکت کی ہے۔ تمہاری بیوی چیختی چلاتی آتی ہے اور تمھیں نہیں پتہ کہ کیا ہو گیا؟'' ڈھلتی شام میں کرنل حنیف کے دانت چمک رہے تھے اور آنکھوں کی سفیدی ابل آئی تھی۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک احمق کے ہاتھوں فوج کی عزت خاک میں مل چکی تھی اور اس کی یونٹ کے ایک سپاہی کا مارے جانا اس کے لئے بھی ذلت تھی۔

''میری بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی عزت پر کوئی حملہ کرنا چاہتا تھا......''

''......اور وہ کون شخص تھا؟'' کرنل حنیف نے واجد کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''وہ فوجی جو اب مردہ ہے۔'' واجد نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کا سر جھکا تھا۔ جب سے وہ پیر بنا تھا کسی نے اس طرح کی توہین آمیز گفتگو اس سے نہیں کی تھی، اور آج تو اس کی بیوی کی عزت اور بے عزتی پر بات کی جا رہی تھی۔ واجد کے وجود کے اندر کوئی شے ٹوٹ رہی تھی۔ وہ ایک شے جو شاید کسی مقدس مٹی کی بنی تھی اور کسی نے بڑی احتیاط سے اسے بنایا تھا۔ اس نے کرنل حنیف کو چیختے سنا۔

''میرے نائک نے تمہاری بیوی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی؟ ہوش میں آیئے پیر صاحب۔ فوجی ایسی حرکت نہیں کرتے۔ یہ دیوانہ تمہاری بیوی کی عزت لوٹ رہا تھا اور میرا نائک وہاں پر اچانک پہنچ گیا۔ جس کی وجہ سے اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔''

واجد سکتے میں آ گیا۔ شام کی تاریکی کی وجہ سے کوئی اس کے چہرے پر اذیت کی شکنوں کو نہیں دیکھ سکا۔ مارے غصے کے اس کی مٹھیاں کس گئیں اور اس کی خواہش ہوئی کہ کرنل کی گردن کو اتنی سختی سے دبائے کہ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور اس کی زبان باہر لٹک جائے۔ لیکن ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ حالات نے اس کے ہاتھوں کو باندھ دیا تھا اور مسکین بنے رہنے میں ہی نجات تھی۔

"کرنل صاحب! مجھے ذلیل نہیں کیجئے۔ خدا کا واسطہ مجھے غلیظ کیچڑ میں نہیں گھسیٹئے۔ ہمارے مذہب کی رو سے چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر زنا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔" واجد جس طرح اعتماد اور جوش سے بولا اس نے اردگرد کھڑے افراد کو حیرت زدہ کر دیا۔ انھیں واجد اچانک بڑا اور باعلم محسوس ہوا۔

"چار آدمیوں کی گواہی؟ تم کس زمانے میں سانس لے رہے ہو؟ جب ہمارے ماں باپ ہمیں پیدا کرنے کی مشین بنے ہوتے ہیں تو اس وقت کیا چار آدمی کھڑے ہوتے ہیں؟ اس بہن...... کام کو انجام دیتے وقت کیا چار مادر...... آن کھڑے ہوتے ہیں تماشہ دیکھنے کے لئے۔ کیا گ...... زمانہ آ گیا ہے؟ ہمارا مذہب بھی مٹی میں مل گیا ہے۔ واجد شاہ تم اس وقت بڑی مشکل میں گرفتار ہو۔ تمھیں پتہ ہے کہ تم نے کس سے شادی کی ہے؟ حولدار گاؤں والوں کو پکڑ کر لے آؤ۔ ہم سارے جاسوسوں کو پکڑ کر رہیں گے۔" کرنل حنیف تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ جو وہ کرنے جا رہا تھا اس کی قانوناً اسے اجازت نہیں تھی۔ بغیر سول افسر کی موجودگی کے کرنل حنیف ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے بس میں نہیں تھا۔ فوج میں اس کی ترقی کی راہیں اب مسدود ہو چکی تھیں، وہ جانتا تھا۔ اس وجہ سے بھی اس کا غصہ اس کے وجود کو ہلا رہا تھا اور بُرے بھلے کی اس کی تمیز جاتی رہی تھی۔ کبھی وہ پیر پٹختا اور کبھی ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو زور زور سے ہلاتا۔

واجد کو شدید صدمہ ہوا۔ اس کی بیوی پر جاسوسی کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ خود اس پر بھی گرفت ہو سکتی تھی۔ اس نے منت بھری نگاہوں سے کرنل حنیف کو دیکھا۔ خاموشی اور بے زبانی میں واجد کی التجا چھپی تھی۔

"میری...... میری بیوی جاسوس نہیں ہے اور گاؤں والے اس جرم کو نہیں کر سکتے۔" واجد بہ مشکل بولا۔

"اس کا پتہ ہم لگا لیں گے۔ پولس والے بھی یہاں جلد موجود ہوں گے۔ ہمیں ان کے کام کو آسان کرنا ہے۔" کرنل حنیف تحکمانہ لہجے میں بولا۔

گاؤں والوں کو پکڑ کر لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سارے مرد، بچے اور چند عورتیں بھی خانقاہ کے سامنے موجود تھیں۔ جو کچھ ان کے سامنے ہو رہا تھا اس پر وہ کیسے یقین کرتے۔ یہ جگہ محترم اور متبرک تھی جہاں دعائیں ملتی تھیں اور ہمت افزائی ہوتی تھی۔ ان کے بزرگ کی عزت خاک میں مل رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں لرز رہے تھے۔ اب تاریکی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔

خانقاہ میں کسی کو لالٹیں جلانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ خانقاہ کے سامنے وہ بھی بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ کرنل حنیف کا حکم سن کر گاؤں والوں میں بے چینی پھیل گئی۔ دبی زبان میں کئی نے احتجاج بھی کیا۔ کرنل حنیف نے اچانک غصے سے پھنکارتے ہوئے مگن شاہ کو مخاطب کیا۔

''بتا تو نے کیوں ایسا کیا؟''

''ایسا کیا۔'' مگن شاہ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ناسمجھی کی بے بسی تھی۔

''اس احمق کو سزا دینی ہوگی جبھی یہ سچ بتا سکتا ہے۔'' کرنل حنیف جھنجلا کر بولا۔

واجد خاموش رہا۔ وہ اس رات کے واقعے کو نہیں بھولا تھا جب مگن شاہ اس کے حجرے میں بُری نیت سے گھس آیا تھا۔ واجد چاہتا تھا کہ مگن شاہ کو سزا ملے۔ اگر یہ سارا معاملہ جلد ختم ہو گیا تو وہ مکہ جا کر وہیں کا ہو رہے گا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

''کرنل صاحب۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ مگن شاہ کی زبان اللہ نے چھین لی ہے۔ وہ عقل کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ کیا دیکھتا اور سنتا ہے آسمان والا جانتا ہے۔'' ٹیڑھی آنکھوں والی فضلاں ہاتھ پھیلا کر اچانک بیتابی سے بولی۔ مگن شاہ پر جو آفت آ گئی تھی وہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ غریب عورت کے دل میں ایک مجبور انسان کے لئے ہمدردی جاگ اٹھی تھی۔

''یہ چھوکرا اگر بول نہیں سکتا ہے تو اشاروں سے ضرور بتا سکتا ہے۔'' کرنل حنیف چیخا۔ اس کے اشارے پر دو سپاہیوں نے مگن شاہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگن شاہ کو یہ عزت افزائی محسوس ہوئی۔ وہ زور سے ہنس دیا۔ لیکن جب سپاہی اس کے ہاتھوں کو مروڑ کر اس کی پیٹھ کے پیچھے باندھنے لگے تو مگن شاہ کو انجانے خطرے کا احساس ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ طاقتور سپاہیوں نے اسے جلد زیر کر لیا اور اسے کھینچتے ہوئے اس ٹرک کی جانب لے جانے لگے جو پہاڑی کے نیچے کھڑی تھی۔

شاداں کو مگن شاہ کی خوف سے بھری پکارنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کمزوری کے باوجود بدقت تمام پلنگ سے نیچے اتری اور سرکتی ہوئی دروازے کے پاس آ کر اس نے باہر جھانکا۔ تاریکی میں اتنے سارے لوگ اسے ماورائی سائے کی طرح لگے جو ڈراؤنے خوابوں میں آتے ہیں۔ اس کی نقاہت اور بڑھ گئی۔ اس کا خوف اور گہرا ہو گیا۔

''اللہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مگن شاہ نے کوئی بُرائی نہیں کی۔ اسے لوگ کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟'' وہ وہیں زمین پر پڑ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار اس کے پیٹ پر چلے

گئے۔ جیسے اس کا بچہ چیخ چیخ کر اس کی امداد طلب کر رہا تھا۔

باہر کرنل حنیف اب واجد سے سخت لہجے میں مخاطب تھا۔

"ہمیں تمہاری بیوی سے کچھ پوچھنا ضروری ہے۔"

واجد خوف سے زرد پڑ گیا۔ اس سے کیا پوچھا جائے گا۔ تجھے اس بدمعاش نے ہاتھ لگایا تھا؟ تیرے کپڑے اتارے تھے؟ تجھے چوما تھا؟ تیرے ساتھ وہی کیا تھا جس کا حق صرف مجھے ہے؟ ٹھنڈا پسینہ اس کے جسم پر بہہ آیا اور اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ لیکن کرنل حنیف پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں واجد پر گڑی تھیں اور وہ بید کی چھڑی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زور زور سے ہلا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے کرنل صاحب۔ جیسا آپ کا حکم۔" واجد ہاری ہوئی آواز میں بولا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا حجرے کے اندر چلا گیا۔

زمین پر پڑی شاداں سے واجد کو کوئی ہمدردی نہیں محسوس ہوئی۔ وہ ایک بدبخت عورت تھی جو اس کی ذلت کا باعث بنی۔ اس نے حقارت سے شاداں کو دیکھا اور غصہ سے لرزتی آواز میں کہا۔

"منحوس، کرنل صاحب کہہ رہے ہیں تو نے اپنے آپ کی بے عزتی کرائی ہے۔ چل باہر آ۔"

"مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ میں کیسے باہر جاؤں...... میں تو ہل بھی نہیں سکتی...... شاہ جی میرے پاس بیٹھو۔ مت جاؤ باہر۔"

"حیلے مت کر۔ چل اٹھ۔" واجد نے شاداں کے پیر کو پکڑ کر کھینچا۔ اس کے ہاتھ نے کوئی گرم سیال شے محسوس کی۔

"یہ کیسی نحوست ہے۔ تو نے میرے حجرے کو اپنے پانی سے گندہ کر دیا۔"

"گندہ پانی نہیں شاہ جی۔ یہ خون ہے۔"

"خون؟" واجد چونک کر بولا اور شاداں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے شاداں کی ٹھنڈی پیشانی پر پسینہ سے تر ہاتھ رکھا۔

"بڑے زور کا میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے بچا لو شاہ جی۔ میرے بچے کو بچا لو۔"

"بچہ؟" واجد حیرت سے بولا۔

"ہاں شاہ جی...... میرا بچہ...... مجھے بچا لو...... اسے بچا لو...... میں منت کرتی ہوں۔"

شاداں کی کراہتی ہوئی آواز دور کہیں دور بہت دور سے آتی واجد کو محسوس ہوئی۔

''میں باپ بننے جارہا تھا اور تو نے مجھے بتایا نہیں؟''

''تم اس کے باپ نہیں ہو...... اللہ نے مجھے ماں بنا دیا...... نہ جانے کیسے...... مجھے مرنے دو...... اسے بچالو...... وہ اچھا انسان بنے گا......'' شاداں نے واجد کے پیر کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم سے خون کا نکلنا اچانک تیز ہوگیا اور پیٹ میں درد بھی شدید ہوگیا۔ اسے پتہ چل گیا تھا اب وہ زندہ نہیں بچ سکتی اور اب وہ اپنے معبود کے پاس جارہی ہے۔ اس لئے سچ کا اقرار کرنے میں ہی نیکی تھی۔

واجد کو جیسے بجلی سی لگی اور اس کے سراپا میں دوڑ گئی۔ ''نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ شاداں تو پاگل ہوگئی ہے؟ تو اپنے ہوش میں نہیں ہے شاداں۔ تو کیا بک رہی ہے، تو نہیں جانتی۔''

شاداں نے کمزوری سے بند آنکھوں کو نیم وا کیا۔ پاس بیٹھا شوہر اسے نظر آیا۔ جس کے لئے محبت شاداں کے دل میں بھر آئی۔ اس کی گود میں سر رکھ دینے کو اس کا دل چاہا۔

''میں سچ بول رہی ہوں...... جب میں...... تمہاری بیوی بنی...... اس وقت...... میرے پیٹ میں بچہ تھا...... رحم کرو...... میرے شاہ جی...... رحم کرو۔'' شاداں کو ہچکیاں آنے لگیں۔ موت و زندگی کی آخری جنگ ہونے لگی جس میں زندگی کو شکست ہونے والی تھی۔

شاداں کے الفاظ سلگتی ہوئی سرخ سلاخیں تھیں جو واجد کے دل میں بار بار پیوست ہورہی تھیں۔ واجد کا دم گھٹا جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو شاداں کی پیشانی پر سے کھینچ لیا۔ اس کا سارا وجود واجد کے لئے اب ناپاک تھا۔ شاداں کے سرہانے اس کی موت کھڑی تھی لیکن واجد کو پرواہ نہیں تھی۔

''شاداں تو نہیں جانتی تو نے کیا کہہ دیا۔ تو مر رہی ہے ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دیتا۔ میں نے نہ جانے کتنی بار تیرے جسم سے قربت حاصل کی لیکن مجھے...... پیر واجد شاہ کو علم نہیں ہوسکا کہ تیرے جسم میں ایک حرام پل رہا ہے۔'' واجد کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اس کی بے بس نگاہیں دیوار میں بنے بڑے سوراخوں پر گئیں جہاں تاریک آسمان جھانک رہا تھا۔ وہ بے اختیار پھر بولا۔ ''اے خدا تیری روشنی کدھر تھی؟ تو نے اپنا سہارا کیوں کھینچ لیا؟'' جواب میں واجد کی ساری زندگی اس کے سامنے آگئی۔ پھول اور کانٹے، پتھر اور پانی، ویرانی اور رونق، اذیت اور خوشی، سبھی کچھ۔ اس کی زندگی کا ماحصل۔ ہر انسان کی زندگی کا ماحصل۔ زندگی گزارنے کے

کتنے سارے راستے تھے اور ہر راستے میں یہی سب کچھ تھا۔

ذلت اور خواری کے احساس سے سر جھکائے واجد شاہ خود کو گھسیٹتا ہوا حجرے کے باہر آیا۔ سامنے رات کی سیاہی میں کرنل حنیف، اس کے سپاہی اور گاؤں کے لوگ تاریکی کے ہیولے کی طرح کھڑے تھے۔ جن کی زہریلی نگاہیں اس پر گڑی تھیں۔ وہ رندھی ہوئی دھیمی آواز میں بہ مشکل بولا۔

''کرنل صاحب۔ میری بیوی مرگئی۔ آپ کو سچائی نہیں مل سکتی۔ مجھے بھی نہیں ملی۔ دن رات کی عبادت کے بعد بھی نہیں۔''

اور پہاڑی کے نیچے فوجی ٹرک میں مگن شاہ رسی سے بندھا پڑا تھا۔ سپاہی اسے بار بار غصہ میں ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہا تھا۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔''

○○

(ناول کے اختتام میں شاداں جب مر رہی ہے تو وہ بولتی ہے۔ ''ماں، تو مجھے اندھے راستے پر چھوڑ کر چلی گئی۔ شاہ جی بھی مجھے راہ نہیں دکھا سکے۔ وہ فوجیوں کے سنگی ہیں جبھی تو مگن شاہ کو انھوں نے نہیں بچایا۔ راستہ نہ تجھے ملا نہ مجھے۔ جسے ہم نے اجالا سمجھا وہ اُجالا نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں فوجی ہیں، پیر جی ہیں۔ وہ میرا تیرا، مگن شاہ کا دکھ نہیں سمجھ سکتے ماں۔ [جہاں اجالا ملا بھی تو وہ نقلی نکلا۔ وہ مجھے راہ نہیں دکھا سکا۔ وہ مگن شاہ کو بھی فوجیوں سے نہیں بچا سکا۔ شاہ صاحب بھی ان ہی کی طرح ہیں۔ کبھی نیکی نہیں کی میرے ساتھ۔] آہ۔ میرے ساتھ میرا بچہ بھی مر رہا ہے۔ اسے زندہ پیدا کرتی تو وہ بڑا ہو کر انسان بنتا۔ اسی دنیا میں نیکی اور بدی ہے۔ سزا اور جزا ہے۔ اس دنیا میں فرار نہیں۔ گئے ہوئے دن میں آج بھی ہے اور کل بھی۔ اسے وہ خواب یاد آنے لگا جسے کچھ کچھ بدلا ہوا وہ بار بار دیکھتا تھا۔ ایک بزرگ کسی معصوم عورت کے پاس آتا اور پوچھتا

کہ رات کے وقت یہ میوے اور پھل کون رکھ جاتا ہے۔ شاید قدرت بھیجتی ہے۔ عورت جواب دیتی۔ بزرگ کی آنکھیں جھک جاتیں۔ ہونٹ کپکپانے لگتے۔ کچھ کہنا چاہتا لیکن کہہ نہیں سکتا...... اور اسی عورت نے کچھ دنوں بعد بغیر کسی مرد کی قربت کے ایک بچہ جنا۔ اسی کی طرح معصوم اور نیک اور دردمند۔ اس کی بیوی بھی ویسی ہی ایک عورت تھی۔ واجد کا داخلی مکالمہ۔ مگن شاہ میں وہی چھپا تھا۔ وہی عظیم اور تابندہ خیال۔ ازل سے ابد تک انسان میں بسا اور وہ مگن شاہ جیسے نادان انسان کو بھی اس کے اعتراف پر مجبور کر دیتا تھا۔ شاید اس ایک دن سے جب صدیوں پہلے انسان کو موت آئی تو کسی دوسرے انسان نے سوچا کہ اس میں حرکت اور صدا تھی وہ کہاں چلی گئی۔ کیا کوئی اور کائنات ہے۔ وہاں کوئی ہے جو اسے بلا لیتا ہے۔ یا یہ انسان مر کر بھی زندہ ہے اور اسے اپنے گرد ان سب کی ضرورت ہے جو ہمیشہ اس کے پاس تھیں۔ جنھوں نے اسے خوشی اور طمانیت دی تھی۔ اسی لئے اس کے قریب پھول رکھ دیئے گئے۔ مرے ہوئے انسان کے لئے احترام کی پہلی نشانی۔ موت کے بعد زندگی ہے تو ان درختوں، جھاڑیوں اور پھولوں میں۔ کرنل حنیف اور اس کے ایڈجوئنٹ کے درمیان جب گفتگو ہوتی ہے تو کیپٹن کہتا ہے کہ یہ کیسی خانقاہ ہے جہاں نہ عرس ہوتا ہے اور نہ جہاں شہروں سے لوگ آتے ہیں اور نہ ہی اس کی وہ شہرت ہے۔ کرنل جواب دیتا ہے کہ ایسا ہونا کوئی ضروری نہیں۔ پیر و مرشد جہاں بھی ہوتے ہیں وہ خانقاہ ہو سکتی ہے اور پیر واجد سادہ انسان ہے، شہرت کا بھوکا نہیں۔ اور اس منظر میں پستہ قد انسان دیو قامت ہو گیا تھا۔ کوئی مابعد الطبیعاتی فرد۔ جو پہاڑوں اور جنگلوں کے اسرار کو زیر کر سکتا تھا۔ جو انھیں ریزہ ریزہ کر کے بتا سکتا تھا ان میں کیا چھپا ہے۔ جو ان کا فاتح تھا اور ان سب کا مفتوح بھی۔ ازل اور ابد سے ان کے ساتھ برسر پیکار۔)

OO

تمام شد

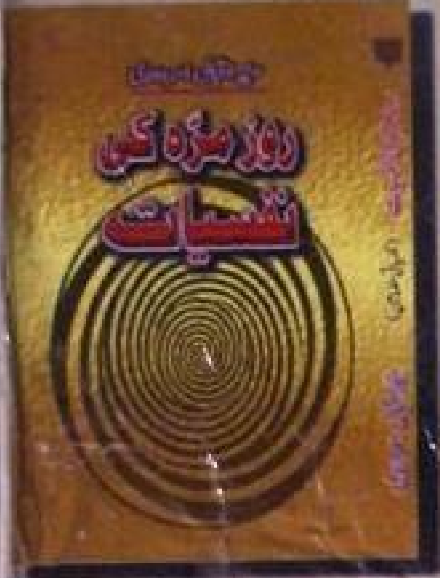

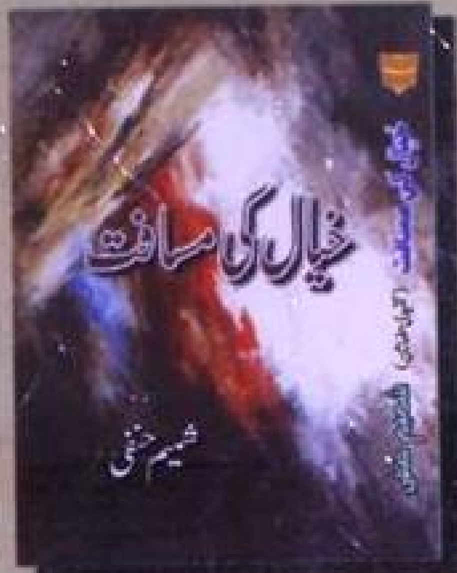

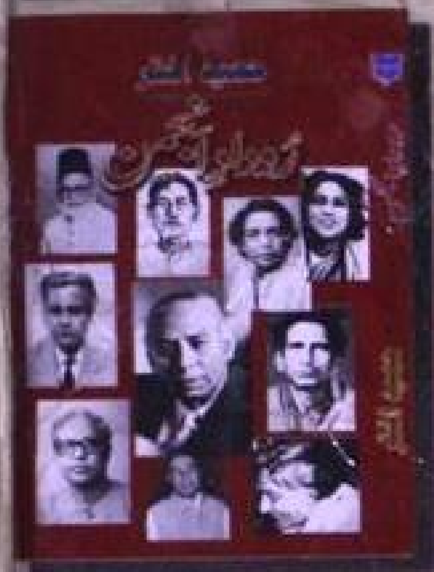

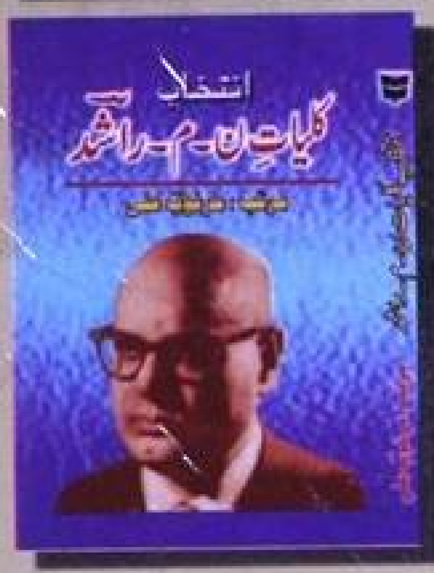

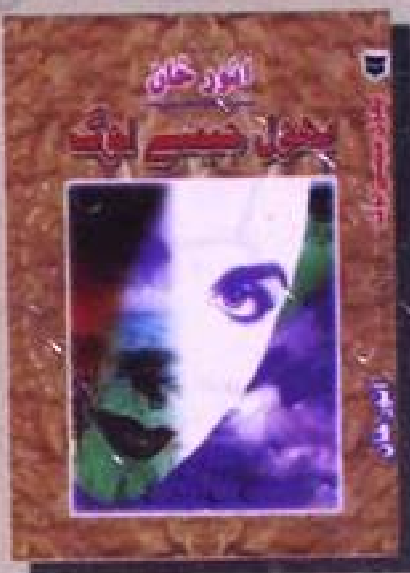

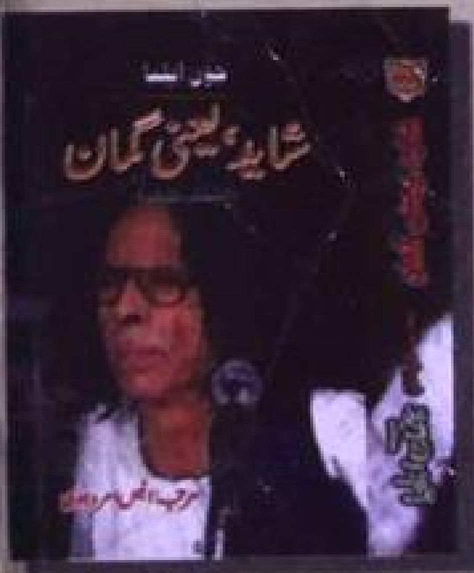

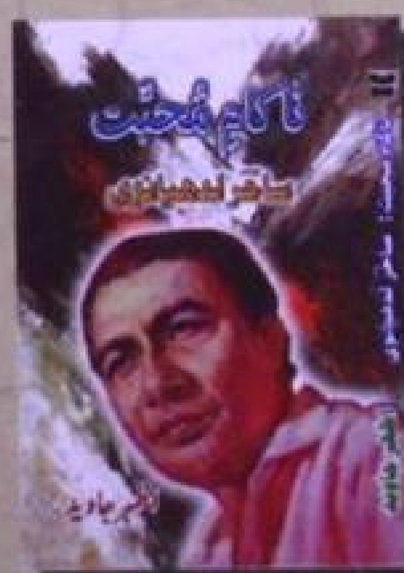

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com